سہ ماہی

تاریخ

۴۷

خصوصی گوشہ: سماجی علوم

ایڈیٹر

ڈاکٹر مبارک علی

مجلس ادارت

ڈاکٹر سیّد جعفر احمد، ڈاکٹر روبینہ سہگل، جناب اشفاق سلیم مرزا،
پروفیسر ساجدہ وندل، پروفیسر پرویز وندل، ڈاکٹر انور شاہین، ڈاکٹر غافر شہزاد

بیرون پاکستان: پروفیسر ہربنس مکھیا (ہندوستان)، ڈاکٹر گیانندر اپانڈے (امریکہ)،
پروفیسر امتیاز احمد (ہندوستان)، ڈاکٹر حسن نواز گردیزی (کینیڈا)،
ڈاکٹر خضر انصاری (برطانیہ)، ڈاکٹر سارا انصاری (برطانیہ)،
ڈاکٹر کامران اصدر علی (امریکہ)، ڈاکٹر طاہرہ خان (امریکہ)

تاریخ پبلیکیشنز، لاہور

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ

خط و کتابت (برائے مضامین)
بلاک ۱، اپارٹمنٹ ایف۔ برج کالونی، لاہور کینٹ
فون: ۰۴۲۔۳۶۶۶۵۹۹۷
ای۔میل: mubarakali21@yahoo.com

اہتمام	**تاریخ پبلیکیشنز** بُک سٹریٹ 39- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان
کمپوزنگ	فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز	سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق	نین تارا
تاریخ اشاعت	مارچ 2013ء
قیمت فی شمارہ غیر مجلد	-/320 روپے
قیمت فی شمارہ مجلد	-/400 روپے

تقسیم کار

فکشن ہاؤس: بُک سٹریٹ 39- مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-37249218-37237430

فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدر آباد، فون: 022-2780608

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی، فون: 021-32603056

فکشن ہاؤس

● لاہور ● حیدر آباد ● کراچی
e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

فہرست

☆ابتدائیہ 5

مضامین

1-	انسانی معاشرے کی بنیاد	ڈاکٹر ایچ۔آر۔احمد	9
2-	گلوبلائزیشن کے دور میں سماجی علوم کی حیثیت	روبینہ سہگل	13
3-	پاکستان میں تاریخ کا مضمون	ڈاکٹر مبارک علی	29
4-	بین الاقوامی تعلقات اور سماجی سائنس	ڈاکٹر مطاہر احمد	34
5-	عمرانیات اور پاکستان	ڈاکٹر ریاض احمد شیخ	39
6-	پاکستان میں فن تعمیر کی تاریخ کیسے پڑھائی جائے	ڈاکٹر غافر شہزاد	52
7-	معاشی پالیسی اور نوکر شاہی کا کردار	رؤف نظامانی	67
8-	ذرائع ابلاغ	ڈاکٹر توصیف احمد خاں	71
9-	پاکستان میں سماجی علوم کی ابتر ہوتی صورتحال	مقتدا منصور	89

10- پاکستان میں فلسفہ سے بے اعتنائی اشفاق سلیم مرزا 106

11- پاکستان: امریکی امداد کے بوجھ تلے حمزہ علوی/ترجمہ: ڈاکٹر ریاض احمد شیخ 112

تاریخ کے بنیادی ماخذ

شاہ عالم ثانی کے عہد کا دہلی دربار 163

مصنّفین: انتھنی پولیر، لوئی لوراں دولیسی

ترجمہ: نصیب اختر

ابتدائیہ

دسمبر 2012ء میں مجلّہ تاریخ اور ذبیسٹ (Zabist) یونیورسٹی کے تعاون سے چودھویں یک روزہ تاریخ کانفرنس کا انعقاد، یونیورسٹی کے ہال میں ہوا۔

اس کے پہلے سیشن کی صدارت جناب تسنیم صدیقی نے کی۔ جب کہ دوسرے سیشن کے صدارتی فرائض سعید حسن خاں نے سرانجام دیئے۔

اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان میں سماجی علوم کا جائزہ لیا جائے کہ ان کو ہمارے تعلیمی اداروں میں کس قدر اہمیت دی جا رہی ہے۔ کیونکہ سماجی علوم کے بغیر کسی بھی سوسائٹی کے لئے یہ مشکل ہے کہ وہ اپنے سیاسی، معاشی، اور سماجی مسائل کو سمجھ سکے اور ان کا حل تلاش کر سکے۔

صورت حال یہ ہے کہ نجی یونیورسٹیوں میں تو سماجی علوم تقریباً ناپید ہیں، جب کہ پبلک یونیورسٹیوں میں ان کے شعبہ جات تو ہیں مگر وہاں ان کا نصاب فرسودہ اور وقت کی ضرورتوں اور نئی ریسرچ کی بنیاد پر نہیں ہے، اساتذہ بھی مضمون پر مہارت نہیں رکھتے ہیں، کوئی نئی تحقیق نہیں ہو رہی ہے، اس وجہ سے یہ شعبہ جات ڈگریاں تو دے رہے ہیں، لیکن علم سے محروم ہیں۔

اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہماری کوشش کے باوجود ہمیں نفسیات، انتھراپولوجی، آرکیالوجی، سیاسیات، اور دوسرے سماجی علوم پر مضمون پڑھنے والے نہیں مل سکے جس کی وجہ سے ہم ان علوم کا پوری طرح جائزہ لینے میں ناکام رہے ہیں، اس کے باوجود ان مختصر مضامین میں سماجی علوم کی حالت زار کا جو جائزہ لیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارے اور ہمارے اساتذہ نئی تحقیق سے کس قدر نابلد ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ پبلک یونیورسٹیوں کے ساتھ ساتھ نجی اداروں میں بھی سماجی علوم کی طرف توجہ دی جائے اور ڈگری کے ساتھ ساتھ تحقیق کو فروغ دیا جائے، تاکہ ہمارے معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھا جا سکے۔

اگرچہ فلسفہ کو سماجی علوم سے خارج کر دیا گیا ہے، مگر ہم نے اسے اس دائرہ میں رہتے ہوئے اس پر خصوصیت سے اشفاق سلیم مرزا سے یہ مضمون لکھوایا ہے کیونکہ فلسفہ کو سمجھے بغیر، سماجی علوم کو سمجھنا ناممکن ہے۔

ایڈیٹر

مضامین

انسانی معاشرے کی بنیاد

ڈاکٹر ایچ۔آر۔احمد

۱۹۱۶ء روس میں بہار کی آمد سے قبل برٹرینڈ رسل صاحب اس سوچ میں محو تھے کہ یہ بہار معاشرے میں کیا نئی تخلیقی تبدیلی لائے گی۔نوم چومسکی نے رسل کے خیالات کو اپنی کتاب ''تعلیم اور آزادی کے مسائل'' میں بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ معاشرے کی بنیاد کو کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔رسل صاحب کے خیال میں انسانی تصور ایک بچے کو ایسا سمجھتا ہے جیسا کہ ایک مالی ایک جوان درخت کو۔یعنی ان دونوں میں نشوونما کی اندرونی صلاحیت موجود ہے جس کو ابھارا جا سکتا ہے۔اگر ان کو اچھی زمین، ہوا اور روشنی ملے۔یہ تشبیہ انسان کیلئے اچھے ماحول' آزادی اور روشن خیالی کا درجہ رکھتی ہے۔مگر انسانی زندگی میں ایسے ماحول اور آزادی کو پانا سہل عمل نہیں جو صلاحیتوں کو کھول سکے۔رسل صاحب ایک ایسا حل پیش کرتے ہیں جو تعلیم کے آزادانہ ماحول کے ذریعے انسان میں تخلیقی ذہنیت کو پیدا کر سکے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری تمام تر سعی ایسے علم کا حصول ہے جس کے ذریعے نئی تحقیقات ہو سکیں۔یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ تعلیم کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ ہم مردہ حقیقت کو زندہ کریں۔مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آزادانہ ماحول کو بنانے کیلئے بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔یہ رکاوٹیں معاشرے کے رسم و رواج اور قدیم زمانے کے قانون پر منحصر ہے جن کی بنیاد پر زیادہ تر تعلیمی ادارے قائم ہیں۔اس لیے یہ ہمارا فرض ہے کہ اگر ہم ایک ایسے نئے معاشرے کی تخلیق چاہتے ہیں جہاں انسانی تخلیقی توانائی کو نمو کا موقع دیا جائے۔تو ہمیں یہ خیال رکھنا پڑے گا کہ ہم اس دھوکے میں نہ پھنسیں۔جس سے معاشرہ تو نیا لگتا ہے مگر حکمرانی کا انداز وہی پرانا ہوتا ہے۔

رسل صاحب ''ول ہم فون ہوم بولڈ'' کے ہم خیال ہیں۔ان کے مطابق اصلی تعلیم تخلیقی ذہنیت کوجنم دیتی ہے اوراس کے اطراف وقرب وجوار میں نیامعاشرہ پیدا ہوتا ہے۔معاشرہ کیسے ماحول کا متلاشی ہے؟ یقیناًایسا ہی معاشرہ جوانسانی تخلیقی صلاحیت کو بروئے کار لا سکے،یعنی ایک نئی زندگی کا پتہ دے سکے۔ورنہ یہ تو سب جانتے ہیں کہ جب تک انسان اپنے آپ کونہیں پہچانے گا اس کی خود سے قربت ختم ہوتی جائے گی جس کے نتیجے میں انسانی تخلیقی توانائی بجھ جاتی ہے۔اور وہ صرف روزمرہ کے امور کی انجام دہی میں مصروف ہوکر رہ جاتا ہے۔ایسی انسانی اجنبیت کا علاج ایک نیا معاشرہ ہی ہوسکتا ہے۔یہ معاشرہ اس کے اندرونی خواہشات کو جگا دیتا ہے۔آزادانہ خیال ایک ایسا معاشرہ تسخیر کرتا ہے جس میں فرد صرف ایک تجارتی مجسمہ بن کر نہ رہ جائے اور وہ اجنبیت کا شکار بھی نہ ہو جائے۔ یہ کون سا معاشرہ ہوسکتا ہے کہ جس میں انسانی توانائی پھر سے اُجلا ہو جائے؟ کیا ہم ایک انڈسٹریل تہذیب کا تصور کر سکتے ہیں کہ شاید یہ تہذیب معاشرے کو بدل سکے اور آدمی کوانسان کی صف میں کھڑا کر سکے۔

انڈسٹریل تہذیب کی بنیاد پر جب معاشرہ ابھر کر سامنے آتا ہے تو اس سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ یہ معاشرہ فرد کو غلامی سے نجات دلائے گا۔اس کے طور طریقے وہی ہوں گے جو آدمی کو تخلیقی توانائی کے ذریعے انسان بنا دے گی۔ جب آدمی،انسان بن جاتا ہے تو وہ ایک نئے سماج کی بنیاد ڈال سکتا ہے۔انڈسٹریل تہذیب، دقیانوسی اور قدیم قانون کو جو غلامیت کی سماج کو مضبوطی سے جکڑ کر رکھتے ہیں،اس کو وہ توڑ دیتے ہیں۔اور اسی طرح معاشرے کو رسم و روایات کی زنجیر سے آزاد کیا جاسکتا ہے۔صنعتی تہذیب کے پاس اتنی سہولیات بھی ہوتی ہیں جس کے ذریعے وہ سارے عوام کو بنیادی ضروریات فراہم کر سکتے ہیں مثلاً پینے کا پانی، سینیٹیشن ،ابتدائی تعلیم اور صحت، ان چار بنیادی عناصر کی یقینی فراہمی کے بعد اگر حکمران چاہیں تو معاشرے کو آگے لے جاسکتے ہیں۔رسل صاحب کا خیال تھا کہ صنعتی معاشرہ ایک سوشل ریاست کو جنم دے سکتا ہے۔ یہ سماجی ایولوشن کا ہی عمل ہوگا۔ جو محنت کش مزدور اور کسان کو اتنی آزادی فراہم کرے گا کہ وہ لوگ ریاست کی ذمہ داری سنبھال سکیں۔اس کے لئے ایک مزدور طبقے کی جماعت کی بنیاد کی ضرورت ہوگی، اور راستہ دکھلانے والا مزدوری رہنما ایک عوامی سوشل ریاست کو جنم دے گا۔مگر خیال کرنا چاہیے کہ اس کے برعکس اس کے سامنے ایک سرمایہ دارانہ نظام بھی کھڑا ہوگا جو انتہائی منافع کے

ذریعے معاشرے کو پہلے سے چلا رہا ہے۔اسی معاشرتی اور طبقاتی تقسیم کی مثال برٹولڈ بریخت نے سمندر میں بڑی، درمیانی اور چھوٹی مچھلیوں کی موجودگی اور حیثیت سے دی ہے۔ جو معاشرے کو تقسیم کرتی ہے اور یہی کلاس اسٹریگل کی بنیاد ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سرمایہ دارانہ نظام کو کیسے تبدیل کیا جاسکتا ہے؟ کیا سوشلزم آہستہ آہستہ یہ تبدیلی لاسکتا ہے؟ اگر ریاست کے اداروں کی بنیاد صنعتی معاشرے پر مبنی ہو تو یہ ہوسکتا ہے۔اور پیداوار اور تقسیم کا توازن وجود میں آسکتا ہے۔رسل صاحب کی یہ رائے ہے کہ سوشلزم کا یہ ماڈل صنعتی وفاقی جمہوریت میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ یہ ماڈل انسان کو انفرادی اور اجتماعی دونوں صورتوں میں آزادی دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔اگر یہ خوبی پیدا ہو جائے تو معاشرے کو طوفانی قومیت سے بچایا جاسکتا ہے۔اس کے علاوہ حکمرانی کے ادارے جو قدیمی تصور پر قائم ہیں ان کا اثر بھی آہستہ آہستہ ختم کیا جاسکتا ہے۔اگر پیداوار کے جنون کو کم کیا جائے تو یہ سوشلزم ماحول کو بھی بچا سکتا ہے۔سوشلزم کی اور بھی بڑی خوبیاں ہے۔جس کے ذریعے روزمرہ کی سوچ اور اجنبیت کا مختلف طریقوں سے سدباب ممکن ہے۔ یہ طریقہ کیا ہے؟ یہ سائنس اور آرٹ ہے، وسیع علم ہے، ذہنی نشوونما کے لئے میسر بہترین ماحول اور آرام گاہ جہاں نئے پودے اور نئی سوچ جنم لیتے ہیں۔ جیسے سوشلزم ایک تناور درخت کی مانند بڑھنے لگتا ہے ویسے انسانی معاشرے کو خود اعتمادی اور تخلیقی زندگی خود سے چلانے کا ہنر سیکھاتی ہے۔

انسانی رویوں کو سمجھنے کیلئے تین راستوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ تین راستے: قدرتی، سماجی اور انسانی علم ہے۔ یہ علم سوچنے اور عمل کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔انسانی رویہ ان تین علوم کا ایک نتیجہ ہے۔ہم انسان کو تبھی سمجھ سکتے ہیں جب ہم ان کے رویے کا تجزیہ ان تینوں کی روشنی میں کرسکیں۔ یہ تین روشنیاں ہماری یونیورسٹی اور کالج کے ذریعے تحقیقی علم فراہم کرسکتے ہیں جو عوام کی خدمت کا ایک رُخ ہونا چاہیے۔اگر ہم ان راستوں پر چلیں تو یونیورسٹی میں عوامی فلاسفر اور محقق پیدا کرسکتے ہیں، جس سے معاشرے کو ایک نیا جنم مل سکتا ہے۔اس تعلیمی ماڈل کو یونیورسٹی میں جگہ ملنی چاہیے تاکہ وہ کونونٹیل ٹرینگ سسٹم کو ختم کرسکیں، اور نئی آزادی کی ہوا چل پڑے۔سوشل سائنس اور ہیومینیٹیز کے ذریعے ہم اپنے معاشرے کی بیماریاں جیسے کہ بیگانگی، روزمرہ کی سوچ اور غیر رواداری سے نجات پاسکتے ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ نیا نصاب ہمیں موجودہ دور کے دائرے سے نکالے تاکہ ہم

ایک انسانی معاشرے میں داخل ہوسکیں۔

کلیدی الفاظ: انسانی بنیادی تخلیقی تعلیم۔انڈسٹریل معاشرہ۔سوشلزم اور تعلیم گاہ کا معاشرہ سے تعلق۔

مصنف: یہ مقالہ ڈاکٹر ایچ آر احمد نے ذولفقار علی بھٹو انسٹیٹیوٹ آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کراچی کانفٹن میں ایک بین الاقوامی سوشل سائنس کانفرنس میں دسمبر ۲۰۱۲ کو پیش کیا۔

معاون: مصنف مضمون کا اُردو ترجمہ کرنے پر آغا شگری اور نظر ثانی کرنے پر ڈاکٹر مبارک علی صاحب کا مشکور وممنون ہے۔

References:

1. Noam Chomsky . Problems of Knowlege and Freedom: The Russel Lectures. The New Press 2003.
2. Bernard Russel Principles of Social Reconstruction. London: George Allen and Unwin 1916, p.25.
3. Bernard Russel "What Desires Are Politically Important? In Horst Frenz. Ed. Nobel Lectures: Literature 1901-1967. Elsevier 1969, p.463.
4. Wilhelm Von Humboldt. The Limits of State Action Ed JW Burrow, Burrow, Cambridge University Press 1969.

Correspondence:

HR Ahmad MD PhD (Bochum)FCPS
Professor of Physiology
JMC Medicare Campus
Karachi - 74000. Pakistan
hrahmad.alrazi.@gmail.com

گلوبلائزیشن کے دور میں سماجی علوم کی حیثیت

روبینہ سہگل

انسان کی زندگی، اُس کا ارتقاء اور سماجی رشتوں کو سمجھنے کی ضرورت دورِ قدیم سے ہی شروع ہوگئی تھی۔ دورِ قدیم کا فلسفہ، دیومالائی قصہ کہانیاں اور مختلف مذاہب سب انسان کی خصوصیات، اُس کی ضروریات اور سوچ کو پرکھنے کے مختلف طریقے تھے۔ ان کے ذریعے انسان کی زندگی اور باہمی رشتوں کو ترتیب دینے کی کوشش بھی کی جاتی تھی۔

پرانے زمانے میں مادی اور انسانی دنیا کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں مانا جاتا تھا۔ زندہ انسانوں اور بے جان چیزوں کے بارے میں غوروفکر اور ان کا ادراک اکٹھے ہی کیا جاتا تھا۔ خیالات اور تخیل کی دنیا مادی دنیا سے جڑی ہوئی سمجھی جاتی تھی۔ یہ کائنات اور اس کے راز، جو کہ اب فزکس اور کیمسٹری کا مواد بن کر رہ گئی ہے، پہلے اخلاقی فلسفے سے مربوط ہوا کرتی تھی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ یہ ہوا کہ انسانی رشتوں اور سماجی تعلقات کا مطالعہ اب معاشرتی علوم میں کیا جاتا ہے اور مادی کائنات کا مطالعہ اب فزکس اور سائنس کا مخصوص علم مانا جاتا ہے۔ انسانی باہمی روابط اور سماجی تعلقات، جو کہ مادی دنیا سے ہزاروں طریقوں سے جڑے ہوئے ہیں، اب علیحدہ شعبے تصور کئے جاتے ہیں۔

انسانی سوچ اور مادیت میں تضاد تو یونانی فلسفے میں افلاطون اور ارسطو کے دور سے ہی شروع ہوگیا تھا۔ افلاطون نے تصورات کو اہمیت دی، اور ارسطو نے منطقی سوچ اور مادیت کی بنیاد رکھی۔

تاہم ذہن اور جسم کی علیحدگی اور ساتھ ہی روح اور جسم کی علیحدگی کا تصور جو کہ کئی مذاہب میں نمایاں ہے، عموماً ڈے کارٹ (Des Carte) سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مغربی فلسفے کی تاریخ میں

جسمانی اور روحانی دوہرا پن یونانی فلسفے کے دور سے موجود رہا ہے۔

گزشتہ تقریباً 3 عشروں میں فلسفے نے ایک بار پھر اس دوہرے پن کا تنقیدی جائزہ لیا اور ایک دفعہ پھر سے روحانی اور جسمانی زندگی کو لازم وملزوم گردانا جانے لگا ہے۔ایک دفعہ پھر سے دانشور مادی، روحانی، سماجی اور اخلاقی کائنات کو ایک مربوط نظام کے طور پر دیکھنے لگے ہیں۔اب معاشرتی علوم میں یہ بات عام ہو چکی ہے کہ یہ تمام علوم ایک دوسرے سے گہرے تعلقات رکھتے ہیں اور انہیں علیحدہ کر کے پڑھا نہیں جا سکتا۔اب یہ بات بھی عام ہو چکی ہے کہ انسان اور اس کے باہمی تعلقات اس قدر پیچیدہ ہیں کہ انہیں جانچنا آسان نہیں ہے کیونکہ انسانی زندگی میں یہ ممکن نہیں ہوتا کہ ہر عمل کی وثوق سے پیش گوئی کی جا سکے۔انسانی عوامل کے راز بہت گہرے ہیں۔

فرانسیسی مورخ مائیکل فوکو نے معاشرتی علوم کے مضامین کے ارتقاء کا جائزہ لیا ہے۔(1) فوکو کے مطابق تاریخی طور پر انسان نے تین انسانی سرگرمیوں کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ان میں علم حیاتیات (Bilogy)، سیاسی معیشت (Political Economy) اور لسانیات (Linguistics) کا علم شامل ہیں۔فوکو کی نظر میں یہ تینوں علوم بنیادی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ ان کا تعلق انسان کی جان، کام اور زبان سے ہے۔حیاتیات (Biology) کے علم سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کس طرح سے افزائشِ نسل کرتا ہے، کیونکر نشوونما پاتا ہے، بڑا ہوتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔ سیاسی معیشت (Political Economy) سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان اجتماعی طور پر اپنی ضروریات زندگی کے لئے کیونکر انتظام کرتا ہے اور تیسرا علم، یعنی لسانیات کا مطالعہ (Linguistic) ہمیں بتاتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے باہمی روابط کیسے جوڑتے ہیں اور اپنے جذبات، خیالات اور تصورات دوسروں تک کیسے منتقل کرتے ہیں۔فوکو کا کہنا ہے کہ معاشرتی علوم ان تین بنیادی عوامل پر مشتمل ہیں اور مادی سائنس اور اخلاقی فلسفے کے بیچ میں موجود ہیں، اور ان دونوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہیں۔انسان زندہ رہتا ہے، محنت مشقت کرتا ہے اور دوسروں سے زبان کے ذریعے تعلقات قائم کرتا ہے۔اس بات پر معاشرتی علوم کی عمارت کھڑی ہے۔

علم منجمد نہیں ہوتا

علم میں جمود نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک تسلسل سے چلتا ہے اور بدلتے رجحانات کے ساتھ تبدیل

ہوتا رہتا ہے۔علم کو ہم کوئی حتمی نتیجہ نہیں تصور کر سکتے بلکہ وہ ایک ارتقائی عمل ہوتا ہے۔ جوں جوں معاشرے تبدیل ہوتے ہیں اُن کے بارے میں علم بھی بدل جاتا ہے۔علم تاریخی اُتار چڑھاؤ کی غمازی کرتا ہے اور بدلتے ہوئے رجحانات کا جائزہ لیتا ہے۔عموماً جو علم کسی معاشرے میں حاوی ہوتا ہے، وہ وہاں کے حکمران طبقات کے مفادات کی عکاسی کرتا ہے۔ جب محکوم طبقے یا متبادل نظریات کے حامی افراد حاوی علم کو چیلنج کرتے ہیں تو علم کے اندر ایک تضاد بھی پیدا ہوتا ہے۔مختلف سماجی گروہ اپنے علم کی تشہیر کرتے ہیں اور اپنے مخصوص زاویئے کو فروغ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر عورتوں، مزدوروں یا کسانوں کی تحریکیں متبادل نظریات کو جنم دیتی ہیں اور حکمران طبقات کے علوم کی اجارہ داری کو ختم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

چنانچہ علم کی تشکیل کرنا ایک سیاسی عمل ہوتا ہے۔علم عام طور پر کسی نہ کسی مخصوص سیاسی نظریے کی عکاسی کرتا ہے۔مثال کے طور پر پدرشاہی کے تحت تشکیل دیا گیا علم پدرسری کی اقدار کو فروغ دیتا ہے۔اسی طرح سرمایہ داری نظام کی سوچ کے تحت تشکیل دیا گیا علم سرمایہ داری نظام کو مزید مستحکم کرتا ہے۔اسی طرح سیاہ فام افراد کی تحریک یا غلام قوموں کی تحریکیں استعماری قوتوں کے خلاف اپنا مخصوص نظریہ پیش کرتی ہیں۔علم گروہی اور طبقاتی کشمکش کے نتیجے میں بنتا ہے اور کسی ایک طبقے کی اجارہ داری ختم ہوتے ہی اس سے جڑے علم کی بنیاد کمزور ہو جاتی ہے اور کسی نئے گروہ، قوم یا طبقے کا علم عروج حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ علم ایک مسلسل ارتقائی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اینٹونیو گرامشی (Antonio Gramsci) نے مختلف قسم کے دانشوروں کا ذکر کیا ہے جن میں ایک طرف ایسے دانشور ہوتے ہیں جو ریاست کے تصور کو مزید مستحکم کرتے ہیں، اور ریاستی مفادات کو مدنظر رکھتے ہیں۔عوامی دانشور عوام کے مفاد میں علم کی تعمیر کرتے ہیں اور کچھ دانشور مخصوص تحریکوں سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں جو ان تحریکوں کے نقطہ نظر کو فروغ دیتے ہیں۔(2)

لہٰذا علم کبھی بھی کلی طور پر غیر جانبدار یا معروضی نہیں ہوتا۔معاشرتی علوم سے جڑے حقائق پتھر پر لکیر کی طرح نہیں ہوتے۔علم کا دارومدار بہت حد تک علم کی ساخت کرنے والے پر ہوتا ہے۔معاشرتی علوم کا انحصار تو بہت حد تک سیاسی اور نظریاتی بحث ومباحثے پر ہوتا ہے۔معاشرتی علوم طاقت، نظریات اور انسانی جدوجہد کے دوراہے پر کھڑے ہوتے ہیں۔ان کا تعلق انسان کی خواہشات، کاوشوں اور اعمال سے ہوتا ہے۔ان کا تعلق طبقے، مذہب، فرقے، جنس اور علاقے سے ہوتا ہے۔

معاشرتی علم معروضی نہیں ہوتا

معاشرتی علوم کا دار و مدار بہت حد تک ان افراد پر ہوتا ہے جو اس کو تشکیل کرتے ہیں۔ ان کے مقاصد اور طریقہ کار کا اس علم پر بے پناہ اثر ہوتا ہے۔ وہ کون سے سوالات پوچھتے ہیں، کس طرح پوچھتے ہیں اور ''حقیقت'' کو کس طرح پاتے ہیں ان سب چیزوں کے اثرات اُس علم پر ہوتے ہیں جس کی ساخت وہ کرتے ہیں۔ ان افراد کی اقدار، خیالات، تعصّبات، خواہشات، مفادات اور عقائد کا بے حد اثر ان کے ترتیب دیئے ہوئے علم پر پڑتا ہے۔ وہ کس جگہ موجود ہیں، کیا کام کر رہے ہیں، کس ملک وقوم و مذہب کے باشندے ہیں، کس یونیورسٹی میں کام کرتے ہیں، ان تمام باتوں کا اثر ان کے بنائے ہوئے علم پر پڑتا ہے۔

علم کس مقصد کے لئے بنایا جاتا ہے یہ بات بھی بہت اہم ہے۔ مثال کے طور پر ایڈورڈ سعید نے اس بات کا ذکر تفصیل سے کیا ہے کہ جب استعماری قوتوں نے نوآبادیات کے بارے میں علم کی تشکیل کی تو اُس کے اندر سامراجی قوتوں کے مفادات اور تعصّبات پنہاں تھے۔(3) سامراجی قوتوں نے مقامی لوگوں کے بارے میں ایسے تصورات اور خیالات بنائے کہ فتح کا جواز بنے۔ اس علم میں سامراجی قوتوں کی قتل و غارت گری اور ناانصافیاں تو چھپ گئیں لیکن مقامی لوگوں کے بارے میں یہ تاثر پیدا ہوا جیسے وہ وحشی اور غیر مہذب ہوں اور اُن کو سدھارنے کا کام سفید فام افراد کی ذمہ داری ہو۔ اس علم کے مدِ مقابل مقامی لوگوں نے اپنا منفرد علم تیار کیا جس سے معلوم ہو کہ اُن کا استعماری قوتوں نے کس طرح استحصال کیا اور اُن کے وسائل چرا کر خود کو امیر کیا۔ مثال کے طور پر امریکہ میں تاریخی طور پر مقامی لوگوں کو وحشی اور غیر ترقی یافتہ کہا جاتا تھا اور کرسٹوفر کولمبس (Christopher Columbus) کو ہیرو بنا کر پیش کیا جاتا تھا، اور یہ تاثر دیا جاتا تھا کہ کولمبس نے امریکہ کو دریافت کیا۔ گویا وہاں کے لوگوں کی اس ''دریافت'' سے قبل کوئی حیثیت ہی نہ تھی۔ مگر وہاں کے مقامی لوگوں نے جب اپنی تاریخ کو خود لکھنا شروع کیا تو کولمبس کو بدمعاش، لٹیرا کہا اور سامراجیت پر کھل کر تنقید کی۔ اس نظریہ تاریخ نے ان لوگوں کے لئے جو بہت پسماندہ ہو چکے تھے، ایک نئی راہ نکالی اور اُنہیں احساس ہوا کہ اُن کی ایک طویل اور عالیشان میراث ہے۔ اس سے وہاں کے لوگوں کا احساسِ کمتری مٹا اور اُنہیں اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔

چنانچہ علم سماجی کشمکش میں پھلتا پھولتا ہے۔ تاریخی عوامل اس میں ہر دم تبدیلیاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ معاشرتی علوم میں کوئی حتمی سچ نہیں ہوتا۔ مختلف لوگوں کو حقیقت مختلف نظر آتی ہے۔ تاریخ کے کئی زاویئے ہوتے ہیں۔ کسی ایک نقطہ نظر میں مکمل بات نہیں ہوتی۔ ہر زاویہ وقت کے ساتھ، اور نئی تحقیق کی روشنی میں بدلتا رہتا ہے۔ چنانچہ معاشرتی علوم حتمی طور پر معروضی نہیں ہوتے۔

حتمی سچ کی تلاش کی ناکامی

حتمی سچ کا تصور عموماً مذہب سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ جب علم کی جستجو مذہب سے جدا ہوئی اور سائنس نے جنم لیا تو شروع میں یہ تصور عام تھا کہ سائنس حتمی سچ ثابت کردے گی کیونکہ وہ حقائق کے مشاہدے اور سائنسی تجربات پر منحصر ہوتی ہے۔ تاہم وقت کے ساتھ ساتھ فزکس جیسی معروضی سائنس نے بھی حتمی سچ کی تلاش ترک کردی۔ سائنسدانوں کو بھی بالآخر تسلیم کرنا پڑا کہ کسی بھی چیز کے بارے میں مکمل اعتماد اور وثوق سے پیش گوئی کرنا ممکن نہیں ہے۔ کائنات میں بھی کوئی بات حتمی نہیں ہے۔ کائنات کے بہت سے راز ابھی تک آشکار نہیں ہوئے۔ کسی لیبارٹری کے محدود ماحول سے جو ثابت ہوتا ہے وہ پوری کائنات پر لاگو نہیں ہوتا کیونکہ بہت سی نامعلوم چیزیں ہوتی ہیں جن کے اثرات کا پوری طرح پتا نہیں ہوتا۔

اگر فزکس جیسی سائنس بھی مکمل اعتماد اور وثوق سے پیش گوئی نہیں کرسکتی تو معاشرتی علوم تو انسانوں کے پیچیدہ تعلقات کے بارے میں ہیں۔ انسانوں کے روّیوں اور عوامل کے بارے میں پیش گوئی کرنا تو کلی طور پر ناممکن ہے۔ صرف عمومی رجحانات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ایک انسان دوسرے سے بے حد مختلف ہوتا ہے۔ قومیں ایک دوسرے سے فرق ہوتی ہیں۔ خطے ایک دوسرے سے علیحدہ اور منفرد ہوتے ہیں۔ پھر ایک ہی شخص کسی ایک وقت میں ایک مخصوص رویے کا حامل ہوتا ہے اور دوسرے وقت کچھ اور کرتا ہے۔ نہ لوگ ویسے ہی رہتے ہیں، نہ وقت اور نہ معروضی حالات۔ سب کچھ تبدیل ہوجاتا ہے۔ چنانچہ معاشروں کے بارے میں وثوق سے بات کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ ایک وقت میں معاشرے پر بہت عوامل اثر انداز ہورہے ہوتے ہیں۔ اس صورتحال میں انسان صرف عارضی اندازے لگا سکتا ہے۔ اس لئے معاشرتی

علوم میں تحقیقی نتائج کو کبھی بھی حتمی سچ نہیں مانا جاتا اور ایسی زبان استعمال نہیں کی جاتی جو بے حد پُر اعتماد ہو اور مکمل یقین سے بات کرے۔

معروضی سائنس کا سماجی رتبہ

معروضی سائنسی مضامین، مثلاً فزکس، کیمسٹری یا ریاضی سماج میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ ان علوم کی عزت کی جاتی ہے اور ان سے جڑے پیشوں کو رتبہ دیا جاتا ہے اور مراعات بھی ہوتی ہیں۔ ان علوم کو پڑھانے کا معاوضہ بھی قدرِ بہتر ہوتا ہے۔ حکومت، کاروباری طبقہ اور صنعت کار ان علوم میں سرمایہ کاری بھی کرتے ہیں تا کہ نت نئی ایجادات ہوں اور منافع بخش مصنوعات تیار کی جاسکیں۔ سائنسی تجربات سے حاصل کردہ علم کی حیثیت معاشرے میں بہتر ہوتی ہے کیونکہ لوگوں کو ان کے نتائج پر زیادہ اعتبار ہوتا ہے۔ سائنسدانوں کو اپنے علم پر فخر ہوتا ہے کیونکہ یہ علم سائنسی حقائق کو مدنظر رکھ کر قابلِ اعتماد معلومات فراہم کرتا ہے۔

چنانچہ معاشرتی علوم کے علمبرداروں کی بھی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اپنے علم کو سائنسی بنا کر پیش کریں تا کہ اُس کی معیشت میں وقعت ہو۔ انہیں اُمید تھی کہ معاشرتی علوم کو اگر سائنس کا درجہ مل جائے تو معاوضہ بھی بہتر ہوگا اور زیادہ طالب علم ان علوم کو حاصل کرنا چاہیں گے۔ رتبہ بڑھنے سے یہ توقعات جڑی ہوئی تھیں کہ معاشرتی علوم کو صنعت وتجارت کے شعبوں میں ایک اعلیٰ مقام مل سکے گا۔

تاہم حقیقت یہ ہے کہ معاشرتی علوم کو کبھی بھی وہی اہمیت نہیں ملتی جو کہ فزکس، کیمسٹری، ریاضی یا علم حیاتیات کو ملتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ریاستیں سائنس کے علم کے ذریعے اسلحہ تیار کرتی ہیں اور ہر قسم کی صنعت کا تعلق اسلحہ بنانے کی صنعت سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک صنعت لڑاکا طیارہ یا ٹینکوں کے پہیے تیار کرتی ہے اور کوئی تیسری صنعت ان طیاروں یا جنگی ٹینکوں کے انجن تیار کرتی ہے۔ بے شمار بنیادی صنعتیں دفاع اور جنگ سے جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ لہٰذا حکومتیں اور ریاستیں سائنسی تحقیق اور تجربات پر بیش بہا پیسہ خرچ کرتی ہیں۔ اسی طرح بڑے صنعتکار اور تاجر ایسی سائنسی تحقیق پر بہت سرمایہ لگاتے ہیں جو کمپیوٹر یا سیل فون اور ایسی دیگر چیزوں میں بہتری لانے کے لئے کی جائے۔ سائنسدانوں کا صنعت وتجارت اور دفاع کے شعبوں سے

گہرا تعلق ہوتا ہے۔

معاشرتی علوم یہ رتبہ اور حیثیت پانے میں اکثر ناکام رہتے ہیں کیونکہ ان کا براہِ راست اسلحہ بنانے یا کمپیوٹر وغیرہ بنانے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان کا تعلق انسان کی زندگی اور اس کی سرگرمیوں سے ہوتا ہے۔ معاشرتی علوم صنعت وتجارت کی بنائی ہوئی اشیاء کے فروخت کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر اشتہار بنانے میں علم نفسیات اور عمرانیات بہت کام آتے ہیں۔ اشتہار بنانے والے لوگوں کی خواہشات کا استحصال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کار یا موٹر سائیکل بھی بیچنا ہو تو عورت دکھائی جاتی ہے تا کہ عورت کے لئے جو جذبات ایک مرد رکھ سکتا ہے، وہ جذبات واحساسات اُس موٹر سائیکل یا کار سے جڑ جائیں۔ اس طرح ایک مرد وہ چیز خریدنا چاہے جس کے اشتہار میں کوئی خوبصورت عورت دکھائی گئی ہو۔ اسی طرح سوشیالوجی کی تحقیق سے سروے وغیرہ کرائے جاتے ہیں تا کہ لوگوں کی خواہشات کا اندازہ لگا کر اس قسم کی اشیاء بنائی جائیں جو لوگ چاہتے ہیں۔ اسی طرح ان علوم کو استعمال کر کے لوگوں کے دِلوں میں دُشمن کا خوف پیدا کیا جاتا ہے تا کہ لوگ خوب اسلحہ بنانے پر رضامند ہو جائیں۔ اس طرح معاشرتی علوم کا کردار ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ جو اشیاء سائنسدان بناتے ہیں اُن کی تشہیر میں معاشرتی علوم کا استعمال ہوتا ہے۔ کئی دفعہ معاشروں کا مطالعہ کرنے والے اینتھر وپالوجسٹ (Anthropologists) جنگی مہم میں حصہ لیتے ہیں اور فوجیوں کے ہمراہ فتوحات کرنے جاتے ہیں تا کہ مفتوح معاشروں کی ثقافت اور سماجی تنظیم کو سمجھا جا سکے اور سامراجی قوتوں کے لئے مقامی لوگوں کو زیر کرنا قدرِ آسان ہو جائے۔ اس موضوع پر طلال اسد کی مشہور کتاب Anthropolgy of the Colonial Encounter قابل ذکر ہے کیونکہ انہوں نے بتایا ہے کہ کس طرح اس مضمون کے علمبرداروں نے نوآبادیاتی نظام میں مدد کی۔(4)

معاشرتی علوم کے استعمال کے ذریعے کمپنیوں کے منیجر محنت کشوں پر بہتر کنٹرول کے طریقے بتاتے ہیں اور چیزوں کے فروخت کے نِت نئے ہتھکنڈے تیار کرتے ہیں۔ اگرچہ معاشروں اور آبادیوں پر کنٹرول حاصل کرنے میں معاشرتی علوم مددگار ثابت ہوتے ہیں، ان کی پھر بھی وہ حیثیت اور وہ مقام نہیں ہے جو کہ معروضی سائنس کو حاصل ہوتا ہے۔ پھر بھی معاشرتی علوم کے ماہر ہر کام اپنے علم کو ناگزیر اور اہم ثابت کرنے کی کوشش میں اسے سائنس کا

درجہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

معاشرتی علوم اور سماجی شعور

ایک طرف تو معاشرتی علوم سے منسلک دانشور وہ ہوتے ہیں جو کہ خود کو ریاست سے جوڑ لیتے ہیں اور ریاستی دانشور بن جاتے ہیں۔ دوسری طرف ایسے ماہرین بھی ہوتے ہیں جو کسی اخلاقی جذبے سے سرشار ہوتے ہیں اور معاشرے کو بہتر بنانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ایسے ماہرین سماجی مسائل کے حل تلاش کرنے کے شوق میں یا تو حکومتی اداروں سے منسوب ہو جاتے ہیں، یا پھر غیر سرکاری تنظیموں سے منسلک ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے ماہرین کے پاس ہر سماجی مسئلے کا آسان حل ہوتا ہے اگرچہ مسائل بے حد پیچیدہ ہوتے ہیں۔ سماجی فلاح کے جذبے سے سرشار اس قسم کے ماہرین معاشرتی علوم کا اطلاق ہر شے پر کرتے ہیں مثال کے طور پر آبادی کے مسائل، جنسی تفریق کے ایشوز، بچوں کے حقوق، ماحول کی آلودگی، صحت، تعلیم کا فروغ وغیرہ۔

عموماً اس طرز کی سوچ سطحی ہوتی ہے۔ چنانچہ ایسے ماہرین سمجھتے ہیں کہ ایک ہی حل سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ عام طور پر وہ ورلڈ بینک یا آئی۔ایم۔ایف کے دیئے ہوئے نسخوں کے استعمال سے پورے ملک اور معاشرے کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ ایک ملک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، ایک معاشرہ دوسرے سے فرق ہوتا ہے، ایک خطہ اور اس کے مخصوص مسائل دوسرے خطوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن ساختیاتی ردّوبدل (Structural Adjustment) اور مئوثر حکمرانی (Good Governance) کے ماننے والے اس بات کو بالائے طاق رکھ کر ہر جگہ ایک ہی ساحل تجویز کر دیتے ہیں اور ان بنے بنائے نسخوں کو تنقیدی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ نتیجتاً ان کے حل مزید مشکلات پیدا کرتے ہیں اور غربت دور کرنے والے مزید غربت پھیلانے میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے ماہرین کا جذبہ تو سچا ہوتا ہے لیکن سوچ مقفل ہوتی ہے۔

معاشرتی علوم اور یونیورسٹیاں

ایک تیسرا گروپ جو کہ معاشرتی علوم سے منسلک ہے عموماً یونیورسٹیوں میں پایا جاتا ہے

جہاں وہ تدریسی کام میں مصروف ہوتے ہیں۔ پبلک سیکٹر کی یونیورسٹیوں میں تاریخی طور پر وسائل کی شدید کمی رہتی ہے اور HEC نے معاشرتی علوم کے فروغ پر بہت دیر سے نگاہ ڈالی۔ نجی یونیورسٹیوں میں حالات قدرِ بہتر ہیں لیکن سرکاری اداروں میں اساتذہ کے پاس نہ تو وسائل ہوتے تھے کہ وہ تحقیق کر سکیں اور نہ ہی علمی و ذہنی آزادی۔ ان اداروں میں نہ تو اچھی نئی کتابیں ملتی ہیں، نہ جرائد اور نہ ہی کانفرنس وغیرہ منعقد کی جاتی ہے تاکہ اساتذہ دوسروں سے تبادلہ خیال کر سکیں۔ اساتذہ کا معاوضہ بے حد کم ہوتا تھا لہٰذا وہ نہ تو اچھی طرح پڑھا سکتے تھے اور نہ ہی نئی سوچ اور تحقیق میں دلچسپی رکھتے تھے۔ نتیجتاً وہ وہی پرانے، گھسے پٹے نظریات کو عام کرتے رہے اور پرانی کتابوں پر انحصار کرتے رہے۔ پچھلے کچھ عرصہ میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی وجہ سے کچھ تبدیلی ضرور واقع ہوئی، لیکن سوچ پر اس قدر قدغن لگا دی جاتی ہے کہ قوم پرستی اور مذہب کے علاوہ کم ہی کوئی اور نقطہ نظر پیش کیا جاتا ہے۔

تحقیق کو معلومات حاصل کرنے کے لئے ہی اہم نہیں سمجھا گیا۔ بلکہ اس بات کو اہم قرار دیا گیا کہ سماجی مسائل کو حل کرنے والی تحقیق کی جائے۔ ایسی تحقیق کو بیکار قرار دیا جاتا رہا جو انسان کے ذہن کو کشادہ کرتی ہے اور روشن خیالی کو جنم دیتی ہے۔ تحقیق برائے تحقیق کو فضول قرار دیا گیا چنانچہ معاشرتی علوم کے ماہرین نے ایسی تحقیق پر زور دیا جس کے نتائج کا اطلاق ہو سکے اور معاشرتی مسائل حل ہو سکیں۔ علم کی اپنی اہمیت کو اُجاگر نہیں کیا گیا۔ یہ کہا جاتا تھا کہ غریب ممالک محض شوقیہ تحقیق کا بوجھ نہیں برداشت کر سکتے لہٰذا ہر قسم کی تحقیق فائدہ مند ہو اور ایسی ہو کہ جس کا اطلاق کر کے دشواریوں کو دور کر دیا جائے۔ اس دباؤ کی وجہ سے تحقیق دان تخلیقی موضوعات سے ہٹ کر ایسی تحقیق میں لگ گئے جو کہ سطحی تھی اور وقت کے حاوی رجحانات کی عکاس تھی۔ تاریخی اور فلسفیانہ موضوعات پر تحقیق کو وقت اور وسائل کا زیاں گردانا گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرتی علوم میں کوئی نئی تھیوری نہ بنی، کوئی نئے نظریات یا زاویئے سامنے نہ آ سکے۔

وقت کے ساتھ ساتھ تحقیق کا معیار گر گیا اور جلد اور آسان طریقے سے ہو جانے والے سروے عام ہو گئے۔ طالب علموں نے سروے کر کے اعداد و شمار اکٹھے کئے اور ڈگریاں حاصل کر لیں۔ ان کی تحریروں میں نہ تو تجزیہ ہوتا تھا اور نہ ہی کوئی نئی بات۔ اس قسم کی تحقیق ذہنی سستی کی غمازی کرتی تھی۔ اس تحقیق میں خون پسینہ نظر نہیں آتا تھا کیونکہ یہ

صرف ڈگری حاصل کرنے کی غرض سے کی جاتی تھی۔ اس سے عقل وفہم میں اضافہ نہیں ہوتا تھا۔ طالب علم اپنے مواد کو کسی تھیوری یا کسی نظریہ سے نہیں جوڑتے تھے چنانچہ اُن کے تھیسس علم میں کوئی اضافہ نہیں کرتے تھے۔

معاشرتی علوم کا زوال

سطحی تحقیق، نئی سوچ کا فقدان اور تجربات سے عاری علم کا ایک پریشان کن نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرتی علوم کا مقام مزید گر گیا اور یہ مضامین غیر اہم، فضول اور وقت کا زیاں قرار دیئے جانے لگے۔ عالمی سطح پر اور پاکستان میں بھی، تاریخ، فلسفہ اور عمرانیات کے شعبے بند ہونے لگے۔ جب معاشروں میں علم کو صرف سطحی حل نکالنے کا ذریعہ مان لیا جائے تو تاریخ جیسے علوم غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ضروری نہیں کہ کسی مسئلے کا حل ایک دم اس میں سے نکل آئے۔ اگرچہ معاشرے کا کوئی بھی مسئلہ اُس کی تاریخ کو پڑھے بغیر سمجھ میں نہیں آتا، پھر بھی تاریخ کو غیر اہم قرار دے دیا گیا۔ ہر عمل کا کوئی نہ کوئی فلسفہ ہوتا ہے مگر فلسفے کو فضول گردانا گیا۔ ادب انسان کو اخلاقی بلندیوں پر لے جاتا ہے مگر ادب کو بیکار قرار دے دیا گیا۔ جو مضامین روح کی غذا ہوتے ہیں، خواہ وہ فنونِ لطیفہ ہوں یا ادب اور تاریخ، ان تمام کو غیر ضروری بنا دیا گیا۔ تمام ایسے مضامین جو کہ ایک انسان کو انسان بنانے میں مدد کرتے ہیں، زوال پذیر ہو گئے۔ چنانچہ آجکل کا کوئی مسئلہ بھی گہرائی سے پرکھنا مشکل ہے کیونکہ تمام وہ مضامین جو موجودہ دور کے مسائل کا سرچشمہ ہو سکتے ہیں، ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیئے گئے۔ معاشرتی علوم کا ارتقاء فلسفے کی وجہ سے ہوا اور فلسفے کو ہی غیر ضروری مان لیا گیا۔ اخلاقی، سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی کو سمجھنے کے ذرائع زوال پذیر ہو چکے ہیں۔

اس زوال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان مضامین کو پڑھنے والوں کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ چونکہ ان کو پڑھ کر ملازمت نہیں ملتی اور سرمایہ با آسانی نہیں بنتا لوگوں کو ان علوم کی افادیت نظر نہیں آتی۔ مہنگائی کے اس دور میں ایسا علم حاصل کرنا مشکل ہو گیا ہے جو روزگار کی طرف نہ لے جائے۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ حکومتیں اور ریاستیں اس قسم کے علم کی حوصلہ شکنی کرتی ہیں جو تنقیدی سوچ پیدا کرتا ہو۔ حکمران طبقات کو ایسی تعلیم سے خوف محسوس ہوتا ہے جو لوگوں میں سیاسی شعور بیدار کرے اور وہ

جان لیں کہ اُن کا استحصال کون کر رہا ہے اور کس طرح کر رہا ہے۔ تاریخ کا مضمون تاریخی شعور پیدا کرتا ہے جو کہ سیاسی شعور کی بنیاد ہوتا ہے۔ ان علوم کی حوصلہ افزائی نہ کرنے کا مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ بیدار نہ ہوں اور تنقیدی نقطہ نظر نہ اپنائیں۔

آئی۔ٹی اور کاروباری تعلیم کا عروج

جہاں ایک طرف معاشرتی علوم کی حوصلہ شکنی کی جا رہی ہے وہاں دوسری جانب آئی ٹی (Information Technology) اور انتظامی سائنس (Management Sciences) کی پُرزور حمایت کی جا رہی ہے۔ انتظامی علوم، معاشرتی علوم کو بروئے کار لاتی ہے جب مزدوروں اور آبادیوں پر تسلط جمانا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر نفسیات پڑھ کر انسان دوسرے لوگوں پر اثر انداز ہونے کے مؤثر طریقے سیکھتا ہے۔ نام نہاد آزاد منڈی کی معیشت اور نیولبرل (Neo Liberal) سوچ کے تحت منیجر بنانے کی بے حد ضرورت ہے خاص طور پر ایسا منیجر جو سائنسی طریقے سے محنت کشوں پر کنٹرول قائم کر سکے۔ زندگی کے ہر شعبے کو انتظامی امور کا مسئلہ بنایا جا چکا ہے۔ سیاسی رشتے اور عدم برابری اب محض انتظامی امور مانے جاتے ہیں۔

آئی۔ٹی (Information Technology) اور انتظامی علوم طبقاتی کشمکش میں سرمایہ داروں کے ہتھیار بن کر اُبھرے ہیں۔ محکوم طبقوں کے بچے آئی۔ٹی اور کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ تکنیکی طور پر ہنرمند ہو جائیں اور اُنہیں اچھی نوکریاں مل جائیں۔ مقتدر اور حکمران طبقات کے بچے انتظامی سکولوں میں جاتے ہیں جہاں وہ حاکم اور مقتدر بننے کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان طبقات کے بچے ملٹی نیشنل کمپنیوں اور نجی شعبے کی دیگر کمپنیوں میں اعلیٰ درجے کی انتظامی سطح پر نوکری حاصل کرتے ہیں۔ سب سے نچلا اور محکوم طبقہ اُن غریب اور دیہی افراد پر مشتمل ہے جو کہ کمپیوٹر اور آئی۔ٹی کی تعلیم سے بھی محروم ہیں اور ان کی سماجی طاقت میں مزید کمی واقع ہو رہی ہے۔ یہ ملازمت کی منڈی میں مقابلہ نہیں کر سکتے لہٰذا غیر رسمی شعبوں میں بہت کم معاوضے پر کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

انتظامی سائنس (Mangement Sciences) خاص طور پر غریب آبادیوں اور صارفین پر غلبہ حاصل کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہ لوگ اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ لوگ کیا

کھائیں، کیا پہنیں، کیا خریدیں اور کیا سوچیں۔ایک انسان کی ذات کی آزادی ختم ہوجاتی ہےاور وہ ان ماہرین کے ہاتھ میں کھلونا بن جاتا ہے۔انسان کے اندر کا شخص جو کہ فلسفہ، ادب یا تاریخ پڑھ کر مستحکم اور آزاد ہوسکتا تھا، وہ ایک قسم کا غلام بن جاتا ہےاور پہلے سے دی گئی سوچ اور اشیاء کا انتخاب کرتے ہوئے سمجھتا ہے کہ وہ آزادانہ انتخاب کررہا ہے۔لیکن فلسفہ، ادب اور تاریخ کی منڈی کی معیشت میں کوئی ضرورت نہیں جہاں انسان صرف ایک صارف ہے یا پھر مزدور۔اگرچہ یقین سے کہنا مشکل ہوتا ہے کہ کسی مخصوص صورتحال میں کوئی شخص کیا کرے گا اور کیا سوچے گا، پھر بھی منیجروں کی کوشش ہوتی ہے کہ صارفین کے رویّوں کا تعین کیا جائے اور مزدوروں کی خواہشات کو کس طریقے سے منڈی کے رشتوں سے جوڑا جائے۔بڑھتی ہوئی منڈی کی معیشت کو ایسے فرمانبردار شہریوں کی ضرورت ہوتی ہے جن کو بات ماننے کی عادت ہو اور وہ وہی کریں جو اشتہار بتاتے ہیں یا حکمران طبقے کہتے ہیں۔ایسے معاشرتی علوم جن میں سیاسی شعور نہیں ہے، اور احساس ذمہ داری کی کمی ہے۔یا وہ صرف فرمانبردار شہری بناتے ہیں اور تنقیدی سوچ رکھنے والے انسان نہیں بنا پاتے۔

بازاری علم کا عروج

جہاں پوری دنیا اور تمام معاشروں کو محض ایک منڈی بنا دیا گیا ہے، وہاں علم بھی بازاری ہو چکا ہے۔اسے بیچا اور خریدا جا سکتا ہے۔جہاں ایک دور میں سچ کی تلاش ہوتی تھی، علم کی پیاس ہوتی تھی، وہاں اب زور صرف ایسا علم خریدنے پر ہے جو بازار میں فروخت ہو سکے اور منافع بخش ہو۔افراطِ زر کے اس دور میں جہاں روزگار کے مواقع محدود ہیں، والدین کی ہر دم کوشش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد جلد سے جلد کوئی فائدہ مند ڈگری حاصل کرے اور کسی اچھی ملازمت پر فائز ہو جائے۔نتیجتاً طالب علموں پر بے حد دباؤ ہے اور وہ بے پناہ مضامین پڑھتے ہیں اور کئی دفعہ دو یا تین تین ڈگریاں حاصل کرتے ہیں تاکہ خود کو منڈی میں اچھے داموں بیچ سکیں۔اس طرح انفرادیت کی طرف رجحان بڑھا ہے۔کیونکہ ہر شخص کا دوسروں کے ساتھ مقابلہ ہے۔چنانچہ اجتماعی سوچ کا پھیلاؤ بہت مشکل ہو چکا ہے۔نوکریوں اور ترقیوں اور سرمائے کی دوڑ میں لوگ ایک دوسرے سے بیگانے ہو جاتے ہیں اور باہمی تعلقات اور رشتے ناطے کمزور ہو جاتے ہیں۔ہر شخص دوسرے کے

مقابلے میں کھڑا ہے جس سے باہمی روابط ٹوٹ چکے ہیں اور زر کی دوڑ رہ گئی ہے۔ معاشرتی علوم اب انسان کی شناخت نہیں کرتے بلکہ صرف مزدوروں اور صارفین کی شناخت کرتے ہیں جو سرٹیفکیٹ، ڈگریوں، مارکس اور نوکریوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔

علم کو ایک بازاری شے بنانے کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ محض حقائق اور معلومات کو ہی علم کا درجہ دیا جانے لگا۔ ماضی میں علم کا مطلب محض حقائق ہی نہیں تھا بلکہ مختلف حقائق اور معلومات کو آپس میں جوڑ کر تصورات کی تعمیر کو علم کہا جاتا تھا، اور تصورات کے میل جول سے تھیوری بنائی جاتی تھی۔ علم کا درجہ حقائق سے بالاتر ہوتا تھا۔ حقائق بذاتِ خود بے جان ہوتے ہیں۔ جب ان کو ملا کر کوئی نظریہ یا تصور تشکیل ہو تو ان میں زندگی آ جاتی ہے اور یہ کہانی بیان کرتے ہیں۔ آج کے دور میں جہاں اعلیٰ درجے کے علم کی حیثیت گر چکی ہے، بے جان حقائق، مثلاً نام، تاریخ یا جگہ کا نام ہی علم تصور کر لئے جاتے ہیں۔ طلبہ کی اکثریت بنیادی حقائق سے آگے نہیں بڑھ پاتی۔ وہ ان کو جوڑ کر تجزیہ نہیں کرتے اور تھیوری نہیں بناتے۔

کوئی علمی تھیسس (مقالہ) جس میں صرف عام اعداد و شمار ہوں پاس ہو جاتا ہے اور ڈگری مل جاتی ہے۔ ان حقائق یا اعداد و شمار کو کسی نظریئے یا تھیوری کے تناظر میں نہیں دیکھا جاتا۔ اعداد و شمار ہی کو حتمی علم مان لیا جاتا ہے۔ تخلیقی اور تجزیاتی سوچ مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ روایتی طرزِ تحقیق کا بھی زوال ہو چکا ہے کہ جس میں کسی نہ کسی تھیوری سے مفروضے حاصل کئے جاتے تھے، پھر ان مفروضوں کو حقائق جمع کر کے پرکھا جاتا تھا۔ سطحی مشاہدے کو ہی علم تسلیم کر کے ڈگری دے دی جاتی ہے۔ ایم۔اے کی ڈگری محض سروے کر کے حاصل کر لی جاتی ہے۔ طلبہ کی صحیح رہنمائی نہیں کی جاتی، ان کے اندر ذہنی سستی اور پستی کو فروغ ملتا ہے اور ان کو نئی تھیوری بھی نہیں پڑھائی جاتی کہ جس کی بنیاد پر وہ تحقیق کر سکیں۔ علم کے منڈی کی معیشت سے مل جانے کے باعث اس کا معیار گر چکا ہے۔

آمریت اور معاشرتی علوم

جن معاشروں میں علم اور تحقیق پر ریاست کا بے پناہ کنٹرول ہوتا ہے، وہاں نئے نظریات کی ساخت اور نئی سوچ کو ایک خطرناک عمل گردانا جاتا ہے۔ پاکستان کو بہت لمبے عرصے تک آمریت

کا سامنا رہا ہے چنانچہ یہاں پر بہت سے قوانین بنائے گئے جو آزادی اظہار اور آزادی گفتار کی نفی کرتے تھے۔ سوچ کی آزادی ختم کی گئی اور ذہن کو مفلوج کیا گیا۔ سرکاری اداروں میں تنقیدی سوچ پر پابندی رہی کیونکہ کارل مارکس جیسے مفکرین کو پڑھانا غلط سمجھا جاتا تھا۔

ایک طرف آزادی اظہار پر پابندی تھی اور سوچ مقفل تھی، تو دوسری طرف چند ایسے مضامین تھے جن کو بے حد اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ مثال کے طور پر ''نظریہ پاکستان'' کو پڑھانا بے حد اہم مانا جاتا ہے اگرچہ اس نظریئے کی کوئی تشریح یا تعریف میسر نہیں ہے۔ قوم پرستی پر مبنی تصورات کی تبلیغ کی جاتی تھی اور قوم کو مذہب سے جوڑ کر ''مقدس'' مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ ''قومی نظریئے'' پر تنقید کرنا غداری قرار دیا جاتا تھا اور اس نظریئے پر اندھا اعتقاد حب الوطنی کی نشانی تھا۔ نتیجتاً طلبہ میں پہلے سے تیار شدہ ''سچ'' کو ماننے کی عادت ڈالی گئی اور احساس دلایا گیا کہ نظریات منجمد ہوتے ہیں اور ان کا ارتقائی عمل سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ تنقیدی اور تخلیقی سوچ مقید ہوگئی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طلبہ نئی سوچ کی تعمیر کرنے سے قاصر رہے اور فرسودہ اور گھسے پٹے جملے رٹ کر امتحان پاس کرنے لگے۔ اگرچہ نجی تعلیمی اداروں میں آزادانہ سوچ کے مواقع قدرِ بہتر ہوتے ہیں، پھر بھی انتظامی سائنس اور آئی۔ ٹی کے حاوی ہونے کے باعث ان اداروں میں بھی تخلیقی اور مخالفانہ سوچ پروان نہیں چڑھ پائی۔ وقتاً فوقتاً LUMS جیسے اداروں سے کوئی قابلِ ذکر مقالہ یا تھیسس ضرور سامنے آتا رہا، مگر عام طور پر نجی ادارے بھی منڈی کے تقاضوں کے غلام رہے اور غور و فکر پر تالے لگا دیئے تاکہ کوئی طاقت ناراض نہ ہو۔

اگرچہ سوچ اور غور و فکر پر تالے عموماً آمرانہ معاشروں کی نشانی ہوتی ہے، یہ کہنا غلط ہوگا کہ جمہوری معاشروں میں مکمل آزادی ہوتی ہے۔ جمہوری معاشروں میں علم و عقل پر کنٹرول براہِ راست تو کم ہی ہوتا ہے لیکن بلاواسطہ طور پر ان معاشروں میں بھی مختلف طرز کی پابندیاں پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر بھارت میں بی۔ جے۔ پی کے دور میں علم کو ایک مخصوص سوچ کے تحت کنٹرول کرنے کی کوشش کی گئی اور تاریخی تحقیق کی انڈین کونسل پر اثر انداز ہونے کی بھی کوشش ہوئی۔ چند تاریخ دانوں کی کتابوں پر پابندی لگائی گئی اور ہندوتوا سے متاثر افراد کی تقرریاں کی گئیں۔ اسی طرح امریکہ میں بھی کورپوریٹ میڈیا اور یونیورسٹیوں کی کورپوریٹ انتظامیہ مختلف

طریقوں سے علم اور اس کی تشکیل پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہیں۔

کیونکہ علم اور طاقت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے لہٰذا مقتدر حلقے اور طاقتور افراد کی کوشش ہوتی ہے کہ علم کو قابو میں لایا جائے۔ ضروری نہیں ہے کہ وہ افراد جو متبادل سوچ کے مالک ہیں اس بات سے پوری طرح شکست خوردہ ہو جائیں، لیکن متبادل نظریات بنانا اس صورتحال میں قدرِ زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ حکومتیں اور کاروباری دنیا کے لوگ اس قسم کی قدغن لگا سکتے ہیں کہ کسی کو باآسانی معلوم بھی نہ ہو سکے کہ کوئی پابندی ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ نے جس طریقے سے عوام کو قائل کیا کہ عراق میں بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہیں، اس سے پتا چلتا ہے کہ ملک کی مکمل آبادی کو میڈیا کے ذریعے بیوقوف بنایا جا سکتا ہے۔

علم کی ساخت کے مختلف ذرائع

علم کی ساخت کے مختلف ذرائع موجود ہوتے ہیں۔ ان میں ریاست، حکومت، غیر سرکاری تنظیمیں، یونیورسٹیاں، ذرائع ابلاغ، سیاسی پارٹیاں اور نجی کاروباری شعبہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ تحقیقی ادارے، مذہبی پارٹیاں اور تنظیمیں بھی علم کی تشکیل کرتے ہیں۔ ایک گروہ کا علم کسی دوسرے گروہ سے متصادم ہوتا ہے یا پھر ایک ہی تنظیم یا ریاست کے بنائے ہوئے علم میں اندرونی تضاد ہوتا ہے۔ علم کی نشوونما طبقاتی اور سماجی کشمکش کے دوران ہوتی ہے۔ کسی نہ کسی گروپ کا علم جائز اور صحیح قرار دے دیا جاتا ہے جب تک کہ کوئی دوسرا علم اس کو چیلنج نہ کرے اور اپنی حاکمیت قائم نہ کر لے۔ لہٰذا علم کبھی بھی کلی طور پر معروضی یا غیر جانبدار نہیں ہوتا۔ علم ہمیشہ سیاسی ہی ہوتا ہے کیونکہ یہ سماجی کشمکش کے دوران جنم لیتا ہے اور کسی ایک طبقے یا گروہ کے حاوی ہونے کی غمازی کرتا ہے۔ اس میں طبقاتی یا گروہی مفادات کا عکس ہوتا ہے۔ معاشرتی علوم کا محقق کون سے سوالات پوچھے گا اور ان کا تجزیہ کس طرح کرے گا، اس بات کا انحصار اس کی سماجی حیثیت پر ہے اور اس کے طبقے پر ہوتا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علم کی تشکیل کا عمل طاقت حاصل کرنے کا عمل ہوتا ہے اور علم کی تعمیر کرنے والے پر بے پناہ اخلاقی ذمہ داری ہوتی ہے کیونکہ اس کے تیار کردہ علم کے لوگوں پر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ایٹم بم بنانے کے علم نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر قیامت برپا کر دی اور

لاکھوں لوگ موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ ہندوستان کے مقامی باشندوں کے بارے میں اس قسم کا علم بنایا گیا کہ اُن پر قابو پانا اور غلبہ حاصل کرنا آسان ہو گیا۔ اس لئے یہ بہت ضروری ہوتا کہ جو شخص بھی علم کی تعمیر کرے وہ اس علم کے سماجی نتائج کے لئے ذمہ داری قبول کرے اور جوابدہ ہو۔ معاشرتی علوم کی تعمیر کرنے والوں میں کئی دفعہ یہ احساس ذمہ داری نہیں پایا جاتا۔ مثال کے طور پر وہ گلوبلائزیشن اور نجکاری کے بارے میں ورلڈ بینک اور آئی۔ایم۔ایف کے بنائے ہوئے علم سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ بنا سوچے سمجھے اس کو فروغ دیتے ہیں اور مقامی مزدوروں اور کسانوں پر اس علم کے اثرات کے بارے میں بالکل نہیں سوچتے۔ وہ معروضی ہونے اور غیر جانبدار ہونے کے پردے کے پیچھے چھپ کر بے حد جانبدار اور تباہ کن علم کی تشکیل کرتے ہیں۔

جو شخص بھی معاشرتی علوم کی تعمیر کرتا ہے اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود سے چند سوالات پوچھے: میں یہ کیوں کر رہا ہوں؟ اس سے کس کو فائدہ ہوگا؟ کس کو نقصان ہوگا؟ میں یہ تحقیقی سوال کیوں پوچھ رہا ہوں؟ یہ سوال کہاں سے میرے ذہن میں اُبھرا ہے؟ میری تحقیق کے لوگوں پر کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ ان سوالات کے جواب اُس کو سماجی رشتوں، ناہمواریوں اور عدم برابریوں سے روشناس کروائیں گے اور وہ ایسا علم تعمیر کرے گا جو ذمہ دارانہ ہوگا۔

References

1- The Order of Things: An Archeology of the Human Sciences, Vintage Books, New York, 1973.

2- Antonio Gramsci - Prison Note books.

3- Edward Saeed - Orientalism, Vintage Books, New York, 1978.

4- Total Asad, Anthropolgy and the Colonial Encounter.

پاکستان میں تاریخ کا مضمون

ڈاکٹر مبارک علی

علم کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ اس کو مختلف مضامین کی شکل میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ جب افلاطون نے اکیڈمی کے نام سے یونیورسٹی قائم کی تو اس میں فلسفہ کے مضمون کی اہمیت تھی، اور اس سے متعلق سیاسیات، اخلاقیات، اور جمالیات کو پڑھایا جاتا تھا۔ اس کے شاگرد ارسطو کی یونیورسٹی لے سیم (Lyceum) میں ارسطو نے علم کی دوسری شاخوں کو متعارف کرایا۔ اس نے اپنے وقت کے اہم موضوعات پر لکھا، جن میں فلسفہ کے علاوہ شاعری، المیہ، سیاسیات، طبیعات اور مابعدالطبیعات وغیرہ شامل ہیں۔ اس نے سب سے پہلے لبرل علم کی اصطلاح کو استعمال کیا۔

رومیوں کے عہد میں، ایک تو انہوں نے یونانیوں کی علمی میراث کو اختیار کیا دوسرے انہوں نے قانون کے علم کو اہمیت دی، فن خطابت جس کی ابتداء یونان سے ہو چکی تھی، اس کو بھی نصاب کا حصہ بنایا۔

عہد وسطیٰ میں جب چرچ کا معاشرہ پر تسلط قائم ہوا، تو اب تھیالوجی یا الٰہیات کو دوسرے مضامین پر فوقیت دی گئی اور فلسفہ و ادب اور دوسرے مضامین اس کے ماتحت ہو گئے جن کا مقصد یہ تھا کہ مذہبی عقائد کو درست ثابت کیا جائے۔

علم کے پھیلاؤ میں ایک انقلابی تبدیلی اس وقت آئی جب رینا ساں کے عہد میں انسانیت دوست (Humanists) دانشوروں نے نصاب کو تبدیل کر کے اس میں قانون، فن خطابت کے ساتھ ساتھ ادب، موسیقی، ریاضی، تاریخ، سیاسیات اور جغرافیہ کو شامل کیا، اس لئے ابتداء میں یہ علوم ہیومنٹیز (Humanities) کہلائے۔

جب پندرہویں اور سولہویں صدیوں میں سائنسی انقلاب آیا تو سائنس کی اہمیت ہوئی، اٹھارہویں صدی میں روشن خیالی کی تحریک کے دوران دانشوروں نے سائنس، عقلیت پرستی، اور ترقی کے نظریات کو مقبول بنایا، اس وجہ سے آہستہ آہستہ علوم کی تقسیم ہونے لگی۔ سائنسدانوں کے لئے پہلے نیچرل فلسفی کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی، جو بعد میں سائنسدان کہلانے لگے۔

جب جرمنی میں جدید یونیورسٹی کی بنیاد انیسویں صدی میں ہوئی تو انہوں نے علوم کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا۔ جرمن یونیورسٹیوں میں دو سائنٹسٹ فیکلٹیز ہوتی ہیں، ایک تو روحانی علوم اور دوسری نیچرل علوم کہلاتی ہیں۔ روحانی علوم کی فیکلٹی میں فلسفہ، ادب، تاریخ، جغرافیہ، معاشیات، سیاسیات، لسانیات اور موسیقی وغیرہ کے شعبے ہوتے ہیں، جبکہ نیچرل علوم کی فیکلٹی میں سائنس کے شعبہ ہیں۔

چونکہ سائنس کا تعلق دلیل، تجربہ، اور مشاہدہ پر ہے، اس لئے جدید دور میں ہر مضمون نے خود کو سائنس میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ اس وجہ سے سوشل سائنس کی اصطلاح معاشیات، نفسیات، سیاسیات، شوشالوجی، انتھراپالوجی اور تاریخ اور جغرافیہ کے لئے استعمال ہونے لگی، جبکہ ادب، فلسفہ، موسیقی، جمالیات اور اخلاقیات Humanities میں شامل ہوگئیں۔ اس عمل نے سوشل سائنس کو Humanities سے خارج کر کے ان علوم کو سائنس بنا دیا۔

سوشل سائنس کے علوم، ہیومنٹیز سے علیحدہ ہو کر دلیل اور عقلیت پرستی کے بندھنوں میں بندھ گئے۔ اس وجہ سے ان مضامین کے اندر جو جذبات اور رومان تھا، وہ نہ رہا۔

یہ انسانی ذہن اور معاشرہ کو بطور Object یا بطور شے کے دیکھتے ہیں، اور ان کا تجزیہ کرتے ہیں، جس کی وجہ سے یہ مضامین انسانی جذبات اور اس کی گہرائیوں کو نہیں دیکھ پاتے ہیں۔

تاریخ میں بیسویں صدی کی بڑی اہمیت ہے، کیونکہ اس نے نہ صرف پچھلی صدیوں کی میراث کی حفاظت کی بلکہ تیزی سے سائنس، ٹکنالوجی، سماجی علوم اور ہیومنٹیز (Humanities) میں انقلابی تبدیلیاں کیں۔ جیسے جیسے معاشرہ ان تبدیلیوں کے نتیجہ میں پیچیدہ ہوتا چلا گیا اور نئے مسائل سے دوچار ہوا، اسی طرح سے سماجی علوم اور ہیومنٹیز نے اپنے دائرہ کار کو پھیلایا۔ اس کے نتیجہ میں معاشرہ میں پروفیشنل طبقوں کا وجود عمل میں آیا۔ جس طرح سے ڈاکٹر، انجینئر، اکاؤنٹنٹ، اور منیجر پروفیشنل طبقوں میں ابھرے اسی طرح سماجی علوم کے ماہرین کا طبقہ پیدا ہوا، جن میں

تاریخ، سیاسیات، عمرانیات، بشریات، نفسیات، فلسفہ، معیشت، اور بین الاقوامی امور کے ماہرین شامل تھے، اس طرح آرٹ، موسیقی، رقص، فن تعمیر، مجسمہ تراشی، اور ادب میں بھی پروفیشنل لوگوں نے اپنی پیشہ ورانہ انجمنیں بنائیں۔

تاریخ کے مضمون میں پروفیشنل مورخ، اس وقت باعمل ہوئے جب یونیورسٹیوں میں اس مضمون کو پڑھایا جانے لگا۔ انیسویں صدی میں جرمنی میں لیوپولڈ رانکے (Leopold Ranke) اور اس کے ساتھیوں اور شاگردوں نے تاریخ نویسی میں انقلابی تبدیلیاں کیں۔ اس لئے ایک مورخ کے لئے یہ لازمی ہوگیا کہ وہ تحقیق کے سلسلہ میں مکمل طور پر تربیت حاصل کرے، تحقیق کے نئے طریقوں، اور ان کے استعمال نے مورخوں کے پروفیشن کو مشکل بنا دیا۔ اب سخت تربیت جس میں ماخذوں کا مطالعہ، کئی زبانوں کا جاننا، اور مواد کو ترتیب کے ساتھ، اعداد و شمار کی روشنی میں، دلیل کے ساتھ پیش کرنا، خاص طور سے جب معاشرے کے رجحانات کو سمجھنے کے لئے مختلف نظریات یا تھیوریز پیدا ہوئیں، جن میں نیشنل ازم، سوشل ازم، امپیریل ازم، فیمن ازم، اور پازیٹوازم یا ثبوتیت پسندی شامل ہیں، ان کی روشنی میں واقعات کی توضیح اور تشریح کرنا۔

ایک طرف تو تاریخ کا مضمون اپنی جگہ کئی شعبوں میں تقسیم ہوا، دوسرے اس سے علیحدہ ہوکر نئے مضامین وجود میں آئے۔ ایک زمانہ میں آثارِ قدیمہ، اور سیاسیات تاریخ میں شامل تھے، اب یہ جداگانہ حیثیت کے حامل ہوگئے ہیں۔ علم کے اس پھیلاؤ میں تاریخ کو بھی دوسرے مضامین کے خیالات سے استفادہ کرنا پڑا، جن میں معاشیات، عمرانیات، بشریات اور نفسیات وغیرہ شامل ہیں۔ اس عمل کی وجہ سے کسی کے لئے بغیر تربیت کے مورخ بننا اب سہل نہیں ہے۔ اس کے لئے یونیورسٹی اور تحقیقی اداروں کی ضرورت ہوگئی ہے۔

اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم پاکستان میں تاریخ کے مضمون اور مورخوں کے بارے میں نظر ڈالتے ہیں، تو ہمیں یہاں پروفیشنل مورخوں کا وجود نظر نہیں آتا ہے۔ ایک ایسا طبقہ کہ جو تاریخ کے مختلف شعبوں میں تحقیق کر رہا ہو، اور معاشرے کی تبدیلیوں، اور ان کے مسائل پر بحث کر رہا ہو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں تاریخ کا شعبہ صرف نصاب کی تعلیم دیتا ہے۔ مورخوں کی تربیت کے لئے جس عمل کی ضرورت ہے وہ ہماری یونیورسٹیوں میں نہیں ہے۔ اس

کے علاوہ عالمی طور پر جو تاریخ کے مضمون میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں، ان سے ناواقف ہیں، ہمارے ہاں پابندی سے تاریخ پر کانفرنسوں کا انعقاد نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی جاتی ہے۔ نہ ہی ہماری یونیورسٹیاں غیر ملکی مورخوں کو لیکچرز کے لئے بلاتی ہیں۔ اس کی وجہ سے ہم بین الاقوامی اکیڈمک اور اس کی تحقیقات سے کٹ گئے ہیں۔ ہماری لائبریریوں میں بہت کم تاریخ کے متعلق تحقیقی جرنلز آتے ہیں، اور ہم ان نئی کتابوں سے بھی کم واقف ہیں، جو تاریخ کے مختلف موضوعات پر شائع ہو رہی ہیں، اس صورت میں ہمارے تاریخ کے استادوں کے لئے یہی رہ جاتا ہے کہ وہ پرانے نصاب اور نظریات کے مطابق تاریخ کو پڑھاتے رہیں۔ جب یہ مضمون جامد ہو کر رہ گیا، اور اس میں نئی تحقیقات کی گنجائش نہیں رہی، تو اس صورت میں اس کی اہمیت بھی کم سے کم ہو گئی، اور عام لوگوں میں اس کے بارے میں یہ تاثر ابھرا کہ یہ محض بادشاہوں کی کہانیاں ہیں، یا ماضی کے واقعات کا مجموعہ ہے، جس کا تعلق ہماری آج کی دنیا سے نہیں ہے اس لئے اس مضمون کی کیا ضرورت ہے؟

پاکستان کی تاریخ نویسی کی جڑیں کولونیل دور کی تاریخ نویسی میں پیوست ہیں، قومی آزادی کی جدوجہد میں ہندوستان کے مورخوں نے تاریخ کی مدد سے قوم پرستی کے جذبات کو ابھارا۔ اس میں الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کا بڑا حصہ ہے، جس کے مورخوں نے عہد مغلیہ کی تاریخ کے ذریعہ مشترک کلچر کی تشکیل کو ابھارا، مگر جب سیاست میں ہندو مسلم اختلافات ہوئے اور دو قومی نظریہ سیاست میں آیا تو اس کے نتیجہ میں تاریخ میں بھی فرقہ وارانہ خیالات آئے۔ تقسیم کے بعد پاکستان کے سیاستدانوں اور مورخوں کے لئے سب سے بڑا چیلنج یہ تھا کہ اس ملک کے وجود کو کیسے تاریخی طور پر درست اور جائز ثابت کیا جائے۔ اس لئے آئی۔ ایچ۔ قریشی، ایس۔ ایم۔ اکرام اور معین الحق نے دو قومی نظریہ کی بنیاد پر تاریخ کو لکھا۔ اس تاریخ نویسی میں مسلمان قوم کی شناخت اور تاریخ میں اس کو برقرار رکھنے کا سہرا علماء کے سر باندھا گیا جن میں شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ، اور سیّد احمد شہید قابلِ ذکر ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان میں آہستہ آہستہ علماء کا عروج شروع ہوا، کیونکہ تاریخ میں وہ مسلمانوں کے محافظ اور مذہب کو تحفظ دینے والے تھے، اس لئے علماء کے عروج کے ساتھ معاشرہ میں مذہب کا تسلط اور مذہبی فرقہ واریت کے جذبات پیدا ہوئے، جو موجودہ دور میں

اپنی پختگی کو پہنچ چکے ہیں۔

تاریخ نویسی کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ اسے شخصیتوں کے تناظر میں لکھا گیا ہے اور تبدیلی کی دوسری قوتوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں میں یہ تاثر پیدا ہو گیا کہ ملک وقوم کی تقدیر صرف شخصیت بدلتی ہے، اس لئے ملک میں جب بھی آمر آئے اور مارشل لاء کا نفاذ کیا، لوگوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ شخصیت پرستی کے ان جذبات اور اثرات کی وجہ سے جمہوری ادارے اور روایات کمزور رہیں۔

پاکستان کی تاریخ نویسی کو مسخ کرنے میں نظریہ پاکستان ہے، ابتدائی مورخوں نے جب تاریخ کو اس تناظر میں لکھا تو انہوں نے واقعات کا تجزیہ فرقہ وارانہ نقطہءنظر سے کیا۔ اس کا خاص طور سے اثر نصاب کی کتابوں پر ہوا، جن میں نظریہ کو جائز ثابت کرنے کی غرض سے تاریخی حقائق کو مسخ کر کے پیش کیا۔

لہٰذا پیشہ ورانہ مورخوں کی غیر موجودگی، ریاست کی جانب سے نظریہ اور ریاستی قوم پرستی پر زور، معاشرے کی تبدیلیوں کو نظر انداز کر کے تاریخ کو روایتی انداز میں پیش کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ معاشرے میں تاریخی شعور کی کمی ہے، اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مصنفوں نے ڈائجسٹوں، اخباروں اور رسالوں میں ایک ایسی فرضی اور رومانوی تاریخ کی داستانوں کو مقبول بنا دیا ہے کہ جن کا تعلق تاریخ سے نہیں ہے۔ جب یہ تاریخ لوگوں کے ذہن کو بنائے گی تو اس سے مسخ شدہ تاریخی شعور پیدا ہوگا جو لوگوں کو گمراہ کرے گا۔

اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے اس بات کی ضرورت ہے کہ روایتی تاریخ کو تبدیل کر کے اس مضمون میں جو نئی تبدیلیاں آئی ہیں انہیں شامل کیا جائے تاکہ یہ وقت کی ضرورت کو پورا کرے۔

بین الاقوامی تعلقات اور سماجی سائنس

ڈاکٹر مطاہر احمد

سماجی سائنس کے فلسفہ نے بین الاقوامی تعلقات کے ارتقاء اور اسی مضمون کو Academic Discipline بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

بین الاقوامی تعلقات کو سماجی سائنس کی فلسفیانہ بحثوں کو دو باہمی تعلق (inter related) سوالوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اوّل کیا بین الاقوامی تعلقات سائنس ہے یا آرٹس (Arts) ہے۔ دوئم بین الاقوامی سیاست کی سائنسی تحقیق کیسے ممکن ہو۔

ان دونوں سوالات کے جوابات کہ سائنس کیا ہے اور بین الاقوامی تعلقات کا تجزیہ کیسے کرتے ہیں، میں پنہاں ہے۔ ان سوالات کے جوابات ہمیں سائنس کے فلسفہ میں ملیں گے۔ مزید برآں فلسفیانہ سائنس کی بحثیں اس حوالے سے سمت متعین کر سکتی ہیں۔ سائنس کے فلسفہ پر اگر نظر دوڑائی جائے تو ہمیں posivitism کا اکثر بھرپور انداز میں نظر آتا ہے۔ Posivitism نے نہ صرف سائنس کے فلسفہ کی ہئیت پر اثر انداز ہوا بلکہ بین الاقوامی تعلقات کی theories پر بھی اثر ڈالا۔

مجموعی طور پر بین الاقوامی تعلقات کی بنیاد Positivist model of science کو سموتی ہوتی نظر آتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں General Acceptance موجود ہے۔ تاہم المیہ یہ ہے کہ p o s i v i s i t m کو فلسفیانہ سائنس نے مسترد کر دیا اور دوسری جانب اسی کے بین الاقوامی تعلقات پر اس کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

اس مسئلہ کے حوالے سے بین الاقوامی تعلقات اور سماجی سائنس کو تاریخ کے تناظر میں

جائزہ لینا ضروری ہوگا۔ اسی ضمن میں چار بنیادی بحثوں (debates) کا جائزہ لینا ضروری ہے تا کہ اسی کی روشنی میں اسی موضوع کا تجزیہ کرنا ممکن ہو۔

پہلی بحث (First Debate):

پہلی بحث بنیادی طور پر تاریخی تناظر میں سمجھی جاسکتی ہے۔ جس کا آغاز دوسری جنگ عظیم کے بعد ہوا۔ بین الاقوامی تعلقات کی بنیاد دراصل اسی دور میں رکھی گئی یہ جب دنیا دو قطبی نظاموں میں بٹی ہوئی تھی۔ دوسرے الفاظوں میں سرد جنگ کا دور شروع ہوا جس نے بین الاقوامی سیاست کو معاشی، سیاسی اور سماجی طور پر دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔

اس ضمن میں پہلی بحث کو خیالی اور حقیقی نقطہ نظر رکھنے والے گروہوں (Idealist and Realist School of Thought) میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ دونوں گروہ اسی بات پر بحث کر رہے تھے کہ بین الاقوامی ادارے جو ابھی ارتقاء کی منازل طے کر رہے تھے ان کا کردار کیا ہونا چاہیے۔

خیالی (idealist) اس بات پر زور دے رہے تھے کہ ایسے اداروں کا قیام عمل میں لایا جائے جو دنیا کو جنگ کی ہولنا کیوں اور تباہ کاریوں سے بچا سکے۔ اس نقطہ نظر کو رکھنے والے دانشور دراصل دوسری جنگ عظیم کو قریب سے دیکھ چکے تھے چنانچہ یہ ان کی فطری خواہش تھی کہ قیام امن کے لیے بین الاقوامی تنازعات کے خاتمہ کے لیے اخلاقیات کو مرکزی نکتہ سمجھتے تھے۔ اس ضمن میں وڈرو ولسن کے چودہ نکات قابل ذکر ہیں۔ خیالی (idealist) کی سوچ رکھنے والے عناصر لاعلمی (ignorance) کو بین الاقوامی تنازعات کو اولین وجہ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں بین الاقوامی حالات کی درست آگاہی (understanding) اور دلیل (reason) سے ہی بین الاقوامی نظام کو مضبوط بنایا جاسکتا ہے۔ اس سوچ کو فعال بنانے کے لیے سائنسی سوچ کو پروان چڑھانا ضروری تھا۔ اس پورے نقطہ نظر کا المیہ یہ تھا کہ سائنس کی واضح تشریح موجود نہ ہونے کے باوجود یہ علم کی بنیاد سائنس پر رکھنے کے حامی تھے۔ اس معاملے میں قصور ان کا بھی نہیں تھا کیونکہ فلسفہ سائنس خود اس وقت ارتقائی عمل سے گزر رہا تھا۔

دوسری جانب حقیقی (realist) سوچ رکھنے والے عناصر جی کے سرخیل مارگن تھاؤ اور ٹی ایچ

کار انسانی فطرت کو قوانین کی حیثیت دلانا چاہتے تھے۔ مزید برآں ریاستوں کے مفادات کو طاقت کے استعمال سے جوڑنا اور پیچیدہ معاملات کا آسان حل ڈھونڈنا شامل تھا۔ دوسرے لفظوں میں ریاستی مفادات کے حل طاقت کے استعمال میں تلاش کرنا اور justify کرنا اسی نظریہ کے ماننے والوں کے بنیادی اصول تھے۔

دوسری بحث (Second Debate):

دوسری بحث کا آغاز 60 کی دہائی میں شروع ہوا یہ وہ وقت تھا جب سائنسی فلسفہ ارتقاء منازل کافی حد تک طے کر چکا تھا اور بین الاقوامی سطح پر جڑیں پکڑ چکا تھا۔ اسی بحث کا مرکز Behaviourist انقلاب کا سماجی سائنس پر اثر تھا۔ اس نقطہ نظر کے سرخیل ڈیوڈ سنگر اور مارٹن کیپلون پیش پیش تھے۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ بین الاقوامی تعلقات کو شعوری طور پر فطری سائنس (Natural Science) سے جوڑا جا سکتا ہے۔ یہ گروہ positivism کی حمایت کرتا تھا اور اس کو سائنس کے متبادل سمجھتا تھا۔ تاہم posivist یہ سمجھتے تھے کہ سائنسی علم obsexable data کے ذریعے قوانین بنائے جا سکتے ہیں۔

تیسری بحث (Third Debate):

تیسری بحث کا آغاز ۷۰ اور ۸۰ کی دہائی میں شروع ہوا۔ اس ضمن میں ۶۰ کی دہائی کے (Methodological Issue) کے بجائے Interpradigm Debate کی بنیاد رکھی گئی۔ اس حوالے سے بین الاقوامی تعلقات کو سمجھنے کے لیے دوسرے نقطہ نظر ہی میں مارکسزم، پلورل ازم اور حقیقت پسندی (Marxism, Pluralism & Realism) کو شامل کیا گیا۔ اس کی ضرورت اس لیے بھی محسوس کی گئی کیونکہ اس دور میں بین الاقوامی سطح پر ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ Detternce کی جگہ Dentente لے رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ طاقت کی استعمال سے دہشت کا توازن وقتی طور پر تو قائم کیا جا سکتا ہے لیکن یہ پائیدار نہیں ہوتا۔ چنانچہ بین الاقوامی نظام کو سمجھنے میں مارکسزم اور pluralism کی جگہ کا بننا ایک فطری عمل تھا۔

چوتھی بحث (Fourth Debate):

چوتھی بحث کا آغاز ۸۰ کی دہائی میں ہوا۔اس بحث میں معاملات خواہ وہ بین الاقوامی سطح کے ہوں یا سماجی بحثیں ہوں۔ ان کو سمجھنا اور تشریح کرنا Positivism اور Post-Positivismاور Reflictionismاور Rationalism کے مابین تھی۔ اس بحث کی اہم بات یہ ہے کہ یہ علم کی بنیاد ان حقائق پر ہے جس کا تجربہ انسانی حواس (Human Senses) کو ہے۔

بعداز چوتھی بحث(Post-Fourth Debate)

یہ بحث بنیادی طور پر حالات حاضرہ سے متعلق ہے۔اس بحث میں اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے کہ آج بین الاقوامی تلقات جو سائنسی حوالے سے کیسے دیکھا جائے جس میں سائنس Realism کی بنیاد پر ہر مسئلہ کو چیلنج کیا جاسکتا ہو۔

یہ مختصر سا جائزہ ان بحثوں کے حوالے سے ہے جو بین الاقوامی تعلقات کے ارتقائی عمل سے گزرتی ہوئی زمانہ حاضر تک آتی ہیں۔ترقی یافتہ معاشروں میں سماجی علوم اور بین الاقوامی تعلقات کے حوالے سے بحث مباحثہ جاری ہیں۔

یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ پاکستان میں ان بحثوں کی گنجائش موجود ہے۔اس صورت حال کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ پاکستانی معاشرہ علمی اور فکری بحثوں سے دور ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ ترقی یافتہ ممالک میں ارتقاعی عمل رکا نہیں بلکہ تسلسل سے آگے بڑھ رہا ہے۔ تحقیقی عمل Academic Culture کی جڑیں دن بہ دن مضبوط ہو رہی ہیں۔ بدقسمتی سے پاکستان میں یہ روایات پیچھے کی طرف دھکیلی جارہی ہیں۔ بین الاقوامی تعلقات کے مضمون کو صرف طاقت یا قومی مفاد سے آگے نہیں دیکھا جاسکتا۔ جب کہ غیر روایتی سوچ جیسا کہ عوام کی سلامتی،سلامتی بہ تعاون (Cooperation Security) جیسے غیر روایتی معاملات پر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔مگر پاکستان میں یہ خال خال ہی نظر آتا ہے۔

اس کی بنیادی وجہ ریاست کی عدم دلچسپی اور معاشرہ عمومی طور پر غیر سائنسی توجیحات کا شکار

ہے۔سائنس ہی کی بنیاد تحقیق اور تجربہ پر ہے پاکستانی معاشرہ مذہب کو زندگی کے ہر شعبے پر فوقیت دیتا ہے جس کی وجہ سے سائنٹفک سوچ معاشرے سے مفقود ہوتی جارہی ہے۔سماجی علوم جس میں سرفہرست تاریخ،سماجیات اور فلسفے جیسے مضامین کو اہمیت نہیں دی جارہی ہے۔

چنانچہ بین الاقوامی تعلقات کو حالات حاضرہ(Current Affairs) سمجھا جانے لگا ہے۔بین الاقوامی تعلقات کا پیچیدہ تر معاملہ ہو اس پر ساست دان تبصرہ کرتے نظر آتے ہیں۔یہی وہ وجہ ہے کہ پاکستانIntellectual Poverty کا شکار نظر آتا ہے۔

سماجی علوم انسانی رویوں کے تجزیہ کا نام بھی ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ دانشور اہل علم معاشرے میں فکری سوچ سائنٹیفک بنیادوں پر کریں تاکہ معاشرے میں ایسی سوچ اُجاگر ہو جو حالاتِ حاضرہ کے پیچیدہ سے پیچیدہ معاملے کو ذہنی اور فکری سطح پر تجربات اور تحقیقی فہم سے حل کرنے کی کوشش کرے۔

References

1. Colin Wright, Philosophy of Social Science and International Relations, Hand Book of International Relations, 2001.
2. Mulja and Colin Wright, International Relations and Social Science, www.oxfordtextbooks.co.uk/orc/dunne2e.

عمرانیات اور پاکستان

ڈاکٹر ریاض احمد شیخ

تمام علوم انسانی ضروریات اور سماجی حالات کی ہی پیداوار ہوتے ہیں اور نئے تجربات اور گزرتے ہوئے لمحات کے ساتھ ان میں مزید وسعت آتی چلی جاتی ہے۔ انسان کے ابتدائی مشاہدات اور تجربات سے لے کر دور حاضر تک کی تمام تر ترقی کے نتیجے میں انسانی علم میں گہرائی آتی چلی گئی ہے جس کے نتیجے میں نئے علوم سامنے آتے رہے ہیں۔ ان ہی مضامین میں سے ایک اہم مضمون عمرانیات کا بھی ہے جسے عام طور پر سماجیات یا سوشیالوجی بھی کہا جاتا ہے۔

عمرانیات سماجی علوم کی وہ شاخ شمار کی جاتی ہے جو کہ دیگر سماجی علوم کے مقابلے میں کافی کم عمر ہے۔ اس کی تاریخ دوسو سال سے زیادہ پرانی نہیں لیکن اس کا نفس مضمون یقیناً اسی قدر پرانا ہے جتنا کہ انسان خود۔ کیونکہ عمرانیات معاشرے کے مطالعے کا نام ہے اور انسانی معاشرے کی تشکیل انسان کے ساتھ ہی ہوگئی تھی۔ معاشرے میں آنے والی تیز رفتار تبدیلیوں نے عمرانیات کی اہمیت میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے۔ قبل ازیں اسے فلسفے اور بعد ازاں نفسیات کا ایک حصہ تصور کیا جاتا رہا۔ لیکن گذشتہ صدی میں اس مضمون کی اہمیت میں گراں قدر اضافہ ہو چکا ہے۔ اب عالمی معیار کی تمام یونیورسٹیوں میں یہ مضمون پڑھایا جا رہا ہے۔

اس مضمون کے لیے ابتدائی کام ابن خلدون نے کیا۔ اس کی معرکتہ آراء کتاب ''مقدمہ'' کو عمرانیات کی اوّلین کتاب تصور کیا جاتا ہے۔ یقیناً خلدون کی یہ کتاب اس وقت کے معاشرے کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر تحریر کی گئی تھی۔ اس وقت عرب بڑی تیزی سے فتوحات کرتے چلے جا رہے تھے۔ ایک طرف وہ فلسطین تک پہنچ چکے تھے تو دوسری طرف شمالی افریقہ اور فارس کے

ساتھ ساتھ جنوبی یورپ بھی ان کی دسترس میں تھا۔ اس بڑھتی ہوئی سلطنت میں انہیں نت نئے معاشی اور معاشرتی مسائل کا سامنا تھا۔ ابن خلدون نے اس وقت کے مسلمان معاشرے کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا اور اس وقت کے تضادات کو اپنے مشاہدات سے سمجھتے ہوئے ان کی نہ صرف نشاندہی کی بلکہ ان کے حل کے لیے تجاویز وغیرہ بھی دیں۔

خلدون کے بعد ایک طویل عرصے تک کوئی دوسری بڑی کاوش سامنے نہ آ سکی۔ لیکن تیرہویں صدی کے اواخر میں ہونے والی تبدیلیوں نے انسانی معاشرے میں نئی تبدیلیاں لانا شروع کیں جس میں ایک طرف صلیبی جنگیں تھیں تو دوسری طرف وسطی ایشیا سے نکلنے والے جنگجو تھے جنہوں نے پہاڑوں سے اتر کر جنوبی ایشیا اور مشرق وسطی پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ چودہویں صدی میں سمندر کے راستے تجارت کے لیے کاوشیں شوع ہوئیں اور نئی دنیا کی تلاش دور دراز کے علاقوں کو قریب لانے میں مددگار ثابت ہوئی۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری کے ساتھ انسانی رشتوں کی نوعیت میں بھی تبدیلی آنے لگی۔ بعد ازاں نوآبادیات کے قائم ہونے کے بعد غلامی اور نسل پرستی کے مسائل نے بھی جنم لیا۔ انسانی استحصال اپنی بدترین شکل میں سامنے آیا۔ اس کے ساتھ ہی صنعتی انقلاب بھی انسانی معاشرے میں اہم تبدیلی کا باعث بنا۔

صنعتی انقلاب نے لوگوں کو اپنے جامد معاشروں سے نکل کر شہروں کی طرف نقل مکانی اور وہاں بدترین استحصالی نظام میں رہنے پر مجبور کیا۔ خاندانوں سے کٹ کر الگ رہنے والے محنت کش اپنی ضروریات پورا کرنے کے لیے بدترین تجربات سے گزرے۔ استحصال کا عمل مزید بدتر ہوا۔ اسی طرح سائنس کی ترقی نے مذہبی توہمات کو چیلنج کرنا شروع کیا۔ روشن خیالی کی تحریک نے اس عمل کو مزید تیز تر کر دیا۔ انقلاب فرانس جیسے واقعات نے معاشرے کے پسے ہوئے افراد کو اپنی اہمیت کے متعلق آگہی فراہم کی اور انہیں یہ اندازہ ہوا کہ وہ معاشرے کے استحصالی نظام کو متحد ہو کر شکست و ریخت سے دوچار کر سکتے ہیں۔ بعد ازاں نوآبادیاتی حکومتوں کے خلاف شروع ہونے والی جدوجہد اور عالمی جنگوں نے انسانی معاشرے پر بڑے گہرے اثرات ڈالے اور لوگوں کو نئے تجربات سے گزرنا پڑا جنہوں نے عمرانیات کو موجودہ شکل میں لانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

جہاں ایک طرف یہ واقعات اور تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں تو دوسری طرف کئی دانشور اور

فلسفی اپنی تحریروں کے ساتھ سامنے آئے۔ جن کی تحریروں نے معاشروں میں تبدیلی کے عمل کو آگے بڑھایا۔ ان میں روسو، اور والٹیئر کے نام شامل ہیں۔ روسو نے سماجی تقسیم کی طرف نشاندہی کی اور بتایا کہ انسان آزاد پیدا ہوا تھا لیکن اب زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اسی طرح فرانس کا ایک اور دانشور سینٹ سائمن بڑا اہم کردار تھا جس نے انقلاب فرانس کو قریب سے دیکھتے ہوئے اپنے تجربات رقم کیے۔ چارلس پال نے انگلینڈ میں آنے والی صنعتی تبدیلیوں کا جائزہ لیا۔ جرمن آئیڈیالوجی کے نقطہ نظر سے تعلق رکھنے والے دانشوروں، ایموئل کانٹ، جارج ہیگل، بڑے اہم تصور کیے گئے۔ ان کے خیالات نے بعد ازاں مارکس پر گہرے اثرات ڈالے۔ جہاں ایک طرف مارکس نے ان سے استفادہ کیا وہیں دوسری طرف اس نے ان پر بھرپور تنقید بھی کی۔ فائر باخ بھی اسی سلسلے کی ایک اور کڑی تھا۔ نوجوان ہیگلین نے بھی اس سلسلے کو مزید آگے بڑھایا۔ اب تک یہ تمام تر کاوشیں براہ راست عمرانیات سے تعلق تو نہ رکھتی تھیں لیکن ان کا گہرا اثر انسانی سماج اور سماجی رشتوں سے اس لیے بن جاتا ہے کیونکہ یہ مفکر معاشرے کے بنیادی مسائل کے متعلق بات کر رہے تھے۔ اقتصادی ناہمواریوں کو ختم کر کے معاشرے میں استحصالی نظام کے خاتمے اور انسانی عظمت کا ذکر کر رہے تھے۔ معاشرے کو روشن خیالی کی طرف لے جانے کی کوششیں کر رہے تھے۔

جدید تاریخ میں آگست کومٹ کو جدید عمرانیات کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ کومٹ انقلاب فرانس کے بعد کی صورت حال سے بڑی حد تک پریشان تھا۔ اس بورژوا دانشور کے لیے یہ بات سمجھنا مشکل تھی کے کیوں معاشرے کے استحصالی طبقات کے وسائل میں عام شہری کو بھی برابری کا حق دیا جائے۔ وہ انقلابی تبدیلیوں کے سخت خلاف تھا اور اس کے خیال میں معاشرے کے موجودہ ڈھانچے کو اسی صورت میں برقرار رکھنے کی ضرورت ہے۔ کومٹ کے خیالات کو بورژوا اور سرمایہ دارانہ نظام کے حمایتیوں میں بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد بورژوا عمرانی خیالات میں ایک اور نام ہربرٹ اسپنسر کا ہے۔ اسپنسر کا نظریہ ارتقاء ایک سائنسی ترقی تھی۔ اس کے نظریات ڈارون کے خیالات سے بڑی حد تک مماثلت رکھتے تھے۔ اسپنسر نے ڈارون کے نظریات کلی طور پر متفق ہونے کے بعد یہ بات کہی کہ ان خیالات کو سماجی طور پر بھی نافذ العمل کیا جانا چاہیے۔

کارل مارکس نے نظریہ ارتقاء کو ایک سائنسی ترقی تصور کرتے ہوئے اس کی توصیف تو کی

لیکن اس بات سے کلی طور پر اتفاق نہ کیا کہ معاشرے میں صرف طاقتور کو ہی جینے کا حق دیا جائے۔ مارکس کا خیال تھا کہ اس قسم کے نظریات انفرادی بورژوازی اور استحصالی نظام کو مزید مستحکم کرنے کا باعث بنیں گے۔ اسپنسر سوشلزم کا شدید مخالف تھا اور اس کا ذکر اس نے اپنی کتاب The Coming Slavery میں بڑا کھل کر کیا ہے یہ کتاب ۱۸۸۴ء کو منظر عام پر آئی۔ حیرت انگیز طور پر یہ اسپنسر نے اشتراکیت کے نظام کی بحالی اور نجی ملکیت کے خاتمے کو غلامی کی بحالی سے تصور کیا۔ اس کے ان خیالات سے اسپنسر کے بورژوازی اور طبقاتی نظام پر اعتماد کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

کارل مارکس نے طبقاتی سماجی تقسیم کی بڑی شدت سے مخالفت کرتے ہوئے تھامس مور کی یوٹوپیا کو عملی طور پر ایک اشتراکی نظام کی صورت میں نافذ کرنے کا ایک باقاعدہ سائنٹیفک نظریہ پیش کیا۔ اینگلز اور مارکس نے سائنسی بنیادوں پر معاشرے کے اندر اُٹھنے والے تضادات کو معاشی بنیادوں پر جانچنے کی بات کی۔ مارکس نے استحصالی نظام کو برقرار رکھنے کے بجائے اسے اشتراکی نظام سے بدلنے کا تصور پیش کیا۔ مارکس نے جہاں معاشرے میں اقتصادیات کو تضاد کی بنیاد قرار دیا تو مارکس کے بعد میکس ویبر نے اس میں ترمیم کی بات کی۔ جرمنی کا یہ ماہر معاشی رشتے کے ساتھ ساتھ سماجی رتبے (social status) کا بھی قائل تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سماجی رتبے کے لیے تضادات کو بھی اتنی ہی اہمیت دی جانی چاہیے جتنی کہ معاشی تضادات کو۔ ویبر نے مارکس کی مذہب پر تنقید کو بالائے طاق رکھتے ہوئے معاشی اور معاشرتی ترقی میں مذہب کے کردار پر بات کی۔ اس کے خیال میں یورپ میں پروٹسٹنٹ مسیحیت نے رومن کیتھولک چرچ کے خیالات سے انحراف کر کے ایک نئے معاشی نظام قائم کرنے کی بات کی اور اس کے ذریعے ان علاقوں میں جہاں پروٹسٹنٹ مسیحیت آئی وہاں نسبتاً زیادہ ترقی اور روشن خیالی دیکھنے کو ملی۔

عمرانیات میں زیر بحث لائے جانے والے موضوعات:

چونکہ عمرانیات معاشرے اور گروہوں کے تعلقات کے مطالعے کا بھی نام ہے۔ اس لیے عمرانیات ان تمام موضوعات کو اپنے دائرہ اثر میں شامل کرتی ہے جو کہ فرد اور گروہ کی روزمرہ زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ عمرانیات کے زیر مطالعہ عنوانات میں ثقافت، معاشرہ، سماجی تعلقات،

سماجی رویےاور منحرف سماجی رویئے Deviant social behaviour سماجی درجہ بندی، نسل اور لسانی امور، آبادیات، شہری اور دیہی آبادیاں، مشترکہ رویئے اور سماجی تحریکیں، سماجی ترقی و تبدیلی، روایتی جدید اور مابعد الجدید معاشرے، تیز رفتار ترقی ٹیکنالوجی اور سماجی تبدیلی جیسے امور شامل ہیں۔ یہ تمام موضوعات اپنی جگہ پر بڑی ہی اہمیت کے حامل ہیں اور ماہرین عمرانیات ان امور کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لے کر ان کو بہتر طریقے سے حل کرنے کے لیے تجاویز مرتب کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ عمرانیات کا ایک اہم موضوع سماجی ادارے (Social Institutions) کا مطالعہ بھی ہے۔ اس عنوان کے تحت پانچ بڑے ہی بنیادی قسم کے اداروں مثلاً خاندان، تعلیم، مذہب، معیشت، ریاست وحکومت وغیرہ شامل ہیں۔ یہ پانچوں سماجی ادارے اپنی جگہ پر بڑی ہی اہمیت کے حامل ہیں اور یہ کسی بھی فرد کی زندگی میں (جو کہ آخر کار ایک وسیع سماجی گروہ کا ایک حصہ ہوتا ہے) بڑا ہی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ ان تمام عنوانات اور موضوعات کو تینوں عمرانی نقطہ نظر اپنے نظریے کے تحت بیان کرتے ہیں۔ مثلاً مارکس اور اینگلز نے اپنی تحقیق کے نتیجے میں یہ بات ثابت کی کہ خاندان، ریاست اور مذہب جیسے اداروں کا ابتدائی انسانی معاشروں میں کوئی ذکر نہیں ملتا اور یہ گزشتہ پانچ ہزار برس کے دوران ہی یہ ہوا کہ یہ ادارے وجود میں آئے اور ان کے نتیجے میں انسانی معاشرے اور سماجی تعلقات میں بڑا گہرا فرق نظر آیا۔ خاندانوں کے ساتھ ہی نجی جائیداد کا تصور دیکھنے کو ملا جبکہ اس سے قبل تمام وسائل پوری انسانیت کے لیے یکساں ہی تھے۔ اسی طرح مذہب میں بھی انسان ابتدا سے ہی منسلک نہ تھا بلکہ یہ زرعی دور میں انسان کے زیر اثر آیا۔ اسی طرح مارکس اقتصادیات میں اضافی قدر (Surplus value) کو بنیاد بنا کر پورے بورژوا اقتصادی نظام کو استحصال کا ایک اہم ذریعہ ثابت کرتا ہے۔ طبقاتی معاشروں کا تعلیمی نظام بھی معاشرے کے تمام افراد کو یکساں تعلیم و تربیت کے مواقع فراہم نہیں کرتا بلکہ وہ اس استحصالی نظام کی جکڑ بندیوں کو مزید مضبوط و مستحکم کرنے کا باعث بنتا ہے۔ جبکہ مارکس نقطہ نظر کے برعکس دیگر عمرانی نظریات معاشرے کی اس تقسیم کو خود انسانوں اور انسانی معاشرے کے لیے بڑی مفید اور کارآمد کردار گردانتے ہوئے اس کی حمایت کرتے ہیں ان کے خیال میں انسانی معاشرے کی مختلف طبقات میں تقسیم دراصل ان لوگوں میں مقابلے کا رجحان پیدا کرتی ہے اور یہ صورتحال معاشرے کی ترقی کے لیے بڑی ہی مفید ہے۔

پاکستان میں عمرانیات کی صورتحال:

برصغیر کی آزادی اور تقسیم سے قبل عمرانیات کو بحیثیت ایک اختیاری مضمون کے متحدہ ہندوستان کی کئی درس گاہوں میں متعارف کرادیا گیا تھا۔ قیام پاکستان کے آٹھ برس بعد ۱۹۵۵ء میں پنجاب یونیورسٹی نے پہلی مرتبہ عمرانیات میں بی اے کی ڈگری پروگرام شروع کیا۔ اگر اس وقت کے عمرانیات کا نصاب اور ڈگری کے لیے لکھے جانے والے مقالات کا ایک طائرانہ جائزہ لیا جائے تو اس وقت ایسے موضوعات پر تحقیق کی گئی جن کا تعلق ہمارے ملک، اس کی ثقافت، اور روایات سے دور دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ مثلاً خواتین میں جرائم کی بڑھتی ہوئی شرح، والدین کا بچوں کو وقت نہ دینا، کام کرنے والی ماؤں کے مسائل، علیحدگی (طلاق) حاصل کرنے والے خاندانوں کے مسائل جیسے عنوانات تحقیق کے لیے منتخب کیے گئے۔ پاکستان جیسے پسماندہ معاشرے میں ۱۹۵۰ء کی دہائی میں یہ موضوعات بالکل غیر متعلق تھے۔ ان موضوعات پر شاید اب کام ہو تو کسی حد تک اس کی افادیت پر بات کی جاسکتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ کام امریکی امداد اور اس کی ایماء پر کیے جارہے تھے اس لیے ایسے موضوعات منتخب کیے گئے جو کہ امریکی معاشرے کی ضروریات سے مطابقت رکھتے تھے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت عمرانیات کے بیشتر ڈیپارٹمنٹ بیرونی امداد اور خصوصاً یو ایس ایڈ (US Aid) پروگرام کے تحت قائم کیے جارہے تھے۔ اس لیے جن موضوعات پر تحقیق کی جارہی تھی وہ بھی ایسے ہی موضوعات پر مشتمل تھی جو کہ پاکستان کے بجائے امداد دینے والے ممالک کی ضروریات کے لیے تھا۔ اس کی دوسری وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اس دوران اساتذہ کو فل برائٹ اور یونیسکو پروجیکٹس کے تحت مختصر مدت کے لیے امریکی دورے بھی کرائے گئے اور ان لوگوں کو امریکی پروفیسروں نے اپنے ماحول سے مطابقت رکھنے والی تربیت فراہم کی۔ اسی قسم کا نصاب بڑے طویل عرصے تک پاکستان کی کئی جامعات میں نافذ رہا۔

جبکہ دوسری طرف چند نامور ماہرین عمرانیات نے اپنی انفرادی کاوشوں سے عمرانیات کے شعبے میں اپنے تحقیقی کام کو جاری رکھا اور پاکستان کے مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی تحقیق جاری رکھی، اور بڑے عمدہ تحقیقی مقالے لکھے۔ ان میں حسن گردیزی، حمزہ علوی، صغیر احمد، اور ڈاکٹر فیروز

احمد جیسے لوگ شامل ہیں۔ پاکستان جو کہ بنیادی طور پر ایک زرعی ملک تھا اور سبز انقلاب کے ذریعے ملک میں زرعی انقلاب لانے کی کوشش کی گئی اور حکومت نے اس کوشش کی کامیابی کے لیے بھرپور پروپیگنڈا ابھی جاری رکھا لیکن حمزہ علوی نے اپنے تحقیقی مقالے کے ذریعے سبز انقلاب کی حقیقت عیاں کردی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ نام نہاد انقلاب کسی بھی طرح عام کسان اور کاشتکار کے لیے سودمند نہیں بلکہ اس کے باعث امیر کاشتکاروں کو بھرپور فائدہ حاصل ہوا۔

۱۹۶۳ء میں پاکستان عمرانی ایسوسی ایشن قائم کی گئی اور اس کا پہلا اجلاس ڈھاکہ یونیورسٹی میں منعقد کیا گیا۔ اس ایسوسی ایشن کا مقصد یہ تھا کہ ماہرین عمرانیات اور ان سے ملحقہ دیگر سماجی علوم کے ماہرین کو ایک جگہ پر اکٹھا کیا جائے اور اس کے نتیجے میں سماجی مسائل پر تحقیق کے کاموں کو آگے بڑھایا جائے۔ یہ ایسوسی ایشن کچھ عرصے تک تو کام کرتی رہی لیکن پھر غیر فعال ہوگئی اور کوئی خاص کام نہ ہوسکا۔ لیکن دیگر کئی شعبوں اور خصوصاً اقتصادیات سے تعلق رکھنے والے ماہرین نے کئی ایسے موضوعات پر کام کیا جس کا ان کے اپنے شعبوں کے ساتھ ساتھ براہ راست تعلق عمرانیات اور سماجیات سے بھی تھا۔ ان میں اہم نام ڈاکٹر ایس ایم نسیم، ڈاکٹر محمود الحسن اور ڈاکٹر اکبر زیدی جیسے لوگ شامل ہیں۔ ایس ایم نسیم نے غربت اور اس کے اقتصادی وسماجی پہلوؤں سے بڑا گرانقدر کام کیا جبکہ ڈاکٹر محمود الحسن نے زرعی معیشت اور خاص طور پر زرعی اصلاحات اور ان کے کسانوں کو پہنچنے والے اثرات کا جائزہ لیا تھا۔ ڈاکٹر محمود کے مطابق زرعی اصلاحات کا بے زمین کسانوں کو برائے نام ہی فائدہ پہنچا اور زرعی اصلاحات کے نام پر ایسی اراضی کسانوں کے حوالے کی گئی جس میں سے اکثر و بیشتر ناقابل کاشت تھی اور بے زمین کسانوں کے پاس کوئی وسائل نہ ہونے کے باعث وہ اس غیر آباد زمین کو آباد کرنے کے لیے کوئی کام نہ کر سکے۔

اسی طرح بعد ازاں خواتین کے مسائل جو کہ جنرل ضیاء الحق کی اسلامائزیشن کے عمل کے باعث مزید بڑھ گئے ان موضوعات پر بھی کئی لوگوں کے کام سامنے آئے جن میں حمزہ علوی کے علاوہ دیگر لکھنے والی خود خواتین ہی تھیں جن میں صبیح حفیظ، ممتاز خاور، فریدہ شہید، اور فوزیہ گردیزی کے کام کئی لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے خواتین کے مسائل، سماج میں ان کا گرتا ہوا مقام اور جنرل ضیاء الحق کی طرف سے نافذ کیے گئے قوانین کے باعث ان کے لیے پیدا ہونے

والے اضافی مسائل کو زیر بحث لائے۔ اسی طرح پاکستان جو کہ حقیقی معنوں میں ایک کثیر السانی قوم ہے اور مختلف لسانی اکائیاں یہاں رہائش پذیر ہیں ان کے مسائل پر کچھ لوگوں نے کام کیا۔ ان میں ڈاکٹر فیروز احمد کا کام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

HEC اور عمرانیات کے دورانیے میں تبدیلی:

سال ۲۰۰۳ء تک عمرانیات کا دورانیہ دیگر سماجی علوم کی طرح دو سال بی اے اور دو ایم اے پر محیط تھا لیکن ہائر ایجوکیشن کے بننے کے بعد ۲۰۰۳ء میں جہاں دیگر شعبوں کے دورانیے میں اضافہ اور تبدیلی کی گئی اسی طرح عمرانیات بھی اسی فیصلے کے زیر اثر آیا۔ ایچ ای سی (HEC) نے انڈر گریجویٹ کا دورانیہ دو سال سے بڑھا کر چار سال کر دیا جس کے اختتام پر طلبہ براہ راست ایم فِل میں داخلے کے مجاز ٹھہرے۔ اسی طرح ایچ ای سی (HEC) نے مختلف جامعات میں پڑھائے جانے والے نصاب کو بھی باقاعدہ بنانے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی جس میں ایچ ای سی (HEC) کے نمائندوں کے علاوہ دیگر جامعات کو بھی نمائندگی دی گئی اور اس کے نتیجے میں ایچ ای سی نے عمرانیات کا ایک باقاعدہ نصاب ترتیب دیا۔ اگر اسی نصاب کا ایک جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ اس میں یقیناً کئی اچھی چیزیں شامل کی گئیں ہیں لیکن اس کے باوجود اس میں مزید ابھی بہت کام کرنے کی گنجائش ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس انتہائی ضروری کام کو سرانجام دینے کے لیے کن لوگوں کا انتخاب کیا گیا ہے؟ ان ماہرین کو عام لوگوں اور معاشرے کے پسے ہوئے طبقات کے مسائل کے بارے میں کتنی آگہی ہے؟ کیا یہ ماہرین پاکستان جیسے معاشرے کے بارے میں جو کہ ایک طرف دیہی اور شہری بنیادوں پر تقسیم ہے تو دوسری طرف لسانی اور فرقہ ورانہ بنیادوں پر تقسیم کا شکار بھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ماہرین ان مسائل سے پوری طرح آگاہ ہیں؟

اگر ایچ ای سی (HEC) سے منظور شدہ اور حاضر وقت میں رائج نصاب کا ایک طائرانہ جائزہ لیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ یہ نصاب کئی نقائص کا شکار ہے اور دوسرا یہ کہ پڑھائے جانے والے موضوعات میں پاکستان کے مقامی حالات کے متعلق کوئی خاص آگہی اور شعور فراہم نہیں کیا گیا ہے لیکن بیشتر جگہوں پر پھر وہی مغربی مثالوں کو استعمال کرتے ہوئے بات

بیان کی گئی ہے جس کا اس ملک کے حالات سے بہت کم واسطہ اور تعلق ہے۔ مثلاً ایک مضمون جو کہ شہری عمرانیات کے متعلق ہے اور جہاں شہری مسائل کا ذکر ہے وہاں شکاگو اور برازیل کے معاملات کا ذکر تو ملے گا لیکن جنوبی ایشیا اور خود پاکستان میں اس موضوع پر ہونے والی تحقیق کا کوئی ذکر نہیں۔ مثلاً شہری علاقوں میں رہائش اور نکاسی آب اور صفائی ستھرائی ایک بڑا ہی پیچیدہ مسئلہ ہے۔ ان مسائل پر پاکستان کے اندر کئی افراد اور اداروں نے بڑا زبردست کام کیا ہے جو کہ نہ صرف پاکستان میں بڑی کامیابی سے آگے بڑھا ہے بلکہ ان کو دنیا کے کئی دیگر ممالک میں بھی مثال کے طور پر اپنایا گیا ہے۔ ان کارآمد منصوبوں نے حکومت کی طرف عدم توجہی کے باوجود شہروں میں غربت کی لکیر سے نیچے رہنے والے افراد کو باعزت رہائش اور روزگار کے طریقے مہیا کیے ہیں۔ ایسے افراد میں ڈاکٹر اختر حمید خان، تسنیم احمد صدیقی، عارف حسن جیسے لوگ جانے پہچانے کردار ہیں۔ لیکن ان کتب میں ان جیسے افراد کا یا تو سرے سے کوئی تذکرہ ہی نہیں ہے یا پھر انتہائی سرسری ذکر کیا گیا ہے جو کہ بالکل ناکافی ہے۔ اسی طرح اس میدان میں کام کرنے والے اداروں مثلاً اورنگی پائلٹ پروجیکٹ، اربن ریسورس سینٹر، سائبان اور خدا کی بستی جیسے منصوبوں پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اورنگی پائلٹ پروجیکٹ نے ڈاکٹر اختر حمید خان کی رہنمائی میں نہ صرف رہائش اور نکاسی کے مسائل کا حل نکالا بلکہ انہوں نے غریب طبقے کے افراد کے لیے ارزاں اقساط پر قرض فراہم کرنے کا بھی انتظام کیا۔ ڈاکٹر صاحب کے اسی کام کو بنیاد بنا کر بعد ازاں پروفیسر محمد یونس نے بنگلہ دیش میں گرامین بنک قائم کیا۔ جس کا اصل ہدف غریب لوگوں کو مالی مدد فراہم کرنا ہے۔ بدقسمتی سے عمرانیات کے موجودہ نصاب میں ایسے موضوعات پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

پاکستان کے معاشرے کا ایک بڑھتا ہوا مسئلہ مذہبی انتہا پسندی اور عدم برداشت ہے۔ عمرانیات کا مضمون ان مسائل کو حل کرنے کے لیے سب سے بہترین موقع فراہم کرتا ہے۔ روشن خیالی اور خرد افروزی کے عنوانات کو نصاب میں شامل کر کے شدت پسندی جیسے مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ریاستی سطح پر ان امور کی طرف یا تو جان بوجھ کر توجہ نہیں دی جارہی یا پھر انہیں دانستہ طور پر نظرانداز کیا جارہا ہے۔ جس کے نتائج ہم آج بھی بھگت رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسا نصاب ترتیب دیا جائے جو کہ نفرت اور عدم برداشت کے

جذبات کو پھیلانے کے بجائے معاشرے میں رواداری کو جنم دے۔ غیر مسلم پاکستانیوں کے لیے اس نصاب میں کوئی گنجائش نہیں۔ ان غیر مسلم شہریوں نے بھی پاکستان کی ترقی میں اسی قدر کردار ادا کیا ہے جتنا کہ مسلمان اکثریت نے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی خدمات کا کوئی خاص ذکر نہیں۔ مثلاً ہمارے مسیحی کمیونٹی نے تعلیم اور صحت کے شعبوں میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ملک کے اکثر و بیشتر شہروں اور قصبوں میں ۱۹۴۷ء سے بہت قبل ہی اعلیٰ تعلیم کے بہترین ادارے مسیحی بھائیوں نے قائم کیے لیکن ان کا اس نصاب میں کوئی ذکر نہیں۔ اسی طرح ملک کے اکثر شہروں میں کئی نامور ہسپتال بھی ان ہی لوگوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں اور آج بھی نرسنگ اور دیگر کئی شعبوں میں ہمارے مسیحی بھائی بڑی مستعدی سے کام سرانجام دے رہے ہیں۔ لیکن ان کی تمام تر کاوشوں کو تقریباً کلی طور پر نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ جس کے باعث ہمارے مذہبی انتہا پسند ان کے خلاف بڑی آسانی سے نفرت اور حقارت کے خیالات پھیلاتے رہتے ہیں اور اکثر و بیشتر ان کی رہائشی کالونیوں کو جلا دیا جاتا ہے اور ان کے گھروں کو لوٹ لیا جاتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان غیر مسلم پاکستانیوں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو برابری کی سطح پر عزت دی جائے۔ اسی طرح ہندو کمیونٹی بھی ایک عرصے سے عدم تحفظ کا شکار چلی آ رہی ہے۔ جہاں دیگر نصاب کی کتب میں اس کمیونٹی کے خلاف بغض سے بھری ہوئی ہے اسی طرح عمرانیات کا نصاب بھی ہندوؤں کے کردار کو بڑے منفی انداز میں پیش کرتا ہے۔ انہیں سازشی اور ملک دشمن تصور کیا جاتا ہے حالانکہ ان کا کردار اس ملک کی ترقی میں برابر کا ہی رہا ہے۔ اس کمیونٹی کی اکثر لڑکیوں کو زبردستی تبدیلی مذہب کے بعد والدین سے جدا کر دیا جاتا ہے لیکن ہمارے عمرانیات کے نصاب میں ان رویوں کے خلاف کوئی بات نہیں کی جاتی۔ اس کے علاوہ دیگر چھوٹے مذہبی گروہوں کے متعلق بھی مثبت خیالات شاید ہی نظر آئیں۔ مثلاً پارسی کمیونٹی نے فلم تھیٹر اور ثقافتی تقریبات میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا ہے لیکن ہمیں ان کی خدمات کے متعلق بھی کوئی خاص کام دیکھنے کو نہیں ملتا۔ اس بات کی شدت سے ضرورت ہے کہ ہم اپنے نصاب میں اس مذہبی اور گروہی ہم آہنگی کے لیے ضروری تبدیلیاں لائیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ پاکستان ایک کثیر القومی ملک ہے جس میں مختلف لسانی گروہ اور مختلف قومیت رہائش پذیر ہیں لیکن بدقسمتی سے ہم نے ان قومیتوں کے وجود کو تسلیم کرنے کے

بجائے ہم دوقومی نظریے کے اصول کے تحت ان کے وجود کے ہی انکاری رہے ہیں۔اس کا نتیجہ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور بنگلہ دیش کی صورت میں سامنے آیا۔یہی مسائل اب دیگر صوبوں کی قومیتوں اور خصوصاً بلوچوں میں بڑی شدت سے اُبھر کر سامنے آئے لیکن ہمارے عمرانیات کے نصاب میں ان اہم مسائل کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ پاکستان جیسے ملک کے لیے ضروری ہے کہ اپنے لوگوں کو اس منفرد صورتحال کے متعلق ضروری معلومات فراہم کرے تا کہ لوگ ان مسائل کی حقیقت سے نہ صرف آ گاہ ہوں بلکہ ان کو مثبت انداز میں حل کرنے کی طرف عملی اقدامات بھی کیے جاسکیں۔

اسی طرح خواتین کے خلاف معاشرے میں تشدد کے رجحانات کی آ گہی بھی ہمارے عمرانیات کے نصاب کا لازمی حصہ ہونا چاہیے جو کہ اب تک نہیں ہے۔عزت کے نام پر قتل، زبردستی اور کم عمری کی شادیاں، وٹے سٹے اور ادلے بدلے کے عوض دیئے جانے کی روایات ہمارے معاشرے کی جیتی جاگتی حقیقتیں ہیں۔ جرگے کے فیصلوں پر ہونے والی زیادتیاں طالب علموں کے سامنے نہیں لائی جاتیں۔مختاراں مائی کا کیس ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہونا چاہیے اور ایسے واقعات کو ان میں شامل کیا جانا چاہیے لیکن ہم ان موضوعات کو عمرانیات کے نصاب سے غائب پاتے ہیں۔ ماں کی صحت اور بچیوں کی تعلیم وہ موضوعات ہیں جن پر عمرانیات کے نصاب میں کھل کر بات ہونی چاہیے۔آبادی کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے باعث خاندانی منصوبہ بندی کے اہم ترین مضمون کو بھی عمرانیات کے نصاب کا حصہ ہونا چاہیے لیکن یہ اب تک نہیں ہے۔کم بچوں کی اہمیت چھوٹے کنبے کی افادیت پر ضروری دلائل دیئے جانے چاہئیں۔

پاکستان جیسے معاشرے میں جہاں آزادی اظہار کی کمی ہے وہاں جمہوریت اور روشن خیالی کی بڑی شدت سے ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ ہمارے جیسے ملک میں جہاں بڑے تواتر کے ساتھ فوجی طالا آزماؤں نے کئی بار جمہوری حکومتوں کا خاتمہ کر کے فوجی حکمرانی قائم کی اور عوام کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا لیکن کئی مواقعوں پر عوام کی طرف سے مزاحمت دیکھنے کو ملی اور کبھی کبھار کوئی خاص ردِعمل سامنے نہیں آیا۔ ہماری عمرانی کتب میں جمہوریت، اور جمہوری رویوں کی پاسداری کے لیے کسی قسم کی کوئی تعلیم فراہم نہیں کی جاتی ہے۔حالانکہ عمرانیات میں جہاں سماجی اداروں کی اہمیت

اورافادیت کی بات کی گئی ہے وہاں جمہوریت اور جمہوری رویوں کی بھرپور انداز میں تائید وحمایت کی جانی چاہیے۔اسی کے ساتھ قانون کی حکمرانی اور قانون کے بلاتفریق نفاذ کے لیے ملک کے تمام شہریوں پر یکساں لاگو کیے جانے کی بات بھی ہونی چاہیے۔ملک میں موجود جاگیردارانہ اور وی آئی پی کلچر کے خلاف عوامی شعور کی بیداری میں عمرانیات کا بنیادی کردار ہے۔طبقاتی تعلیم کا خاتمہ کرکے معاشرے کے ہر شخص کو آگے بڑھنے کے یکساں مواقع فراہم کیے جانے چاہئیں۔ پاکستان جیسے معاشرے میں جو روز بروز مزید تضادات کا شکار ہوتا چلا جارہا ہے جہاں رجعت پسندی، عدم برداشت، اور لاقانونیت تیزی سے پروان چڑھتی ہوئی نظر آرہی ہے۔ان مسائل کو سمجھنے کے لیے عمرانیات کی اہمیت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا۔پاکستان میں جہاں غربت اور یگر سماجی ناہمواریوں اور ریاست کے عام شہری کی فلاح میں کسی قسم کی دلچسپی نہ لینے کے باعث جو جرائم اور سماجی بے چینی کی صورت حال جنم لے رہی ہیں اس کے اسباب کا جائزہ لینے اور اس کا سدباب کرنے میں بھی عمرانیات ایک کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔اس کی ایک عمدہ مثال امریکہ میں عمرانیات کے شکاگو نقطہ نظر (Chicago School of Thouhgt) کا سامنے آنا ہے۔اس کے تحت امریکہ کے تیزی سے ترقی کرتے ہوئے شہری علاقوں میں سامنے آنے والے مسائل پر تحقیق کی گئی اور پھر اس تحقیق کے نتیجے میں سامنے آنے والے معاملات پر بحث وتمحیص کا آغاز کیا گیا اور پھر سفارشات مرتب کرکے ان پر عمل درآمد ہوا۔جس کے باعث شکاگو اور دیگر شہروں کے مسائل کا بڑی کامیابی سے سامنا کیا جاسکا۔بدقسمتی سے ہمارے ملک کے ماہرین عمرانیات کو نہ صرف نصابی سطح پر اس طرح کے کاموں کے لیے تعلیم فراہم کی جارہی ہے اور نہ ہی ان کے عملی کام کی کوئی فراہمی کی جارہی ہے۔ان تمام کمزوریوں کے باعث عمرانیات کا جو کہ انتہائی اہم مضمون ہے بلکہ کارل مارکس نے لکھا ہے کہ عمرانیات اس کا پسندیدہ ترین مضمون ہے۔وہ اپنی افادیت کھوتا چلا جارہا ہے۔عمرانیات ایک عملی مضمون ہے جس کی نہ صرف تعلیم حاصل کی جاتی ہے بلکہ اس کو معاشرے کی ضرورت سے جوڑا جاتا ہے۔اور مسائل کے حل کے لیے عملی اقدامات اٹھائے جاتے ہیں۔اس لیے اس کی بڑی شدت سے ضرورت ہے کہ پاکستان میں عمرانیات کے مضمون کی اہمیت کو سمجھا جائے اور اسے پاکستان کے معاشرے کے مسائل کے لیے حل کے لیے بھرپور استفادہ کیا جائے۔

حوالہ جات:

Feroz Hmed, Ethnicity, Oxford University Press.

Hamza Alavi, Nationhood and Nationalities in Pakistan, Economic and Political Weekly, Vol. 24, No. 27 (Jul. 8, 1989) (pp. 1527-1534).

Hamza Alavi, Pakistani Women in a Changing Society, Economic and Political Weekly, Vol. 23, No. 26 (Jun. 25, 1988) (pp. 1328-1330).

Hasan Gardezi, Contemporary Sociology in Pakistan, in International Handbook of Contemporary Developments in Sociology, edited by Raj P. Mohan and Arthur S. Wilke. Greenwood Press, Connecticut, 1994.

John Macionis, Sociology Stued, Prentice Hall, New Jercy.

S. Akbar Zaidi (ed), Social Sciences in Pakistan in 1990, CSSP, Islamabad.

Tom Bottomore, Marxist Sociology, The Macmillan Press Ltd, Essex, 1979.

پاکستان میں فن تعمیر کی تاریخ کیسے پڑھائی جائے

ڈاکٹر غافر شہزاد

دنیا بھر میں جہاں دیگر علوم میں کہ جن میں سائنس، سوشل سائنس، آرٹس وغیرہ کے کئی شعبہ جات شامل ہیں، گراں قدر علمی وفکری اضافے ہوئے ہیں، وہاں تعمیرات کے فن نے بھی ترقی کی منازل طے کی ہیں۔ ترقی کا یہ سفر اگر ایک جانب انسان کو ماحول کے مطابق خود کو زندہ رکھنے کے لئے بہتر سہولیات فراہم کرتا ہے تو دوسری جانب عمارات کی تعمیر میں درپیش نت نئے چیلنجوں کا بھی سامنا کرتا ہے۔ پتھر، کانسی اور پھر لوہے کے زمانے کے انسان نے صرف موسموں کی شدت ،ان کے اثرات اور جنگلی جانوروں کی چیر پھاڑ سے خود کو محفوظ رکھنے کے لئے عمارات کی تعمیر کا آغاز کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں قدرتی سامان تعمیرات کو استعمال کر کے بستیاں بسائی جاتی تھیں۔ بعد میں آنے والے انسانوں نے بیرونی حملہ آوروں سے بچاؤ کے لئے خندقیں کھودیں، فصیلیں تعمیر کیں، شہر میں داخل ہونے کے لئے دروازے متعارف کروائے اور یوں وقت اور درپیش حالات سے مقابلہ کے لئے اپنی تخلیقی اور تعمیری صلاحیتوں کا استعمال کیا۔ اس عہد کی عمارات نہایت سادہ، کم قیمت اور کم قامت تھیں اور خوبصورتی کے حوالے سے بھی کوئی ایسی شاہکار نہ تھیں مگر وقت کے ساتھ جب تخلیقی و جمالیاتی شعور میں اضافہ ہوتا گیا، مختلف زاویوں سے زندگی کو بہتر ماحول مہیا کئے جانے پر غور وفکر ہونے لگا تو وہ انسان جس کی حیات کا مقصد جنگ وجدل اور فتوحات ہی تھا، امن کے زمانے میں تعمیرات کی طرف متوجہ ہوا اور پھر ایسے ایسے شاہکار تخلیق کئے کہ اب صدیوں پر پھیلی تعمیرات کی ایک مضبوط روایت اس کرۂ ارض پر دیکھنے اور مورّخین کی تحریر کردہ کتب میں پڑھنے کو مل جاتی ہے۔ تعمیرات کی اس روایت کو کس طرح پڑھنا

چاہئے، کیسے تجزیہ جات کرنے چاہئیں اور عہد حاضر کی ہائی ٹیک، کثیر منزلہ ٹاور جیسی بلند عمارات سے ماضی کے انسان کا تجربہ اور جمالیات کو کیسے جوڑا جانا چاہئے، اس مقالے میں کچھ ایسے ہی زاویوں پر روشنی ڈالی جائے گی اور اس بات کا جائزہ لیا جائے گا کہ پاکستان کے حصے میں آنے والی تاریخی عمارات کے مطالعے کے لئے طالب علموں کی سہولت کی خاطر کون سے طریقہ کار کا تعین کیا جائے کہ ایک جانب وہ عہد رفتہ کی عظمتوں سے آگاہ بھی ہوں اور اس کے ساتھ ان تجربات سے عہد موجود کے ترقی یافتہ انسان کے لئے جدید ترین عمارات کی تعمیر میں بھی معاونت حاصل کی جا سکے۔

فن تعمیر کی تاریخ لکھنے اور پڑھنے کے طریقہ کار پر روشنی ڈالنے سے پہلے ہمارے سامنے چند سوالات ہیں جن کا جواب دیا جانا بہت ضروری ہے کہ اس سے ہمارے مقالے کے رخ کا تعین ہو سکے گا۔ عہد گذشتہ کی یہ عمارات جنہوں نے اپنے عہد کی زندگی اور رہائش کے طریقہ کار کے مطابق انسان کو سہولت مہیا کی، کیا آج کا ترقی یافتہ انسان جو ہائی ٹیک، کثیر منزلہ عمارات میں رہائش کو پسند کرتا ہے ان عہد گذشتہ کی عمارات سے کہ جن کی تکنیک، سامان تعمیرات، جمالیات، سب کچھ بدل چکا ہے، کوئی سبق یا رہنمائی حاصل کر سکتا ہے؟ کیا ماضی ہمارے مستقبل کے لئے فن تعمیرات کا کوئی لائحہ عمل پیش کر سکتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر ان عظمتِ رفتہ کے کہنہ نشانوں کو پڑھنے یا تجزیہ کرنے یا ان پر تحقیقی مضامین لکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا قدیم ہندوستانی فن تعمیرات پر مشتمل ارتھ شاستر میں بیان کئے گئے قوانین آج بھی تعمیرات پر لاگو کئے جا سکتے ہیں؟ عہد مغلیہ کی شاندار تعمیری روایت آج کے عہد میں کہ جہاں ہر پراجیکٹ کے آغاز سے پہلے اس کی فزیبلٹی رپورٹ (feazibilty report) تیار کی جاتی ہے، ہمارے لئے جمالیات یا تعمیرات کے رہنما اصول کا تعین کر سکتی ہے۔ بادشاہوں کے لامتناہی اختیارات کا زمانہ لد چکا۔ آج جنگیں اور فتوحات مالِ غنیمت کی صورت میں شاہی خزانے میں کچھ نہیں لاتیں بلکہ جنگیں ملکوں کی معیشت پر خوفناک اثرات مرتب کرتی ہیں۔ کوئی محمود غزنوی عبادت گاہوں سے سونا لوٹ کر نہیں لے جاتا، کسی کو جنگ میں شکست ہونے پر خراج نہیں دینا پڑتا، بلکہ اب اطوار بدل چکے ہیں۔ طاقتور ممالک نے عالمی مالیاتی اداروں کا ایک جال بچھایا ہوا ہے، حکمران خواہ کوئی بھی ہو، محکوم ملک ان عالمی مالیاتی اداروں کے توسط سے طاقتور ملکوں کے محتاج رہتے ہیں اور غیر محسوس طریقے سے ان محکوم ملکوں کے

ذرائع پیداوار اور ذہانت کی منتقلی ان ملکوں میں مستقل اور مسلسل ہوتی رہتی ہے۔تو پھر ایسی تبدیل ہوتی صورتحال میں یہ عمارات، طریقہ تعمیر، تعمیری صلاحیتیں، اور ان کا تجزیہ ہماری کیسے معاونت کرسکتا ہے اور اس کے مطالعے کی کیا توجیہہ باقی رہ جاتی ہے؟ اور مطالعہ کا ایسا کیا طریقہ اختیار کیا جانا چاہئے کہ تعمیرات کی تاریخ ہمارے آج کے عہد میں طالب علموں اور دانشوروں کے لئے دلچسپی کا سبب بنے۔

تعمیرات کی تاریخ کے مطالعے میں کچھ الگ قسم کی مشکلات درپیش ہیں۔عمومی طور پر تاریخ کے مطالعے کے لئے تین طرح کا مواد ہمارے کام آتا ہے، اول تحریری دستاویزات، دوئم غیر تحریری دستاویز اور سوئم زبانی روایات۔تحریری دستاویزات میں سرکاری اور ذاتی آرکائیو اور لائبریری میں موجود وہ تمام مواد شامل ہے، جو محفوظ کر دیا گیا ہو۔اس میں رپورٹس، نثری مضامین، تصاویر، کتابیں مخطوطہ جات، الواح، تزک وغیرہ شامل ہیں جو عہد گذشتہ میں تعمیر کی جانے والی عمارات کے بارے میں مختلف پہلوؤں سے معلومات مہیا کرتے ہیں۔غیر تحریری دستاویزات میں زبانی تاریخ (Oral History) شامل ہے، کسی بھی شہر، عمارت، عہد، آثار کہ جس کے بارے میں تحریری شواہد نہ ملتے ہوں، مورّخین اس جگہ سے متعلق عینی شواہد سے مواد اکٹھا کرتے ہیں، اس میں بہت احتیاط اور عرق ریزی کی ضرورت ہوتی ہے۔اس لئے کہ عموماً سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والا یہ زبانی علم اور معلومات کا ذخیرہ اپنے اندر بہت سا غیر متعلقہ اور نا قابل اعتبار مواد بھی لئے ہوتا ہے۔اس کام کے ماہرین اپنے تجربہ اور علم کی بنیاد پر ایسے "زبانی تاریخ" کے ذرائع کو ہی استعمال کر سکتے ہیں۔یہ بہت ذمہ داری کا کام ہوتا ہے۔کوئی غلط بیان، غلط نتیجہ، آنے والے مورّخین کی کئی دہائیوں کی توانائی، روپیہ اور وقت ضائع کرنے کا سبب بن سکتا ہے کہ جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں مصنف نے بغیر تحقیق کے ایک غلط بیان جاری کر دیا تھا۔تیسرا مواد ان مہارتوں دانائیوں اور پیشہ ورانہ علوم پر مشتمل ہوتا ہے جو کتابوں میں کہیں نہیں ملتا، تحریری مواد بھی میسر نہیں ہوتا۔عوام الناس میں ان علوم کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ہوتیں مگر اس پیشہ ورانہ شعبہ سے کچھ خاندان ایسے وابستہ ہوتے ہیں جو اپنا تجربہ، علم اور معلومات نسل در نسل اپنی اولاد، شاگردوں یا خاندان کے دیگر افراد میں تقسیم کرتے رہتے ہیں جو ان کی رفاقت و رہنمائی میں یہ علوم سیکھتے ہیں۔یہ علم وہ لوگ عام عوام سے چھپا کر رکھتے ہیں اور ان کی دسترس میں نہیں آنے

دیتے۔ایسی روایات کی تاریخ کئی صدیوں پر پھیلی ہوئی ہوتی ہے اگر چہ صنعتی انقلاب نے اس طریقہ کار پر ضرب کاری لگائی ہے اور اس کا نعم البدل مشین کی پیداواری صورت میں دیا ہے۔آج خوبصورت اور درست خطاطی کے لئے کسی خطاط کی شاگردی میں زندگی کے کئی سال ضائع کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اس کے لئے کمپیوٹر کا صرف ایک Software اِن پیج کی شکل میں سیکھنے کے لئے چند گھنٹے اور پریکٹس کے لئے چند دن درکار ہیں۔

جب ہم تعمیرات کی تاریخ لکھنے کے لئے مذکورہ بالا تین طرح کے مواد کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔عہد رفتہ میں عظیم الشان عمارات تو ہمارے آباء واجداد نے تعمیر کیں مگر تعمیر کے دوران جن مراحل سے گزرنا پڑا، اس کے بارے میں کسی قسم کا تاریخی ریکارڈ محفوظ رکھنے کا برصغیر میں کوئی رواج نہ تھا۔دوسرا اہم مسئلہ یہ تھا کہ تعمیرات کا طریقہ کار بھی قبل از جدید عمارات کچھ ایسا روایتی انداز لئے ہوئے تھا جس میں معمار یا مہندس ایسی ڈرائنگ یا نقشہ جات کا اس طرح سہارا نہیں لیتا جیسے جدید عہد میں ہو رہا ہے۔مغلوں یا سلاطینِ دہلی کے عہد میں بھی بادشاہ صرف یہ فیصلہ کرتا تھا کہ یہاں قطب مینار، علائی دروازہ، تاج محل یا بادشاہی مسجد تعمیر کر دی جائے۔اس کی شکل وصورت کیسی ہوگی؟ تناسب کیا ہوگا، عمارتی ساز وسامان کیسا استعمال ہوگا، جمالیات کیا ہوگی؟ اس کے بارے میں کوئی دستاویز وغیرہ اس انداز سے تیار نہ ہوتی تھی جیسے آج کل ہوتا ہے۔شالیمار باغ کے بارے میں شاہجہان نے صرف یہی کہا تھا کہ مختلف زمینی سطحوں پر مشتمل ایک باغ تعمیر کیا جائے۔اب یہ معماروں اور مہندسین کا کام تھا کہ وہ بادشاہوں کی خواہش اور خواب کو کس طرح عملی شکل دیتے ہیں۔ممتاز محل کہ جو شاہجہان کے چودھویں بچے کی زچگی کے دوران مرگئی تھی، بادشاہ نے اس سے اپنی محبت کے اظہار کی نشانی کے طور پر تاج محل کی تعمیر کا حکم دیا تھا۔اب یہ اس عہد کے معماروں اور مہندسین کی مہارت ہے کہ انہوں نے مقابر کی صدیوں پر محیط روایت میں تعمیرات کے فن کو اس عروج پر پہنچایا کہ تاج محل وجود میں آیا۔بادشاہ کا کام یہی ہوتا تھا کہ وہ تعمیرات کے لئے تسلسل کے ساتھ رقم مہیا کرے۔ہاں مغلوں کے ہاں تعمیرات اور جمالیات کا ذوق ایسا تھا کہ وہ جب زیرِتعمیر عمارات کو دیکھنے آتے تو کئی طرح کی اچھی تجاویز دیتے۔تاج محل کی تعمیر کے دوران اورنگ زیب عالمگیر نے شاہجہان کو خط میں ایسی کئی تجاویز دیں جب اس نے زیرِتعمیر عمارت کا معائنہ کیا۔ایسی عمارتوں کا ایک مصوری عکس ضرور ہوتا تھا جس کی عملی تعمیر کے لئے

معمار اور مہندس مل کر کام کرتے تھے۔مگر یہ عجیب بات ہے کہ عہد مغلیہ یا سلاطینِ دہلی کے ادوار میں تحریر کی جانے والی تواریخ بادشاہ کی ایک ایک حرکت وحکم کو تو محفوظ کرتی ہے،مگر ایسی عالی شان عمارات کی تعمیر کے دورانئے میں وقوع پذیر ہونے والے کسی واقعہ یا تعمیراتی تفصیلات کا ذکر ہمیں خال خال ہی ملتا ہے۔

ان عمارتوں کی تعمیر میں کئی خاندان نسل درنسل دہائیوں تک کام کرتے رہے۔اینٹوں کی چنائی،قوسوں کی تعمیر،تزئین وآرائش کی مختلف اقسام مثلاً فریسکو،نقاشی،ترسیم بندی،منبت کاری وغیرہ کی مہارت کا کوئی دستاویزی ریکارڈ موجود نہیں ہے کیونکہ اس وقت روایت یہ تھی کہ عملی طور پر زیرِتعمیر عمارت میں استاد معمار کی رہنمائی میں یہ عمارتیں تعمیر کی جاتی تھیں۔استاد معمار ایک یا دو دن میں تکمیل پانے والے ممکنہ کام کے حساب سے شاگردوں کو تعمیری چال کے بارے میں رہنمائی کرتا رہتا تھا اور ساتھ ساتھ کڑی نگرانی بھی کرتا تھا،مگر کلی طور پر ان کو ایک وقت میں تمام کام سے آگاہ نہیں کرتا تھا کہ انہوں نے آگے کیا چال چلانی ہے۔اس طریقہ کار نے صدیوں تک استاد اور شاگرد کے رشتے کو مضبوطی سے جوڑے رکھا۔وہ تفصیلات جو آج کل عمارت کی تعمیر سے پہلے نقشہ جات کی صورت میں ہمارے سامنے ہوتی ہیں،عہد گذشتہ میں ایسی کوئی سہولت نہ ہوتی تھی البتہ موقع پر، زمین کے اوپر، پورے اسکیل اور تناسب کے ساتھ ایسی تعمیری تفصیلات استاد معمار لکیریں کھینچ کر شاگردوں کو سمجھاتا تھا،اور زمین کی سطح پر ہی تناسب،اسکیل اور پیمائشوں کا فیصلہ ہوتا تھا جو کہ تعمیر کے بعد مٹ جاتا تھا،لہٰذا ایسا کوئی ریکارڈ ہمارے پاس موجود نہیں جو ان عظیم الشان تعمیرات کے مختلف مراحل کی نشاندہی کر سکے۔مگر آج کتابوں یا میگزین کی صورت میں سب کچھ موجود ہونے کے سبب ڈیزائن کو چوری کرنے یا مختلف جگہوں پر ایک جیسی عمارات کی تعمیر کے رجحان کو بھی تقویت ملتی ہے۔

تعمیرات کے لئے صرف تعمیری روایت ہی مشعلِ راہ تھی جو نسل درنسل منتقل ہوتی رہتی تھی۔ برطانوی عہد نے ایسے تمام خاندانوں کو کئی دیگر جدید پیشوں میں اپنی مہارتیں استعمال کرنے کی ترغیب دی جہاں سے زیادہ آمدنی ہوسکتی تھی۔پرانی عمارتی تکنیک اور تزئین وآرائش کے طریقہ ہائے کار کو یکسر بدل دینے کے سبب یہ خاندان دربدر ٹھوکریں کھانے لگے اور انہوں نے اپنی خاندانی پیشہ ورانہ مہارت کو اگلی نسل میں منتقل کرنے کے بجائے انگریزی طریقہ تعلیم کے تحت

نوکریوں کے حصول کے لئے اپنی اولاد کو اسکولوں و کالجوں میں داخل کروانا شروع کر دیا، اور یوں دو ہزار سال پرانی تعمیری روایت دم توڑ گئی۔ ہمارے پاس ریکارڈ کے لئے بھی کچھ نہ ہے کہ ہم اس کی نشاۃِ ثانیہ کر سکیں۔

جدید طرزِ تعلیم نے عمارتوں کے مطالعے اور تاریخ نویسی کا نیا طریقہ کار وضع کر دیا ہے۔ اس طریقہ کار کا ڈھانچہ بنیادی طور پر دیگر علوم کے طریقہ کار سے مدد لیتا ہے، مگر عہد رفتہ کی ان عظیم الشان عمارات کی تعمیری روایت اور دیگر مراحل کے بارے میں مطلوبہ علم فراہم نہیں کرتا۔ اس طریقہ کار کے مطابق پہلے حصے میں عمارت سے متعلق معلومات حاصل کی جاتی ہیں جس کو ڈیٹا کولیکشن (Data Collection) کا نام دیا گیا ہے اور اس کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

1- عینی جائزہ (Visual Survey)

2- تصویری جائزہ (Photographic Survey)

3- نقشہ جات کی تیاری (Graphic Survey)

4- تاریخی و تحریری شواہدات (Historical References)

عمارتوں کے متعلق درج بالا مراحل سے گزر کر جب مطلوبہ معلومات اکٹھی کر لی جاتی ہیں تو پھر عمارت کے خدوخال، تناسب، تزئین و آرائش، جمالیات، فعالیت، تعمیری تکنیک کے حوالے سے تجزیہ کا مرحلہ آتا ہے اور یوں عمارت کو اپنے عہد کے ثقافتی تناظر میں موازناتی سطح پر رکھ کر اس کی درجہ بندی کی جاتی ہے، تاریخی حیثیت کا تعین کیا جاتا ہے۔ لوگوں کی اس عمارت سے سیاسی و سماجی و مذہبی وابستگی کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ مگر یہ تمام طریقہ کار عمارات کے انفرادی مطالعے اور تجزیہ کے لئے درست ہوگا، مگر کُلی سطح پر جب کسی عہد کی تعمیری روایت کی بات کرتے ہیں تو اس طریقہ کار سے کوئی زیادہ مدد نہیں ملتی۔

فنِ تعمیر کی تاریخ کے حوالے سے اگر کچھ تحریریں اور دستاویزات عہد موجود کی عمارات کے بارے میں ملتی ہیں تو اس میں مواد کی درج ذیل درجہ بندی ہو سکتی ہے۔

1- مورّخین (جو ماہرینِ فنِ تعمیرات نہ تھے، بلکہ تاریخ کے طالب علم تھے) نے جب ہندوستان میں مختلف بادشاہوں کے ادوار کا مطالعہ کر کے تحریری شکل میں معلومات کو محفوظ کیا تو یہ ایک

بیانیہ انداز لیئے ہوئے کتب تھیں، جن میں کسی سطح پر بھی تنقیدی یا تجزیاتی مطالعہ نہیں کیا گیا تھا بلکہ جو نظر آیا، اسے ویسے ہی بیانیہ اسلوب میں تحریر کر دیا گیا۔ ایسی کتب میں عمارتوں کی اونچائی، لمبائی، چوڑائی، کمروں کی پیمائشیں اور کچھ عمارتی ساز و سامان کا تذکرہ ملتا ہے جو محض معلومات دیتا ہے، تفہیم میں مدد نہیں دیتا۔ ان کتابوں کے مطالعے سے طالب علم کو عہد موجود میں عمارات کے ڈیزائن کے عمل میں کوئی مدد نہیں ملتی البتہ جس عمارت یا بادشاہ کے بارے میں معلومات دی گئی ہوتی ہیں، طالب علم اس سے متعارف ہو جاتا ہے۔ گویا عہد ماضی کے ان کرداروں اور عمارتوں کو نئے ذہنوں میں اپنی جگہ بنانے کا موقع مل جاتا ہے۔

2- کچھ ماہرین فن تعمیرات نے اپنے پیشہ ورانہ کام کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام بھی کر رکھا ہے اس کے لئے انہوں نے مونوگراف (Monographs) شائع کئے ہیں جن میں عمارات کی تصاویر، نقشہ جات اور ڈیزائن فلاسفی کے حوالے سے کچھ تحریری مواد شامل کر دیا جاتا ہے۔ یہ مونوگراف انفرادی سطح پر تو ماہر فن تعمیر اور اس کے کام سے روشناس کرواتا ہے مگر کلی طور پر تاریخ نویسی میں کوئی معاونت نہیں کرتا۔ اس لئے بھی کہ ان مونوگراف میں نئی تعمیرات کے بارے میں مواد شامل ہوتا ہے جو کہ ابھی اس طرح سے تاریخ کا حصہ نہیں بنی ہوتیں۔

3- مارکیٹ میں کچھ ایسی کتب و میگزین بھی موجود ہیں جن میں مختلف لوگوں کی ڈیزائن کردہ عمارات کی تعمیر و جمالیات کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ یہ کتب و میگزین خالصتاً تجارتی بنیادوں پر کیا جانے والا کام ہوتا ہے جس میں مشہور و معروف ماہرین تعمیرات کی اہم عمارات کے بارے میں فوٹوگراف، نقشہ جات اور ڈیزائن فلاسفی کا مواد شامل ہوتا ہے ان کا مقصد کسی نظریہ یا تاریخی شعور کو اُجاگر کرنا نہیں ہوتا بلکہ ایک پراڈکٹ کی طرح ان کتابوں کو پیش کر کے روپیہ کمانا ہوتا ہے۔ پھر ان میں تحریری مواد بھی کسی مورّخ یا تجزیہ نگار کا نہیں ہوتا، بلکہ بسا اوقات تو ماہر فن تعمیر نے خود ہی اپنی بساط کے مطابق تیار کر کے اشاعت کے لئے دیا ہوتا ہے۔

4- ملکی اور بین الاقوامی سطح پر کچھ کمرشل جرنل اور میگزین بھی تجارتی مقاصد کے لئے شائع کئے

جاتے ہیں جن کو طالب علم اور ماہرین فن تعمیرات بصد شوق خریدتے ہیں تا کہ نئے نئے خیالات اور عمارتی ساز وسامان کے بارے میں معلومات حاصل کر کے وہ اپنے کلائنٹس کو مطمئن اور متاثر کر سکیں۔ چھاپنے والے ادارے یہ میگزین کمرشل بنیادوں پر چھاپتے ہیں خریدنے والے ان میگزین میں عمارات کی شائع شدہ تصاویر ونقشہ جات سے اپنے پراجیکٹس کے ڈیزائن میں مدد لینے کے لئے خریدتے ہیں۔ ان میگزین کی مدد سے نئے نئے خیالات کی ترسیل بھی ہوتی ہے۔

5- علاوہ درج بالا مطبوعہ مواد کے، الیکٹرونکس میڈیا عمارتوں کے بارے میں مختلف طرح کی دستاویزی فلمیں بھی تیار کرتا رہتا ہے جو نیشنل جیوگرافک یا ہسٹری چینل سے لے کر مقامی ٹیلی ویژن چینل تک ناظرین کو دکھائی جاتی ہیں۔ دنیا بھر میں تعمیر ہونے والی عظیم الشان عمارتوں کی دستاویزی فلمیں تعمیر کے مختلف مراحل کے دوران ساتھ ساتھ تیار کی جاتی ہیں اور پھر تعمیرات کے شعبہ سے دلچسپی رکھنے والوں کو یہ دستاویزی فلمیں فروخت کی جاتی ہیں، مگر ان دستاویزی فلموں میں بھی قدیمی عمارات کی تعمیرات، جمالیات، تزئین وآرائش دلچسپی رکھنے والے عوامی ناظرین کی سطح پر فلم بند کی جاتی ہیں۔ ان کا مقصد تاریخ یا تاریخی تناظر میں تعمیری روایت کو پیش کرنا ہرگز نہیں ہوتا، اس لحاظ سے یہ دستاویزی فلمیں ظاہری اور عمومی سطح کا علم اور معلومات ناظرین کو پیش کرتی ہیں۔

6- فن تعمیر کے حوالے سے کیا جانے والا تحقیقی کام ان تھیسز اور تحقیقی مقالہ جات میں بھی محفوظ رہ جاتا ہے کہ جو فن تعمیر کے طالب علم ماسٹر یا ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حصول کے لئے کسی یونیورسٹی کے پروفیسر کی نگرانی میں مکمل کرتے ہیں۔ یہ عموماً تدریسی نوعیت کا کام ہوتا ہے جو پہلے سے طے کردہ فریم کے مطابق پیش کر دیا جاتا ہے۔ تھیسز کا یہ ضابطہ ایسا جامد اور غیر متحرک ہے کہ اس میں تاریخی روایت یا تسلسل کو آزادی سے پیش کرنے کی گنجائش ہی موجود نہیں ہوتی۔ یہ تجربہ یوں بھی اسکالرز کو تحقیقی کام کرنے کے طریقہ کار سے آگاہ کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ ڈگری کے حصول کے بعد اگر موقع ملے تو ایسے لوگ تاریخ نویسی میں کچھ نہ کچھ نمایاں کام ضرور سرانجام دیتے ہیں۔

اب تک ہم نے موجود و میسر مواد اور اس کی نوعیت کا جائزہ لیا ہے جس کی مدد سے ہم تاریخ

نویسی میں معاونت حاصل کر سکتے ہیں مگر یہ تمام مواد مخصوص مقاصد کے لئے اور مخصوص گروہ کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ ان کے پیش نظر فن تعمیر کی تاریخ کو ترتیب دینے کا مقصد ہرگز نہیں ہوتا۔ ایسے حالات میں فن تعمیرات کے طالب علموں اور اساتذہ کے لئے اور بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ تاریخی تناظر میں کس طرح تعمیری روایت کا جائزہ لیں تاکہ ماضی کو حال اور مستقبل کی تعمیری روایت سے جوڑا جا سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر مورّخین مختلف کوششیں کرتے رہے ہیں۔

فن تعمیر کی تاریخ کے حوالے سے ایک بنیادی کتاب سر بینسٹر فلیچر (Sir Banister Fletcher) کی ہے۔ فلیچر انگلینڈ میں ایک لائبریرین کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ تاریخی عمارات سے اس کی خصوصی دلچسپی تھی، انگلینڈ کی لائبریریوں اور Archive میں موجود وسیع مواد اس کی دسترس میں تھا، اس نے بین الاقوامی سطح پر عمارت سازی کی روایت کی تاریخ کو پہلی مرتبہ نہایت جامعیت کے ساتھ اپنی کتاب "History of Architecture" میں پیش کیا۔ اس نے زمان ومکان کے تناظر میں دنیا بھر میں عہد رفتہ میں سرانجام پانے والی عمارت سازی کی معلوم تاریخ کو کتاب کی شکل میں محفوظ کیا۔ اس نے یونانی، رومی، بازنطینی وغیرہ تہذیبوں اور تعمیرات کو اپنی جگہ، اور زمانے کے تناظر میں ایک ترتیب سے پیش کیا۔ اس نے ہر خطہء زمین پر تشکیل پانے والی تعمیرات کی تاریخ کو جغرافیائی، زمینی، ماحولیاتی، تاریخی، سیاسی وسماجی اور مذہبی تناظر میں درجہ بندی کر کے پیش کیا۔ مقصد یہ تھا کہ جب دنیا بھر کے مختلف خطوں میں تشکیل پانے والے تعمیرات کے فن اور عمارتوں کو یکساں زاویئے سے پیش کیا جائے گا تو دنیا بھر کی تعمیراتی تشکیل کی ایک روایت تیار ہو سکے گی اور یوں صدیوں پر پھیلے تعمیرات کے فن کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ فلیچر نے سینکڑوں کی تعداد میں عمارات کی تصاویر، نقشہ جات، سیکشن وغیرہ کا تصویری مواد حاصل کیا اور کتاب کی شکل میں شائع کر دیا۔ اس نے اس مواد کو برطانیہ میں موجود نیشنل بلڈنگ ریکارڈ، نیشنل مانومنٹل ریکارڈ، رائل کمیشن آن ہسٹاریکل مانومنٹس، رائل انسٹی ٹیوٹ آف برٹش آرکیٹیکٹس اور آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ آف انڈیا سے حاصل کیا، اور یوں مجموعی طور پر 3334 تصاویر، 2039 لائن اسکیچ کہ جس میں پلان، خاکے اور سیکشن شامل تھے، اس کتاب میں شامل کئے۔ یہ کتاب آج بھی اپنے مواد کے اعتبار سے بے مثال ہے اور اس کا کوئی ثانی نہیں۔ بیسویں صدی کے آخری عشروں تک

دنیا بھر کے آرکیٹیکچر اسکولز اور یونیورسٹیز کے اندر تاریخ کے مضمون کے تحت یہ کتاب نصاب کے طور پر طالب علموں کو پڑھائی جاتی رہی ہے یہاں تک کہ تاریخ نویسی کا اور تاریخ نگاری کا بنیادی نظریہ تبدیل ہوگیا۔اب کئی اسکولز آف آرکیٹیکچر نے اس کتاب کو نصاب میں پڑھانے پر پابندی لگا رکھی ہے۔تاریخ نویسی کے بدلتے نظریات نے اس کتاب کی اہمیت صفر کر دی ہے بلکہ اس کو تاریخ کی کتاب کے بجائے میسر مواد کی تدوین و تالیف کا نام دیا گیا ہے کہ جس میں موجود و میسر مواد کو ایک خاص زاویئے سے محفوظ کر دیا گیا ہو،مگر اس کی تجزیاتی سطح پر کوئی حیثیت نہیں بنتی اور نہ ہی مصنف کا تخلیقی و تجزیاتی سطح پر کوئی حصہ اس کتاب میں نظر آتا ہے مگر اس بات سے انکار بھی ممکن نہیں کہ اس ابتدائی مرحلے سے گزر کر ہی تاریخ نویسی کے جدید تر نظریات تک رسائی ممکن تھی، لہٰذا اس کتاب کو عالمی سطح پر فن تعمیر کی تاریخ نویسی کے حوالے سے ایک اہم سنگ میل قرار دیا جاسکتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں فن تعمیرات کی تاریخ کے لئے جو بنیادی ذرائع اور ماخذ موجود ہیں، ان میں ذرائع کی فہرست میں اوّلین وہ آثار آتے ہیں جو موئن جوداڑو، ہڑپہ اور مہر گڑھ کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں۔اس عہد میں تحریر کی جانے والی وہ کتب ہیں جو اس عہد کی سیاسی و سماجی اور مذہبی صورتحال کے علاوہ تعمیرات کے بارے میں بھی ہمیں معلومات مہیا کرتی ہیں اگرچہ یہ زیادہ تر مذہبی کتب ہیں۔ان میں مہابھارت، رامائن، بھگوت گیتا، ارتھ شاستر، دھرم شاستر، پران، وید، واستوشاستر، شلپا شاستر وغیرہ شامل ہیں۔

مغلیہ عہد کی تاریخ کو محفوظ کرنے والی کتب جیسے تزک بابری، تزک جہانگیری، اکبرنامہ، بابر نامہ، تاریخ فیروز شاہی وغیرہ میسر ہیں جبکہ برطانوی عہد میں تاریخ کو محفوظ کرنے کے لئے حکومتی سطح پر مختلف مقامی لوگوں سے ہندوستان کی تاریخ محفوظ کرنے کے لئے اردو اور انگریزی زبانوں میں کتب لکھوائی گئیں۔ان کتابوں کے لکھنے والوں میں نور احمد چشتی، کنہیالال ہندی، سیّد محمد لطیف، ٹی ایچ تھارنٹن، ایچ آر گولڈنگ، فرگوسن، کننگھم وغیرہ کی تحریر کردہ کتب شامل ہیں۔نور احمد چشتی اور کنہیالال ہندی نے اپنی کتابوں میں عمارتوں اور ان کی تعمیر کے حوالے سے جو معلومات مہیا کی ہیں اس کا زیادہ حصہ وہ ہے جو موقع پر موجود عمارت کے خدوخال، اس کی ظاہری حالت، تجاوزات وغیرہ کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔عمارت کس بادشاہ کے عہد میں تعمیر ہوئی؟ اس کی

توسیع اور مرمت کب اور کس نے کروائی ؟ ایسے سوالات کا یہ کتب جواب دیتی ہیں۔اس کے علاوہ دیگر جتنا مواد ہے جو تاریخ نویسی کی زبانی روایت (Oral Tradition) کے طریقہ کار کو اپنا کر مرتب کیا گیا ہے، چونکہ بغیر تحقیق کے شامل کر دیا گیا ہے اس وجہ سے اس میں بے شمار اغلاط اور نا قابل اعتبار معلومات درج ہوگئی ہیں، لہٰذا ان کتابوں کی تدوین نو کی سخت ضرورت ہے، البتہ ان کتابوں کو تحریر کرنے سے کہ جو سرسیّد احمد خان کی کتاب آثار الصنادید کی تقلید میں لکھی گئیں، یہ فائدہ ضرور ہوا کہ عمارتوں کو تحریری شکل میں بیان کرنے کی لفظیات اور اصطلاحات طے ہو گئیں، نئی تراکیب آ گئیں اور بعد میں اردو زبان میں اس موضوع پر لکھنے والوں کے لئے سہولت ہوگئی۔ جن انگریز مصنّفین نے برصغیر کے مختلف ادوار کی عمارتوں کی تاریخ نویسی کا آغاز کیا وہ چونکہ تعلیم یافتہ اور پہلے سے اس فن میں ماہر اور محتاط لوگ تھے لہٰذا ان کی کتابوں کو دنیا بھر میں زیادہ پذیرائی ملی۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں عہد مغلیہ میں تاریخ نویسی کے ضمن میں لکھی جانے والی کتب میں عمارت سازی کے حوالے سے ہمیں کوئی خاطر خواہ مواد نہیں ملتا۔ البتہ شلپا شاستر اور واستو شاستر دو ایسی کتابیں تھیں جن میں واستو شاستر میں عمارت سازی وتعمیر اور شلپا شاستر میں مجسمہ سازی کے زریں اصول طے کر دیئے گئے اور ان اصولوں کے مطابق عمارت سازی کی تکمیل لازم قرار پائی۔ ان قوانین وضوابط کو آج بھی ہندوستان میں فن تعمیر سے وابستہ ایک مخصوص گروہ پوری طرح لاگو کرنے کی کوششوں میں سرگرداں نظر آتا ہے۔

پاکستان بننے کے بعد جن مورّخین نے تعمیرات کی تاریخ کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ان میں ڈاکٹر احمد نبی جان، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار اور ولی اللہ خان خصوصی طور پر شامل ہیں اس کے علاوہ نذیر احمد، شیخ خورشید احمد اور ندیم ایچ احسان وغیرہ نے بھی کتب لکھی ھیں۔ یہ لوگ شعبہ آثارِ قدیمہ سے وابستہ تھے لہٰذا ان کی تحریروں میں آثارِ قدیمہ کا عکس واضح جھلکتا ہے۔ پاکستانی فن تعمیرات اور اس سے متعلق معاملات وموضوعات پر قلم اُٹھانے والے ماہرین فن تعمیرات میں کامل خان ممتاز، یاسمین لاری، ڈاکٹر عارف حسن، ڈاکٹر عبدالرحمٰن، ڈاکٹر محمود حسین، پرویز وندل، ساجدہ وندل، ولیم گروور، ڈاکٹر قدیر احمد، پرسی براؤن، فرگوسن وغیرہ شامل ہیں۔ کم وبیش ان تمام ماہرین فن تعمیر کا طریقہ کار بھی قدرے بیانیہ ہی ہے اور یہ تجزیاتی سطح پر

کوئی نتائج اخذ نہیں کرتے اور نہ ہی تعمیرات کی سرگرمی کو سیاسی، سماجی، معاشی معاملات سے جوڑتے ہیں بلکہ اپنے اپنے محدود تناظر میں باتوں کو دہراتے جاتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں چار پانچ ہزار سالوں پر مشتمل تعمیرات کی تاریخ کو کیسے پیش کیا جائے، ان کے ہاں بھی ایسی کوئی سنجیدہ کوشش نظر نہیں آتی۔ مذکورہ بالا تقریباً تمام کتابیں ہمیں فن تعمیرات کی تاریخ کو عصر موجود سے جوڑ کر پڑھنے اور مستفید ہونے کے سلسلے میں کسی قسم کی کوئی رہنمائی کرتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ ان لوگوں نے تاریخی ادوار کو حکمرانوں کے مخصوص عہد سے جوڑ کر پیش کیا ہے یا پھر ان عمارتوں کی درجہ بندی مذہبی حوالے سے کی گئی ہے۔ ایک حد تک ماہرین فن تعمیرات نے البتہ عمارت سازی کے عمل، تعمیراتی ساز و سامان، معاشرت کا طریقہ کار، تکنیک اور جمالیات سے جوڑ کر تاریخ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے مگر اس عمل میں بہت وقت ضائع ہوا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں تعمیرات کی تاریخ کو مذہبی بنیادوں پر بھی ایک تسلسل سے پیش کرنا ممکن نہیں کیونکہ کئی مذاہب ایک ہی وقت میں متوازی طور پر ہندوستان میں آزادی سے پھلتے پھولتے رہے ہیں۔ یہاں ہونے والی عمارت سازی کی سرگرمیوں کو جغرافیائی سطح پر سامان تعمیرات کے حوالے سے پیش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ برصغیر پاک و ہند میں شمال تا جنوب، مشرق تا مغرب صورتحال مختلف اور ایک دوسری سے یکسر الگ ہے، لہٰذا ہم آسانی سے پیدا ہونے والے تمام سوالات سے دامن بچا کر نہیں گزر سکتے۔

برصغیر پاک و ہند اور خصوصاً پاکستان میں اس وقت فن تعمیرات کی تاریخ اور تاریخ نویسی کے حوالے سے جو صورتحال ہمارے سامنے ہے، ایسے حالات میں ہمیں کیا طریقہ کار اختیار کرنا چاہئے کہ ہم تاریخ کو زمان و مکان کے تناظر میں تسلسل سے طالب علموں کو پڑھا سکیں اور پھر اس کو عصر حاضر کی جدید ہائی ٹیک تعمیرات کے ڈیزائن سے بھی جوڑ سکیں تاکہ عملی طور پر اس مطالعہ و تعلیم کا کوئی فائدہ بھی ہو اور اکیسویں صدی کے طالب علموں کو عہد رفتہ کی تاریخ اور عمارت سازی کے فن میں دلچسپی بھی پیدا ہو سکے۔ یہ بہت اہم سوال ہے اگر ہم مہر گڑھ، موئن جوداڑو اور ہڑپہ کی تہذیب و ثقافت اور تعمیرات کو بدھ ازم اور اس کے ساتھ جڑی ہوئی عمارتوں کی اقسام کے تسلسل میں رکھیں اور پھر یونانی اثر و آثار کے سبب پیدا ہونے والی گندھارا تہذیب و آرٹ کے نمونوں کا مطالعہ کریں، تو ہمیں ان سب میں ظاہری اور باطنی سطح پر ایک تسلسل نظر آتا ہے حتیٰ کہ یہ تسلسل

ہندوستان میں اسلامی تہذیب وتعمیرات کے متعارف کروانے پر بھی جاری رہتا ہے۔اس کی ایک قدرے بدلی ہوئی صورت ہمیں نوآبادیاتی دور کی عمارات میں بھی دیکھنے کو مل جاتی ہے اور پھر پاکستان بننے کے بعد تعمیر کی جانے والی مذہبی عمارات خصوصاً مساجد اور ثقافتی عمارات اور یادگاروں میں بھی اس کا تسلسل نظر آتا ہے۔اگر ہم ان تمام ادوار کا مطالعہ اس تسلسل میں کریں تو ہمیں مرئی اور غیر مرئی ہر دو سطحوں پر ان عمارتوں کی تعمیر اور تزئین وآرائش میں ایک تسلسل ملتا ہے۔ اس کو بنیاد بنا کر اس خطے میں تشکیل پانے والی تعمیرات کی روایت تشکیل دی جائے تو ہم کئی سوالوں سے پہلوتہی کرتے دامن بچاتے، باآسانی گزر سکتے ہیں۔تعمیر کا یہ تسلسل دراصل تین طرح کے کرداروں کے باہمی ربط سے قائم ہوتا ہے اور یہ تکون انسان، کائنات اور خدا کے باہمی ربط سے وجود میں آتی ہے۔انسان نے آنکھ کھولی، شعور کی منزلوں پر قدم رکھا اور کائنات کے اسرار ورموز کو جاننے کے لئے حساب اور جیومیٹری میں تناسب کا سہارا لیا اور پھر زمین اور کائنات اور اس کے دیگر سیاروں کے ساتھ ربط یا ضابطہ قائم کرنے کی کوشش کی، زمین کی تشکیل کے لئے پانی، مٹی، آگ، ہوا جیسے چار بنیادی عناصر کو مشترکہ ذمہ دار قرار دیا گیا اور پھر ان چار عناصر کو جیومیٹری کی شکل میں گنبد (بلبلہ جو کہ اسٹوپ اور مزار میں ہے) آگ (تکون، فوارہ) مٹی (زمین۔۔مربع چاروں اضلاع برابر) اور ہوا (بالائی چھتری نما اسٹرکچر) کی صورت میں عمارتوں کے اندر پیش کیا۔کائنات کی تشکیل وقیام کا ذمہ دار پیمائش اور جیومیٹری کے پُراسرار تناسب کو حساب کا فارمولا قرار دیا، اور یہ تعمیراتی تسلسل ہر عہد میں قائم رہا، کبھی مقابر ومزارات کی صورت میں، کبھی مساجد و معبد ومندر کی صورت میں، تعمیر کرنے والا انسان ہی تھا جو کائنات کی پُراسراریت کو جان لینے کے لئے حساب کے فارمولوں کی تلاش میں رہا۔زمین پر جو معبد بنائے ان کو خدا کے گھر کے طور پر تعمیر کیا گیا، ہندو مندر بھی بھگوان کا گھر تھا، مسجد بھی اللہ کا گھر قرار پائی، مزار صوفی کی ابدی جائے رہائش جہاں مربع، دائرہ اور مکعب مل کر ایک جیومیٹری کی تشکیل کرتے ہیں۔اسی طرح اسٹوپ میں بھی دائرہ، مربع، اور مکعب مل کر ایک عمارت کی تشکیل کرتے ہیں۔اسٹوپ میں بھی گوتم بدھ کے جسم کی راکھ، اس کے تبرکات دفن ہوتے ہیں، مزار میں بھی صوفی یا اس سے متعلق تبرکات موجود ہوتے ہیں۔مزار ہو یا اسٹوپ، جیومیٹری کی سطح پر ایک انسانی آئیڈیل جسم کے تناسب کی علامتی عمارتی شکل ہے جبکہ مندر ہو یا مسجد، بھگوان یا اللہ کے گھر کے طور پر تعمیر کیا جاتا ہے، لہٰذا گذشتہ پانچ

چھ ہزار سالوں میں تعمیرات کا جو تسلسل اور روایت ہے وہ ایک ہی سلسلے کی آگے بڑھتی ہوئی کڑی ہے، ہندومت، بدھ مت یا اسلام، سبھی سے متعلق تعمیرات میں کئی اقدار مشترک رہی ہیں۔ ہمیں تعمیرات کے مضمون کو مذہب، عبادت گاہ یا جغرافیائی حدود کے تناظر میں نہیں پڑھانا چاہئے بلکہ انسان کی تعمیراتی سرگرمی کے طور پر ان تمام عمارات کو دیکھنا، سمجھنا اور پرکھنا چاہئے۔ انسان، خدا اور کائنات کا ایک گہرا ازلی رشتہ ہے۔ انسان کی اس زمین پر کوئی بھی سرگرمی خدا اور کائنات کے ساتھ اس کے مخفی یا ہویدا تعلق سے ہرگز باہر نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا اگر ان تمام عمارات کا تجزیہ، عمارت کی فارم کا تناسب اور بنیادی جیومیٹریکل اشکال (دائرہ، مربع، تکون) کے تناظر میں کیا جائے گا تو یہ سب ایک ایسے Being کی سرگرمی نظر آئے گی جس کا ہر عہد میں خدا اور کائنات سے رشتہ رہا ہے۔

برصغیر پاک و ہند اور خصوصاً پاکستان میں تعمیرات کی تاریخ اسی تناظر میں لکھی جانی چاہئے اس کو مغرب سے درآمد شدہ نظریات کے چوکھٹے میں فٹ کر کے جب بھی سمجھنے کی کوشش کی جائے گی ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکیں گے۔ نوآبادیاتی عہد میں انگریز مورّخین نے ہمیں "عیسائی عمارات" کی اصطلاح کے بجائے گوتھک فن تعمیر سے متعارف کروایا۔ ہندو تعمیرات، محمڈن تعمیرات جیسی اصطلاحات کو نبھانے کے لئے پرسی براؤن نے "ہندو دروازہ" اور "مسلمان دروازہ" تک کے تشخص کو دریافت کر لیا تھا۔ ہم اگر برطانوی عہد کے متعارف کردہ، گمراہ کن اور قدیم تاریخی چوکھٹے سے باہر نکل آئیں اور پھر موئن جوداڑو، ہڑپہ، اور گندھارا کی قبل از مسیح تہذیبوں کے تسلسل میں ہندو ازم، بدھ ازم اور اسلام سے متعلق تعمیرات کو دیکھیں تو ہمیں اس میں صدیوں کے ایک جاری سفر کے تسلسل کے شواہدات ملیں گے۔ یہ سفر اس زمین پر رہنے والے انسانوں نے طے کیا ہے۔ مذہبی عقائد خواہ کچھ بھی رہے ہوں، حکمران خواہ جس کے آگے بھی سربسجود رہے ہوں، انسان وہی تھا، جس نے بیل گاڑی سے سفر شروع کیا تھا، جو زراعت اور تجارت سے وابستہ تھا، جس نے زمین کے سینے کو چیر کر فصلیں اُگائیں، اوزار بنائے، پانی نکالا، بادشاہوں اور سلاطین کے زیرنگیں رہا اور اب جمہوری دور کے حکمرانوں اور آمریت کے نمائندگان نے اسے یرغمال بنایا ہوا ہے۔ ہمیں اس انسان، خدا اور کائنات کے درمیان تعلق کی تلاش کا تسلسل جاری رکھتے ہوئے تعمیرات کی تاریخ کو اسی تناظر میں پڑھنا اور پڑھانا چاہئے،

اس سے مختلف تہذیبوں، ثقافتوں، مذاہب اور عقائد سے جڑے ہوئے انسان کے بارے میں سالہا سال سے اٹھائے جانے والے سوالات کے جوابات بھی مل جائیں گے اور مختلف ادوار میں حکمرانوں کی لکھوائی ہوئی تاریخ اور مغربی مفکرین کے پھیلائے ہوئے ابہام اور کنفیوژن سے بھی چھٹکارا مل جائے گا اور اس تسلسل میں ہم آج کی عمارتوں کے تشخص، تناسب، تکنیک، تزئین و آرائش اور جمالیات کے بارے میں بھی جان پائیں گے۔

معاشی پالیسی اور نوکر شاہی کا کردار

رؤف نظامانی

معیشت دانوں کا پاکستان کی معیشت اور یہاں کے لوگوں کے مسائل کے ساتھ کس طرح کا تعلق رہا ہے اور انہوں نے اس کے حل میں کس طرح کا کردار ادا کیا ہے۔ ان معاشی ماہرین کو دو طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو حکومت کے ساتھ رہے ہیں اور پالیسی سازی میں ایک اہم کردار ادا کر رہے ہیں جبکہ دوسرے وہ ہیں جو حکومت سے باہر رہتے ہوئے معاشی پالیسیوں کی سمت درست کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

پاکستان نے شروع ہی سے اپنے آپ کو سرمایہ دارانہ بلاک اور خاص طور پر امریکہ سے نتھی کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ اس لیے جب ملک میں معیشت دانوں کی کمی کا سوال سامنے آیا تو فورڈ فاؤنڈیشن وغیرہ جیسے اداروں سے مدد طلب کی گئی تا کہ ملک میں معیشت دانوں کی ایک ایسی بنیاد تیار کی جا سکے جو عالمی سرمایہ دارانہ نظام سے ملک کے تعلق کو مزید مضبوط کر سکیں۔ بیرونی ماہرین تربیت کے کام کے ساتھ ساتھ معاشی پالیسی سازی میں نہ صرف شامل ہو گئے بلکہ اس سلسلے میں ایک اہم کردار ادا کرنے لگے۔ ایس ایم نسیم بھارت کے حوالے سے بتاتے ہیں ہیں کہ انہوں نے بھی معیشت دانوں کی تربیت وغیرہ کے حوالے سے بیرونی امداد حاصل کی تھی لیکن انہوں نے ان بیرونی ماہرین کو صرف تربیتی اور تعلیمی کاموں تک ہی محدود رکھا تھا اور پاکستان کے برعکس انہیں اپنے پالیسی ساز اداروں سے دور ہی رکھا تھا۔ اس عرصے میں ملک کی پالیسی سازی میں فارورڈ ایڈوائزری گروپ کا کردار خاص طور پر بڑھ گیا تھا۔ پاکستان کا دوسرا پانچ سالہ منصوبہ جسے اب تک کا سب سے کامیاب منصوبہ گردانا جاتا ہے

اس کو اس گروپ سے ہی منسوب کیا جاتا ہے۔

پاکستان کے حوالے سے یہ سوال بھی اہم ہے کہ جو معیشت دان حکومت کا حصہ بھی رہے ہیں ان کی معاشی پالیسی سازی اور فیصلوں میں کتنی اہمیت رہی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ رہی ہے کہ ابتدائی برسوں میں مہاجرین کی آبادکاری اور تجارت کے ساتھ اثاثوں وغیرہ کی تقسیم کے حوالے سے جو مسائل درپیش تھے ان کے حل یا انہیں مزید اُلجھانے میں تاج برطانیہ کی تربیت یافتہ نوکر شاہی نے اہم کردار ادا کیا تھا اور معاشی ماہرین پس منظر میں ہی رہے تھے۔ اس لحاظ سے پاکستان میں پالیسی سازی میں معاشی ماہرین سے زیادہ نوکر شاہی کے عمل دخل کی ایک روایت شروع سے چلی آ رہی ہے۔ اس وجہ سے علمی قابلیت سے زیادہ اثر و رسوخ کے متلاشی معاشی ماہرین کی اکثریت کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ نوکر شاہی کا حصہ بن جائیں۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ یہ نوکر شاہی ہی ہوتی ہے جو سیاست دانوں کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتی چلی آ رہی ہے۔ حمزہ علوی اسٹیٹ بینک کی اپنی نوکری کے حوالے سے اپنے مضمون ''The Minister and the Bureaucrat'' میں بتاتے ہیں کہ بھارت سے پٹسن کی برآمد کے معاملے پر کس طرح اس وقت کے وزیر تجارت فضل الرحمان اپنے سیکریٹری کی ہاں میں ہاں اور ناں میں ناں ملانے پر مجبور تھے اور اپنا کوئی آزادانہ فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

اس سلسلے میں پاکستان کے ڈاکٹر محبوب الحق اور بھارت کے نوبل انعام یافتہ معیشت دان امرتا سین کی مثال دی جاتی ہے۔ یہ دونوں ہم عصر اور ایک لحاظ سے تعلیمی قابلیت اور پیشہ ورانہ صلاحیت میں ایک دوسرے کے ہم پلہ ہی تھے۔ لیکن دونوں نے اپنے لیے الگ الگ راستوں کا انتخاب کیا۔ محبوب الحق نے حکومت کا حصہ بننے کا فیصلہ کیا اور نسبتاً کم عمری میں ہی بلندیوں کو چھولیا۔ پلاننگ کمیشن، عالمی بینک اور UNDP وغیرہ میں خدمات سرانجام دینے کے بعد آخری دور میں ضیاء الحق کے وزیر خزانہ بھی رہے۔ وہ ایوب خان کے ''مساوات کے بغیر ترقی'' کے بھی وکیل تھے۔ جبکہ بعد میں دولت کے ارتکاز اور بائیس خاندانوں کی نشاندہی بھی انہوں نے ہی کی اور سماجی انصاف اور غربت کے خاتمے کے نظریہ کو آگے بڑھایا۔ ڈاکٹر حق کے برعکس ڈاکٹر سیف ہمیشہ حکومت سے دور ہی رہے۔ حکومت میں شامل ہونا تو دور کی بات حکومت کے لیے کام کرنے کو

بھی وہ مناسب خیال نہیں کرتے تھے۔اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی اخباری رپورٹر نے ان سے پوچھا کہ اگر انہیں وزیرِخزانہ بنایا جائے تو پہلا کام کیا کریں گے تو ان کا فوری جواب تھا کہ میں استعفیٰ دے دوں گا۔

ملک کی سیاست میں بھی اس بات کے واضح عکس نظر آتے ہیں۔خاص طور پر مغربی پاکستان اور مشرقی بنگال میں سیاسی اور معاشی تقسیم میں یہ ایک اہم عنصر ہے۔مغربی پاکستان کے ماہرین کی ترجیح نوکر شاہی کا حصہ بننا تھا جو معاشی پالیسیوں پر عملدرآمد کو ممکن بنا سکے۔ جبکہ مشرقی بنگال سے تعلق رکھنے والے ماہرین زیادہ تر تحقیق، تربیت اور تعلیم کے اداروں تک ہی محدود رہے۔اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ زیادہ تر ترقیاتی کام ملک کے مغربی حصے تک ہی محدود رہے اور مشرقی حصے کے لوگ بڑی حد تک اس ثمر سے محروم رہے۔اس mindset کے تحت ہی پاکستان کے اہم معاشی تحقیق اور تربیت کے ادارے PIDE کو مشرقی پاکستان منتقل کر دیا گیا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنگلہ دیش بننے کے بعد پاکستان کو معاشی تحقیق اور تربیت وغیرہ کے میدان میں نئے سرے سے شروعات کرنی پڑی جبکہ اب اس کے پاس وہ بیرونی امداد اور بیرونی ماہرین کی مدد بھی نہیں تھی جو کہ پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں میں تھی۔

اس لحاظ سے معاشی منصوبہ بندی کے حوالے سے نوکر شاہی اور بیرونی ماہرین کے مقابلے میں ملکی ماہرین کی حیثیت ہمیشہ سے ثانوی رہی ہے۔ان ماہرین کی تجاویز پر اس حد تک ہی عملدرآمد ممکن ہوتا ہے جس حد تک وہ نوکر شاہی اور حکمران طبقات کے مفادات سے مطابقت رکھتی ہوں۔یہ بات پہلی بار اس وقت سامنے آئی جب اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے پہلے گورنر زاہد حسین کے تیار کردہ ملک کے پہلے پانچ سالہ منصوبے میں زرعی اصلاحات وغیرہ کو بنیاد بنایا گیا تھا۔اس کی پاداش میں نہ صرف زاہد حسین کو پلاننگ بورڈ کے چیئرمین کے عہدے سے ہٹا کر پولیس سروس کے ایک افسر کو ان کی جگہ مقرر کیا گیا بلکہ اس منصوبے کی بہت سی معاشی اور انتظامی تجاویز پر عمل درآمد نہیں ہو سکا۔

اس وقت پاکستان میں معاشی منصوبہ بندی کی وہ حیثیت بھی نہیں ہے جو پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں میں ہوا کرتی تھی۔دوسری وجوہات کے علاوہ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ عمومی طور پر سماجی علوم کے معاملے میں اور خاص طور پر معاشی علم کے متعلق تحقیق اور تنقید اور اس کا

سماج پر اطلاق ایک ثانوی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور بڑی حد تک تقلید ایک عقیدے کی صورت اختیار کر گئی ہے۔

پاکستان میں شروع سے ایک Counter Culture کو اُبھرنے نہیں دیا گیا جس کی وجہ سے سماجی علوم کی ایسی orientation فروغ نہیں پا سکی جو عوام دوست ہو اور پالیسی سازی کو اس جانب موڑنے پر مجبور کر سکے۔ سیاسی اور نظریاتی جبر کی وجہ سے سماج کو نئی بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے کوئی اساس ترتیب نہ دی جا سکی۔ انفرادی طور پر کوششیں کی گئیں اور انہیں محدود حلقوں میں پذیرائی بھی حاصل ہوئی لیکن مضبوط سیاسی پشت پناہی نہ ہونے کی وجہ سے اس کا grass root پر نفاذ نہ ہو سکا۔ اس صورت حال میں حکمران طبقے کے لیے یہ آسان ہوتا ہے کہ وہ عوامی مسائل کے لیے ایسے حل تجویز کرے جو اس کے مفادات سے مطابقت رکھتے ہوں۔ اس سلسلے میں ایوب خان اور بعد میں ستر کی دہائی میں ذوالفقار علی بھٹو کی اصلاحات اہم حیثیت رکھتی ہیں۔ ان دونوں طرح کی اصلاحات میں زرعی اصلاحات کو خاص اہمیت دی گئی تھی جن کا ایک بڑے عرصے سے مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ لیکن ان کی روح کو دیکھتے ہوئے شروع میں ہی یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ اس سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکیں گے بلکہ صرف ریاست اور قابض طبقے ہی مزید مضبوطی اور طاقت حاصل کریں گے۔ ان سب اصلاحات پر عمل درآمد اور بعد کے حالات نے اس چیز کو مزید عیاں کر دیا۔

اس وقت معاشیات سمیت سماجی علوم کے لحاظ سے پاکستان میں ایک خال یا vaccum ہے۔ حکمران طبقات نے نہ تو اس سلسلے میں بعد جوازی طرز فکر کی بنیاد پر علوم کی ترویج کے لیے کوششیں کیں اور نہ ہی سماج میں تنقید اور counter culture کی حوصلہ افزائی کی جس کی وجہ سے اس وقت یوں لگتا ہے کہ جیسے ہم قرون وسطیٰ میں دھکیل دیئے گئے ہوں اور ایسا کوئی سرا نہیں مل رہا جس سے اپنی سمت کا تعین کر سکیں۔

ذرائع ابلاغ

ڈاکٹر توصیف احمد خاں

سوشل سائنس سے مراد وہ علم ہے جس کا تعلق معاشرے اور انسانی طرز عمل سے ہو۔ عام طور پر سوشل سائنس میں عمرانیات، نفسیات، بشریات، معاشیات، ابلاغ عامہ، سیاسیات، بین الاقوامی تعلقات، جغرافیہ، تاریخ اور سوشل ورک وغیرہ شامل کیے جاتے ہیں۔ یہ تعریف وکی پیڈیا میں بیان کی گئی ہے۔ اسی طرح فری آن لائن ڈکشنری میں تحریر کیا گیا ہے کہ انسانی معاشرے اور معاشرے میں افراد کے درمیان باہمی تعلق کے مطالعے کو سوشل سائنس کہا جاتا ہے۔ انسانی معاشرے اور معاشرے میں افراد کے درمیان باہمی تعلق کی سائنٹیفک بنیادوں پر مطالعے کو سوشل سائنس کہتے ہیں۔ یہ تعریف آکسفورڈ ڈکشنری میں تحریر کی گئی ہے۔ اسی طرح کیمبرج ڈکشنری میں یہ تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے کہ انسانی معاشرے میں انسانوں کے طرز زندگی کے مطالعے کو سوشل سائنس کہتے ہیں۔ بریٹانیکا ڈکشنری کے مطابق سائنس کی ہر وہ قسم جو معاشرے اور ثقافتی تعلق کے ساتھ انسانی طرز عمل کا جائزہ لے اسے سوشل سائنس کہتے ہیں۔ اسی طرح میریم ویبسٹر ڈکشنری میں درج ہے کہ یہ ایک ایسی سائنس ہے جس میں انسانی معاشرے، اس میں موجود اداروں کا باہمی تعلق اور انسانوں کے درمیان معاشرے کے رکن کی حیثیت سے باہمی تعلقات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ عمومی طور پر ثقافت کو آرٹ کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے۔

عمرانی علوم اور ابلاغ عامہ کے درمیان سب سے اہم تعلق یہ ہے کہ ابلاغ عامہ کے بغیر علوم عمرانی اپنے اہداف کو حاصل نہیں کرسکتا۔

حضرت مسیح سے کوئی ساڑھے سات سو سال قبل روشن راج کے زمانے (یونانیوں) کے ہاں

قلمی خبرنامہ جاری کیا جاتا تھا جو کہ ابلاغ کا اہم ترین ذریعہ تھا۔ تاریخ صحافت میں ہے کہ اخباری خبریں دیواروں پر چسپاں کی جاتی تھیں، اس کے شواہد بھی ہیں کے کاغذ کی روایت سے پہلے مٹی کی تختیوں پر ابلاغ کے لیے خبریں، اطلاعات کندہ کی جاتی تھیں جس کے ذریعہ اطلاعات، تعلیم اور تہذیبی روایات کا فروغ ہوتا تھا، بعض ایسے مخطوطے بھی دریافت ہوئے ہیں جن میں انسانی جسم اور ڈھانچے کی وضاحت کی گئی تھی جو کہ سائنسی علوم Physical Science کی تعلیم کا اولین ماخذ علم۔۔۔

آج ذرائع ابلاغ نے جدیدیت کے باعث یہ مقام حاصل کرلیا ہے کہ سماجی مسائل کے حل کے لئے اپنا اہم کردار ادا کرسکتی ہیں مثلاً قوم کے ترقیاتی ابلاغ Development Communication کے ذریعہ کو استعمال کیا جاتا ہے۔ ملکوں اور قوموں کے درمیان افہام و تفہیم International Communication اپنی تمام تر سائنسی ضروریات کے ساتھ موجود ہے اور اگر قومی اتفاق National Consensus پیدا کرنا ہو تو موجود ذرائع ابلاغ کو استعمال کر کے علاقائی، صوبائی اور قومی مسائل کے حل کیلئے پیش رفت ہوتی ہے۔ مثلاً روسو کے معاہدہ عمرانی کے نظریے پر عمل کرنے سے نظریہ اجتماعت کام آسکتا ہے۔ سماجی ترقی کی خاطر Libertarian کا نظریہ سماجی ذمہ داری اور اس نظریہ کے ذریعہ پاکستان میں جمہوری ترقیاتی اور ملکی سیاسی معاملات پر کھلے عام بحث کر کے اور عوام کی آگاہی اور مدد سے حکمرانوں کے فیصلوں کو تبدیل کیا جاسکتا ہے جس میں آزادی، سماجی برابری پر کھلے عام بحث ہوتی ہے اور عوام کو relief فراہم کرنے کا انتظام ہوسکتا ہے۔

ابلاغ عامہ اور سماجی علوم (Social Media & Mass Media)

ابلاغ عامہ کا تعلق چونکہ معاشرے اور سماج کے ہر حصے اور طبقے سے ہوتا ہے خواہ تحریری، سماعتی یا (Visual)، نظری (Audio) ہو اس لیے اس کا تعلق دنیا کے ہر کلچر (ثقافت) سے ہے چونکہ انسان گروہی حیوان ہے اور وہ اجتماعی یا گروہی شکل میں ایک دوسرے سے تعامل (Interact) کرتا ہے، لہٰذا اس طریقہ کار سے بین الثقافتی عمل بھی رونما ہوتا ہے اور بین المذہبی بھی اور اسی طرح معاشرتی زندگی نمو پاتی ہے۔

ممتاز ثقافتی ماہر (Murdock) مردوک کے مطابق ثقافت سماجی طور پر انسانی رویہ پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کا صرف اظہار ہی نہیں ہوتا بلکہ دو ثقافتوں کے درمیان عملی تعاون کے ذریعہ دونوں ثقافتیں متاثر بھی ہوتی ہیں اور یہ متاثر ہونے کا عمل دوطرفہ Bilateral ہوتا ہے۔ اس لیے ابلاغ اور ثقافت کا گہرا رشتہ ہے۔ جدید ذرائع ابلاغ نے اس عمل کو یعنی ثقافتوں کے درمیان Interaction کو عالمی حیثیت دے دی ہے کیونکہ دنیا ایک دوسرے کے قریب آ چکی ہے اور Global Village میں سمٹ چکی ہے، علاوہ ازیں جدید ذرائع ابلاغ پر ثقافتی عمل ابلاغ اثر انداز ہوتا ہے۔

میڈیا نہ صرف اطلاعات فراہم کرتا ہے بلکہ ثقافتوں کی خلیج کے درمیان موجود خلیج Tension کو دور کرتا ہے اور ان کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ جدید ماہرین ثقافت کے مطابق میڈیا ہمارے عقائد، تصورات، نظریات اور رویوں (Attitude) کی تشکیل میں بھی کردار ادا کرتا ہے۔ جدید ابلاغیات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ میڈیا کو سماجیات کے عمل کے دوران دیگر سماجیاتی علوم پر نسبتاً فوقیت حاصل ہے اور یہ عمل ابلاغ نہ صرف سماجی ماحول پر نظر رکھتا ہے بلکہ عوام کی رائے کو بھی متاثر کرتا ہے اور معاشرے کے اخلاقی و سماجی رویوں، جمہوری اقدار کے اصولوں کو پھیلانے میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ سماج کے مختلف طبقات اور حلقوں کے درمیان فکری ہم آہنگی پیدا کرنے میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے اور بے شمار فرائض (Functions) سرانجام دیتا ہے لیکن عمومی زندگی میں میڈیا کے عمل کو سراہا نہیں جاتا۔ اس کے باوجود ثقافت کے فروغ اور ثقافتی ورثے کی حفاظت اور رائے عامہ کے انفرادی و اجتماعی وسیع النظری (Collective Vision) کے بڑھاوے میں مدد بھی میڈیا ہی فراہم کرتا ہے۔

ابلاغ عامہ سماج، معاشرہ اور ماحول سے باہر کام نہیں کرتا بلکہ معاشرے کے مختلف طبقوں کے مسائل کو اُجاگر کرتا ہے اور ان کے حل کی ممکنہ تدابیر سامنے لاتا ہے۔۔ سماجی ماہرین کا کہنا ہے کہ سماجی تبدیلی میں مرد و خواتین، تعلیم یافتہ غیر تعلیم یافتہ کے ساتھ ساتھ ابلاغی طریقہ کار Communication System بھی اہم کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں اور سماجی تبدیلی کے اظہاریہ ہوتے ہیں Indicator اور Agent کا کردار بھی ادا کرتے ہیں او معاشرتی زندگی میں ابلاغ عامہ تبدیلی کا محرک بنتا ہے کیونکہ معاشرتی زندگی کے خدوخال کی وضاحت یا اظہار صرف

ابلاغ عامہ کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔ جدید ریاستی صنعتی تہذیبی معاشیات میں بھی ابلاغ عامہ ایک اہم کردار ادا کرتا ہے کیونکہ میڈیا اپنے مسلسل عمل کے ذریعے سیاسی اور جمہوری اقدار وطریقہ کار کے تحفظ کا فریضہ انجام دیتا ہے۔

ممتاز فلسطینی ماہر ایڈورڈ سعید نے یہ انکشاف بھی کیا کہ کس طرح ایک امپیرلسٹ ثقافت نے انیسویں صدی میں دوسری ثقافت میں شامل ہو کر اس کے مزاج کو تبدیل کر دیا۔

ایک اور قابل تحقیق عمل ہے کہ کس طرح بیرون ملک تیار کردہ فلموں نے اذہاں کی تبدیلی اور ثقافتی اقدار کی تبدیلی میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ جہاں تک کہ عام اشیاء صرف کے استعمال اور طریقہ کار میں جو تبدیلی ملتی ہے وہ بھی ابلاغ عام کی ہی وجہ سے ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کس طرح سے ترقی پذیر ممالک میں اپنی صنعتی ترقی کی بدولت اپنی تہذیب اور ثقافتی ورثہ منتقل کرتے ہیں جو کہ واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ ایک نئی Consumer Society وجود میں آ رہی ہے جس کے صارف ترقی پذیر ممالک بن رہے ہیں اور مغربی ممالک اپنی تہذیبی روایات اور ٹیکنالوجی کی منتقلی کے ذریعے ترقی یافتہ ممالک مزید ترقی کر رہے ہیں نتیجہ میں مقامی صنعتیں زوال پذیر ہو رہی ہیں اور بے روزگاری اور معاشی بدحالی پھیل رہی ہے۔

ذرائع ابلاغ کی تعریف یوں بھی کی جاتی ہے کہ افراد اور معاشرے میں قائم ادارے معلومات کے فروغ کے لیے ایک خاص وقت میں جو جو طریقے اور ٹیکنالوجی استعمال کرتے ہیں اس کا مطالعہ ابلاغ عامہ کہلاتا ہے۔ عمومی طور پر اخبارات، میگزین، ریڈیو، ٹی وی اور فلم کا مطالعہ موضوع رہتا ہے کیونکہ یہی ذرائع ابلاغ ہیں جن کی مدد سے معاشرے میں مجموعی طور معلومات کا پھیلاؤ ہوتا ہے۔ خبریں اور اشتہارات دونوں ذرائع ابلاغ کے ذریعے پھیلاؤ حاصل کرتے ہیں۔ ابلاغ عامہ کی مدد سے معلومات کے ابلاغ، ان کی توضیح وتشریح، معاشرتی شعور کے فروغ اور عوام کے شعور میں اضافہ میں مددگار ہوتی ہے۔ ابلاغ عامہ کی تحقیق میں میڈیا کے ادارے، ابلاغ کا عمل، معلومات کے پھیلاؤ، میڈیا کے ذریعے ترغیبی پیغامات اور عوامی رائے سازی کے موضوعات شامل ہوتے ہیں۔ نظریۂ ارتقاء کے مطابق انسان جب سے وجود میں آیا ہے انسانوں کو اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ایک دوسرے سے رابطے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یوں انسانوں نے اولین طور پر اشاروں سے ایک دوسرے سے ابلاغ کرنا شروع کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ

ساتھ اشاروں نے اشکال کی شکل اختیار کر لی۔ پھر انسانوں نے آواز کے ذریعہ ابلاغ کو اپنایا اور اپنے حلق سے نکلی ہوئی آوازوں کے نام رکھنے شروع کیے اور زبانوں کے ارتقاء کا نیا سلسلہ شروع ہوا۔ زبان (Language) کی ایجاد نے انسانوں کے درمیان ابلاغ کو آسان کر دیا، جب انسان نے زراعت کا استعمال سیکھا تو ذاتی ملکیت کا تصور آیا اور خاندان سے عورت کی حاکمیت ختم ہوئی جس پر وہ اب تک اپنے خاندانی نظام کو چلاتی تھی اور آہستہ آہستہ مرد کی حاکمیت قائم ہوئی اور خاندان کے مرد سربراہ کی حیثیت نے حاکمانہ طرز تخاطب اختیار کیا اور حکمیہ جملوں نے پہلے خاندان کے سربراہ اور بعدازاں قبیلے تشکیل پانے پر سرداروں نے زبان کو اپنے احکامات کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ کہا جاتا ہے کہ قدیم بابل اور مصری تہذیب کے باسیوں نے 3 ہزار سال قبل حروف کا ستعمال کرنا شروع کیا تھا۔ دنیا کی قدیم تہذیب موئنجو دڑو سے ملنے والے آثار میں بھی ایسے تحریری نمونے ملے ہیں۔ قدیم تہذیبوں کے باشندے اپنے خیالات نظریات کو جانوروں کی کھالوں پر بھی محفوظ کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مختلف قبائل میں کہانیاں سنانے والے پائے جاتے تھے، یہ مختلف واقعات کو زبانی (Oral) بیان کرتے تھے۔ ان واقعات میں انسانی جذبات واحساسات، انسانوں کی بہادری، دوستی و دشمنی کے واقعات پیش کیے جاتے تھے۔ بعد ازاں قدیم تہذیبوں میں حروف تحریر کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تو یہ ابلاغ کے سب سے پہلے طریقے کتاب کی ابتداء تھی۔ اس سے قبل مٹی کے یا لکڑی کے ٹکڑوں پر تصویری اشکال اور حروف تحریر کیے جاتے تھے، یوں ان ٹکڑوں کو جوڑ کر کتاب مرتب ہوئی تھی۔ (1) کہا جاتا ہے کہ تاریخی طور پر 2400 قبل از مسیح کے دور میں مصریوں نے Papyros پر لکھنا شروع کیا تھا جس سے Paper یعنی کاغذ کا لفظ نکلا۔ یہ پیپر دریائے نیل کے کنارے لگے اور اگائے گئے پودوں سے تیار ہوتا تھا۔ مصری باشندے Scrolls کی شکل میں لکھا کرتے تھے جس طرح آج کل آرکیٹیکٹ عمارتوں کے نقشے تیار کرتے ہیں۔ (2) یونانیوں نے 650 BCE میں تحریر کا یہ طریقہ اپنا لیا، یونانیوں نے بھیڑ و بکری کی کھالوں کو تحریر کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ جانوروں کی کھالیں مضبوط، پائیدار اور سستی ہوتی تھیں اور با آسانی دستیاب ہوتی تھیں۔ (3) چونکہ یہ کھالیں مصر سے درآمد نہیں کرنی پڑتی تھیں، یوں وادیٔ بابل کے باسیوں نے حکومتی ریکارڈ، تجارتی کھاتے کھالوں پر تحریر کرنے شروع کیے۔ بعدازاں چینی باشندوں نے درختوں کی چھالوں اور لکڑی کے ٹکڑوں پر لکھنا شروع کیا

اورانہیں اشکال کی صورت میں جمع کرنا شروع کیا۔(4) چینیوں نے 105CE میں کپاس سے کاغذ بنانے کا فن سیکھا جبکہ یورپ میں 13 ویں صدی تک کاغذ کا استعمال شروع نہیں ہوا تھا۔ یورپی باشندے کھالوں کو ان کی مضبوطی اور پائیداری کی بناء پر تحریروں کے لیے استعمال کرنے کو بہتر سمجھتے تھے۔کہا جاتا ہے کہ رومی باشندوں نے۔۔۔۔ویں صدی میں پہلی Proto Modern Book تیار کی، یہ کتاب کھال پر تیار کی گئی تھیں۔غالبًا کھالوں کے ٹکڑوں کو انڈے کے مصالحے سے سیا جاتا تھا۔(5) مڈل ایج Christian Era 400-1500 میں عیسائی پادریوں نے (Manuscript Culture) مسودہ کلچر پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی۔ اس دور میں کتابوں کو سجایا اور سنوارا جاتا تھا اور دھاتوں سے جوڑا جاتا تھا، پادری اور راہب کتابوں کی تیاری میں خصوصی دلچسپی لیتے تھے انہیں اسی بناء پر پہلا پیشہ ور تاریخ نویس بھی قرار دیا جاتا ہے۔ان باقاعدہ پادریوں نے نقش ونگار کے ذریعے اس زمانے کے مذہبی احکامات اور فلسفہ کے ابتدائی اسباق کو کتابوں کی شکل میں منتقل کیا۔ یہ لوگ نقل نویس کہلاتے تھے۔نقل نویسیوں نے تاریخی واقعات کو محفوظ کرنے، نظریات کی ترویج اور کلچر کی نئی نسل کو منتقلی میں بنیادی کردار ادا کیا۔(6) کہا جاتا ہے کہ تاریخ نویسی میں عیسائی خیالات سے متصادم نظریات کو سنسر بھی کیا جاتا تھا۔یوں نسل انسانی ان باغیوں کے نظریات کے بارے میں جاننے سے محروم ہوگئی۔عہد وسطیٰ میں خوبصورت کتابیں شائع ہوتی تھیں جو کہ ہر صفحہ پر خوبصورت نقش ونگار پر مشتمل ہوتی تھیں۔ بعض کتابوں پر قیمتی دھاتوں مثلاً سونے اور چاندی سے نقش بنائے جاتے تھے اور کتابوں کے سرورق چمڑے کے ہوتے تھے۔ یہ کتابیں عوام کے لیے نہیں ہوتی تھیں کیونکہ رنگ بھری یہ کتاب ایک وقت میں ایک ہی تیار ہوتی تھی۔ چینیوں نے بلاک پرنٹنگ کے طریقہ کو ترقی دی۔ اس طریقے میں لکڑی کے حروف تہجی پر سیاہی لگا کر کاغذ کی شیٹ پر چھپائی کی جاتی تھی مگر اس طریقے میں بھی صرف چند کتابیں شائع ہوتی تھیں۔مگر چینیوں نے 1000ء سال پہلے اس طریقے میں نئی جدت پیدا کی۔ یورپ میں 1400 عیسوی میں پہلی بلاک پرنٹنگ کتاب منظر عام پر آئی، یوں کتاب کی اس اشاعت نے یورپ کی خواندہ متوسط طبقے کی ضروریات کو پورا کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔(7) چینی باشندوں نے Movable Type کو ترقی دی۔اس طریقے کی بناء پر لکڑی کے ٹکڑوں پر آسانی سے پرنٹنگ ہونے کے باعث تعداد واشاعت میں اضافہ ممکن ہوگیا۔

کوریا میں بھی 13ویں صدی میں یہ طریقہ اپنایا گیا، یورپ میں 1400 میں آزادانہ طور پر کتابوں کی باقاعدہ اشاعت شروع ہوئی۔ جرمنی میں Johannes Gotenberg نے 1453 سے 1456 کے درمیان میکینیکل پرنٹنگ پریس تیار کیا اور ایک ساتھ بہت سی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس طریقہ کے ذریعے لاطینی زبان میں بائیبل کی 200 جلدیں پہلی بار شائع ہوئیں۔ ان میں سے 21 جلدیں اب بھی دستیاب ہیں۔(8) یورپ میں 1400 اور 1500ء عیسوی کے درمیان پرنٹنگ پریس کا خاصا پھیلاؤ ہوا۔(9) اس زمانے میں ارسٹوکریٹ، شاہی خاندان، مذہبی رہنما، برسر اقتدار سیاسی رہنما ہی کتابیں خرید سکتے تھے۔ یوں کتابوں کی زیادہ اشاعت سے ان کی لاگت میں کمی آئی اور معیار بھی بہتر ہوا۔ لہٰذا پرنٹنگ پریس لگنے لگے، کتابوں کی اشاعت سے سماجی اور سائنسی علوم میں توسیع ہوئی اور جدید ثقافت کی ترویج کی ایک بہتر صورت وضع ہوئی۔ ممتاز مؤرخ Elizabeth Eienstien کا کہنا ہے کہ جب لوگوں نے ڈکشنری، بائیبل، کتابیں اور نقشے پڑھنا شروع کیے تو انہیں نئے نظریات کے جاننے کا موقع ملا اور نئے علوم سے واقفیت ہوئی۔ اطلاعات اور علم کے پھیلاؤ سے نئی نسلوں کے ذہنوں کو ایک تازگی ملی۔ امریکہ میں 1630 میں پرنٹ شاپ قائم ہوئی۔ 1740 میں امریکہ میں پہلا انگریزی کا ناول Pamela یا Virtue Rewarded شائع ہوا۔ بعدازاں اور کتاب The History of Young Lady شائع ہوئی۔ یہ کتاب نئی ابھرنے والے مڈل کلاس اور خصوصی طور پر خواتین میں مقبول ہوئی۔ پھر 1800 صدی میں کتابوں کی مانگ میں خوب اضافہ ہوا۔ وقت کے ساتھ ساتھ پرنٹنگ پریس تکنیک میں جدت آنے، کاغذ کے معیار کے بہتر ہونے سے کتابوں کی اشاعت میں حیرت انگیز اضافہ ہوا اور صنعتی انقلاب نے خواندہ مڈل کلاس کو ترتیب دیا۔ اس مڈل کلاس کی ترقی کے لیے علم بنیاد تھا اور علم حاصل کرنے کے لیے کتابیں ایک بنیادی ذریعہ تھیں۔ 20ویں صدی میں کتابوں نے سماجی وطبعی علوم کے احیاء میں ایک اہم اور بنیادی کردار ادا کیا۔ اگرچہ پہلی اور دوسری عالمی جنگوں میں معاشی انحطاط، ریڈیو اخبار اور جرائد کی اشاعت سے کتابوں کی اشاعت نسبتاً متاثر ہوئی مگر کتاب علم کے پھیلاؤ کا ذریعہ بنی۔(10) جب کتابوں کی اشاعت نے صنعت کی صورت اختیار کر لی تو بچوں، نوجوانوں، خواتین، کھیلوں، میڈیسن اور دیگر ہر موضوع پر کتابوں کی اشاعت نے تہلکہ مچا دیا۔(11) یوں کتابیں سماجی علوم کے احیاء میں ایک اہم ذریعہ

بن گئیں۔ سماجی علوم کو عام کرنے میں کتابوں کے بعد اخبارات کا کردار بھی اہم ہے۔ کتابوں کی اشاعت محدود ہوتی تھی مگر اخبارات عوام کے لیے شائع ہوتے ہیں، اس لیے زبان، تاریخ، اقتصادیات، سیاسیات، قانون، نفسیات اور سماجیات جیسے علوم کو پھیلانے اور انہیں عوام تک پہنچانے میں اخبارات کا کردار انتہائی اہم ہے۔ دنیا میں پہلا مطبوعہ خبرنامہ 1609 میں جرمنی سے شائع ہوا۔ اس اخبار کا نام Avisa Relation Oderzei Tune تھا۔ پھر دو سال بعد اسی طرح کا ایک خبرنامہ انگلستان کا پہلا 1611 میں نیوز فرام اسپین کے نام سے شائع ہوا (اردو صحافت کی تاریخ)۔ محمد عتیق صدیقی لکھتے ہیں کہ حضرت مسیح سے کوئی 751 برس پہلے رومن راج میں روزانہ ایک قلمی خبرنامہ جاری ہوتا تھا۔ برطانیہ میں 1660 میں لندن کا پہلا روزنامہ لندن نیوز ویکلی شائع ہوا۔ امریکہ میں سب سے پہلے خبریں زبانی طور پر خاندنوں سے خاندانوں، قبائل سے قبائل اور برادریوں میں منتقل ہوتی تھیں۔ صحافت کی تاریخ کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ خبریں، دیواری خبرنامے روم کی دیواروں پر چسپاں کیے جاتے تھے۔ پھر 15ویں صدی میں پرنٹنگ پریس کی ایجاد نے معاشرے کی اطلاعات وصول کرنے اور بھیجنے کی صلاحیت کو بہتر بنا دیا۔ علاوہ ازیں اخبارات روزانہ کی تاریخ کو مرتب کرنے کا فریضہ انجام دینے لگے۔ 1765 میں امریکہ سے 30 جرائد شائع ہو رہے تھے۔ 1785 میں امریکہ سے پہلا روزنامہ شائع ہوا۔ اس وقت امریکہ سے دو طرح کے اخبار شائع ہوتے تھے۔ ایک سیاسی اور دوسرے تجارتی ہوتے تھے۔ یوں 1700 سے 1800 تک ان اخبارات کی اشاعت 1500 تک پہنچ گئی۔ شروع میں ریڈرشپ صرف تعلیم یافتہ طبقہ اور امراء تک محدود تھی، جو مقامی سیاست اور تجارت کنٹرول کرتے تھے مگر صنعتی انقلاب کے بعد اخبارات کی قیمتیں کم ہوگئیں اور متوسط طبقے کے پھیلاؤ کی بدولت اخبارات کی اشاعت بڑھی اور خواندگی کی شرح میں اضافہ ہوا۔ پرنٹنگ پریس کی ٹیکنالوجی سستی ہونے کی بناء پر اخبارات کی قیمتیں کم ہوئیں اور Penny Press وجود میں آیا۔ اس طرح اخبارات میں انسانی دلچسپی کے مواد کی اشاعت میں اضافہ بھی ہوا۔() برصغیر میں پرتگیزی تاجروں نے اکبر بادشاہ کے دور میں گوا میں پرنٹنگ پریس لگایا چونکہ مغل بادشاہوں کو تعلیم اور سائنس سے کوئی دلچسپی تھی نہ وہ صنعت کی اہمیت سے آگاہ تھے، سو پرنٹنگ پریس کو ہندوستانی معاشرے میں قبولیت کا درجہ حاصل نہ ہوسکا اور کتابوں کی اشاعت بھی محدود رہی۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں

ہاتھ سے تحریر کردہ اخبار شائع ہوتا تھا جس کی تعداد محدود تھی۔اس میں صرف دربار کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ برصغیر میں جدید تعلیمی ادارے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور حکمرانی میں قائم ہوئے اور اخبارات کا ادارہ بھی کمپنی کے دور میں ہی قائم ہوا۔جیمس آگسٹ ہکی نے 29 جنوری 1780 کو انگریزی کا پہلا اخبار کلکتہ جنرل ایڈورٹائزز شائع کیا۔ انگریزی کا ایک اخبار کلکتہ گزٹ 4مارچ1785 کوشائع ہوا۔اس کے ایڈیٹر فرانسیس گلبڈون تھے۔()مسٹر گلبڈون نے مغل بادشاہ شاہجہاں کے ذاتی حکیم محمد عبداللہ کی کتاب الفاظ الادویہ کا انگریزی ترجمہ 1793 میں شائع کیا۔انہوں نے میڈیکل ڈکشنری بھی مرتب کی،ان دونوں کتابوں کی قیمت اس وقت 30,30 روپے تھی۔مسٹر گلبڈون نے شرع محمدی کی ایک لغت ڈکشنری آف محمڈن لاءاور سسٹم آف ریوینیو اکاؤنٹس کے نام سے کتاب لکھی اور انگریزوں کو ہندوستانی علوم سے آگہی ہوی۔()1788 میں ایشیاٹک ریسرچز Asiatic Researches کے نام سے ایک رسالہ شائع ہوا۔رسالے میں ترجمے، شاعری، طبع زاد مضامین، اقتباسات وغیرہ شائع ہوتے تھے۔ ہندوستان میں اٹھارویں صدی میں فارسی،اردو اور مقامی زبانوں کے اخبارات شائع بھی ہونے لگے۔''جام جہاں نما'' اردو کا پہلا اخبار اور ''مراۃ الاخبار'' فارسی میں شائع ہوا۔معروف ریفارمر راجہ رام موہن رائے نے اپنے اخبارات کے ذریعے انگریزی تعلیم کو عام کرنے،ستی کی رسم کے خاتمے کے لیے کوششیں کیں۔راجہ صاحب کی کوششوں سے لوگوں میں پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔رام موہن رائے نے سماج سدھار اور مذہبی اصلاح کے لیے انجمنیں بنائیں۔انہوں نے جدید عصری تصورات کے مطابق کام کرنے کی کوشش کی۔()ہندوستان میں اخبارات کی اشاعت سے جدید تعلیم حاصل کرنے،جدید طرزِ زندگی اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ انگریز راج کے خلاف نفرت پیدا ہوئی جس کا اظہار 1857ء کی جنگِ آزادی میں ہوا۔سرسید احمد خان نے اپنے رسائل واخبار ''سائنٹیفک سوسائٹی'' اور ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعے برصغیر کے مسلمانوں کو علمی،مذہبی،معلوماتی، سیاسی مسائل اور سائنسی مضامین کی اشاعت کی جس کے ذریعے نئی معلومات سے روشناس کرنے کی ایک کوشش کی۔سرسید نے ان رسائل کے ذریعے آسان اور سادہ اردو تحریر کرنے اور سائنسی طرز فکر کو عام کرنے کی کوشش کی جس کو ان کا فرنگی طریقہ کہا گیا۔

20 ویں صدی میں ہندوستان سے شائع ہونے والے انگریزی، اردو، ہندی اور دوسری

مقامی زبانوں کے اخبارات نے تعلیم کو عام کرنے، قومی اور بین الاقوامی صورتحال سے دنیا میں ہونے والی نئی تبدیلیوں اور نوآبادیاتی دور کے نقصانات سے آگاہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ 20ویں صدی کے پہلے عشرے میں مولانا ابوالکلام آزاد اور حسرت موہانی کا نام ان صحافیوں میں نمایاں ہے جنہوں نے اپنے اخبارات کے ذریعے عوام میں سیاسی شعور بیدار کرنے کا فریضہ انجام دیا اور بین الاقوامی سیاست، جدید سائنسی اور سماجی علوم میں ہونے والے تبدیلیوں کو بھی اپنے اخبارات کے بنیادی ایجنڈے میں شامل کیا۔ اس طرح مولانا ابوالکلام آزاد کا اخبار الہلال اور البلاغ جدید صحافت کی شکل تھی۔ الہلال میں مضامین، تجزیے اور تصاویر شائع ہوتی تھیں۔ مولانا آزاد ہندوستان کی آزادی کے مقصد کو ہمیشہ ترجیح دیتے تھے مگر ان کی خوبصورت تحریریں اور مضامین کا انتخاب، ان کی ادارت اور سرخیاں قارئین کو نئی معلومات فراہم کرتی تھیں۔ مولانا حسرت موہانی کا اخبار ''اردو معلیٰ'' بہت مختصر مدت کے لیے شائع ہوا لیکن اس میں شائع ہونے والے مضامین اور شاعری قاری کی معلومات میں اضافہ کرتی تھی۔ جو لوگ انگریزی سے نابلد تھے وہ اپنی مادری زبان میں معلومات حاصل کرتے تھے۔ 20ویں صدی میں ہندوستان سے انگریزی، اردو، ہندی اور دوسری زبانوں کے معیاری اخبار اور رسائل شائع ہوئے۔ ان اخبارات و رسائل نے تعلیم پھیلانے، لوگوں کے خیالات تبدیل کرنے اور انہیں جدید طرز زندگی سے روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔

پاکستان کے قیام کے وقت اخبارات کا بڑا مرکز لاہور تھا اور پاکستان کا دارالحکومت کراچی بننے کے بعد کراچی سے انگریزی، اردو، سندھی اور بنگالی زبان میں اخبارات شائع ہوئے۔ لاہور سے شائع ہونے والے اخبارات روزنامہ پاکستان ٹائمز، روزنامہ امروز نے عوام کو جمہوریت، انسانی حقوق، مزدوروں، کسانوں، خواتین کے حقوق سے روشناس کرانے کا فریضہ انجام دیا۔ ان اخبارات نے آزدیٔ صحافت، علمی آزادی کے اداروں کے لیے فضاء ہموار کرنے کی۔ یوں دنیا میں آنے والی تبدیلیوں، ادب، اقتصادیات، سیاسیات، تعلیم، سماجیات، نفسیات اور سائنسی شعبوں میں ہونے والی تبدیلیوں کو عام کرنے میں ان کا کردار اہم رہا۔ کراچی سے شائع ہونے والے اخبارات روزنامہ ''ڈان''، ''جنگ''، ''انجام'' وغیرہ نے تعلیمی شعور پیدا کرنے، دنیا میں مختلف شعبوں میں ہونے والی تبدیلیوں کو اپنی خبروں، آرٹیکلز اور اداریوں کے ذریعے لوگوں تک پہنچایا۔

ملک کے بڑے اخبارات خاص طور پر اردو میں شائع ہونے والے اخبارات مثلاً جنگ، مشرق، حریت، انجام نے اردو زبان کی ترویج کا فریضہ ادا کیا۔ 80ء کی دھائی میں پریس اینڈ پبلکیشنز آرڈیننس مجریہ 1963 کی منسوخی کے بعد رجسٹریشن آف پریس اینڈ پبلکیشنز آرڈیننس مجریہ 1988 نافذ ہوا۔ یوں اخبارات کے ڈیکلریشن آسانی سے ملنے لگے۔ بعد ازاں انفارمیشن ٹیکنالوجی نے اخباری صنعت کی لاگت کو کم کر دیا۔ اس صورتحال کے باعث جدید طریقہ پر سندھی اخبارات بھی شائع ہونے لگے۔ عوامی آواز پہلا اخبار تھا جو 1989ء میں کراچی سے کمپیوٹر پر شائع ہوا۔ اس سندھی اخبار نے سندھ میں سائنسی طرز فکر عام کرنے فرسودہ رسم ورواج کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا۔ جدید سندھی اخبارات کی اشاعت کی بناء پر خواندگی کی شرح بڑھی۔ سندھی معاشرے کی فرسودہ روایات مثلاً کاروکاری، قرآن سے شادی، پسند کی شادی کے حق، خواتین کے جائیداد میں حق کے حصول جیسے مسائل پر کھلا بحث ومباحثہ ہونے لگا۔ یوں نوجوانوں کو اپنے مسائل پیش کرنے کا موقع ملا اور سائنسی طرز فکر عام ہونے کے ساتھ جدید تعلیم حاصل کرنے کے رجحان کو بھی تقویت ملی۔ جمہوری شعور کے ساتھ صنعتی شعور بھی بیدار ہوا۔ سندھی اخبارات کے اس تاریخی کردار نے سندھی معاشرے کی سمت کو درست کر دیا۔ اس وقت پاکستان میں مختلف زبانوں کے۔۔۔۔۔ اخبارات شائع ہو رہے ہیں جن کی کل اشاعت 20 لاکھ کے قریب ہے۔ ممتاز ادارہ انٹرمیڈیا کی تحقیقاتی رپورٹ کے مطابق کل آبادی کا 25 فیصد حصہ اس وقت اخبارات کا مطالعہ کرتا ہے۔ ناخواندگی، اخبار خریدنے کی استطاعت نہ رکھنے، مطالعہ کی عادت نہ ہونے کی بناء پر یہ تعداد کم ہے۔

اخبارات میں حالات حاضرہ کے لیے سیاسیات، اقتصادیات، سماجی صورتحال، صحت وغیرہ کے بارے میں خبریں، آرٹیکل، ایڈیٹوریل وغیرہ تفصیلی طور پر شائع ہوتے ہیں۔ خاص طور پر انگریزی اخبارات میں سماجی علوم کے بارے میں معیاری مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اردو کے اخبارات میں معیاری آرٹیکلز کی اشاعت کے اعتبار سے انگریزی اخبارات میں سماجی علوم سے متعلق زیادہ معیاری آرٹیکلز شائع ہوتے ہیں۔ 1920ء میں ریڈیو ذرائع ابلاغ کے ایک نئے ذریعے کے طور پر وجود میں آیا۔ ریڈیو نے حالاتِ حاضرہ کے علاوہ زبان، ادب، شاعری، فنون لطیفہ کو عام کرنے اور کلچر کو نئی نسل تک منتقل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بیٹری سے چلنے والے

ٹرانسسٹرز ریڈیو کی ایجاد نے آواز کی لہروں کے ذریعے عام آدمی کا ہزاروں میل دور اسٹوڈیو میں بیٹھے دانش ور کے ساتھ رشتہ جوڑ دیا۔ پہلے میڈم ویوز اور شارٹ ویوز کے ذریعے آواز کا رشتہ قائم ہوتا تھا پھر ایف ایم Frequency modulation کے انقلاب نے تہلکہ مچا دیا۔ FM ریڈیو نے مختلف علاقائی زبانوں کو عام کرنے، خواندگی کی عمومی شرح بڑھانے، نوجوانوں کو دیگر زبانوں کے ادب، شاعری اور سماجی علوم کی طرف راغب کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن (PBC) کے ریڈیو اسٹیشنوں کے حکومت کے زیر اثر ہونے سے سے نشر ہونے والے پروگراموں کا بیشتر حصہ مذہبی پروگراموں، حالات حاضرہ، موسیقی اور ڈراموں پر مشتمل ہوتا ہے مگر پروگراموں کے سننے والے سامعین کی تعداد بھی خاصی ہے۔ پڑوسی بھارت میں 80 کی دھائی میں ریڈیو سے نوجوانوں کی جنسی تربیت کے لیے پروگرام کیے گئے جو خاصے مقبول ہوئے۔ اسی طرح ریڈیو پاکستان کے ذریعے زرعی موضوع پر ہونے والے پروگراموں نے کسانوں کی تربیت کا فریضہ بخوبی انجام دیا۔ پاکستان میں اس وقت ایف ایم ریڈیو اسٹیشنوں کی تعداد 170 ہے۔ یہ ریڈیو اسٹیشن سندھ، پنجاب، پختون خواہ اور بلوچستان کے محدود علاقوں تک آواز پہنچاتے ہیں۔ ریڈیو کو سماجی علوم کے مختلف موضوعات مثلاً اقتصادیات، سماجی اور نفسیاتی مسائل کے حل کی آگہی کے لیے استعمال کیا جائے تو سماجی علوم پڑھنے والے افراد کی تعداد بڑھ سکتی ہے جس سے معاشرے میں برداشت، تحمل اور سماجی اور سیاسی رواداری جیسی عادات پیدا ہو سکتی ہیں۔ 60 کی دھائی میں ٹیلی وژن پاکستانیوں کے گھروں میں داخل ہوا تو بچوں، بڑوں، بوڑھوں، عورتوں اور مردوں کا ٹی وی کے ذریعے دنیا بھر سے رابطہ ہوا۔ ٹی وی خبروں، حالات حاضرہ، ڈراموں، موسیقی، ادب، سائنس، سماجیات، کھیلوں غرض ہر شعبے کے لیے معلومات کا ذریعہ بن گیا اور معاشرے کے Vision علم و شعور میں بھی اضافہ ہوا۔

امریکہ میں 1800 میں ٹی وی ٹیوب اور 1927ء میں ٹی وی پکچر کامیاب ہوئی۔ 1934ء میں امریکہ کے شہر۔۔۔۔۔ سے عوام کے سامنے ٹی وی کی نشریات پیش کرنے کا کامیاب تجربہ ہوا۔ پھر 1960ء میں امریکہ کے پہلے بین الاقوامی ٹیلی کمیونکیشن سیٹلائٹ نے ٹیلی وژن کی نشریات (جو کہ ایک جدید سائنسی انقلاب تھا) پیش کر دیں۔ 1975ء میں ٹی وی کیبل نیٹ ورک قائم ہوا جس نے عام ناظر کو بے شمار چینل دیکھنے کی سہولت فراہم کی۔ 2009ء میں ٹی وی سگنلز

Digital System پر منتقل ہو گئے۔

پاکستان میں 1960ء میں ٹی وی کی نشریات شروع ہوئیں۔ 70 کی دھائی میں ٹی وی کی کلر نشریات کا آغاز ہوا۔ پھر قومی نشریاتی رابطہ پر ٹی وی کے تمام اسٹیشنز سے منسلک ہوئی۔ پی ٹی وی نے خبروں، حالاتِ حاضرہ کے علاوہ ادب، کلچر اور مختلف زبانوں کو عام کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح صوبائی ثقافت سے چاروں صوبوں کے عوام متاثر ہوئے۔ علاوہ ازیں خواتین کے حالات کار کے بارے میں بھی ٹی وی نے آگہی پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ 2002ء میں حکومتی اثرات سے آزاد ہو کر نجی ٹی وی چینلز کا آغاز ہوا۔ اس وقت ملک میں اندازاً 96 نجی ٹی وی چینلز کام کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں بھارتی، امریکی اور SAARC ممالک کے ٹی وی چینلز کی نشریات نے پاکستانی عوام کو آگاہی کے نئے تجربات سے آشنا کیا۔ اس طرح ٹی وی نے گلوبل معاشرے Global Media کے قیام میں اہم کردار ادا کیا۔ ایک مقامی سروے کے مطابق پاکستان کی 81 فیصد آبادی ٹی وی نشریات دیکھتی ہے۔

فلم (FILM) کے آغاز نے معاشرے کی فکر و سوچ پر نئے سماجی اور ثقافتی اثرات ڈالے۔ فلم کے ذریعے لوگوں کو ایک ساتھ جمع ہونے اور فلم بینوں کو نئے تجربات سے آشنا ہونے کا موقع ملا۔ کہا جاتا ہے کہ کہانی نویسوں Story Tellers کے لیے فلم ایک انتہائی ذریعہ ثابت ہوا اور مختلف علاقوں کا کلچر دنیا کے مختلف حصوں تک پہنچ گیا۔ عالمی قدروں اور انسانی رویوں پر مبنی فلموں کے دیکھنے والوں کو نئے تجربات دیکھنے کا موقع ملا۔ تاریخی واقعات، نفسیاتی، اقتصادی اور سماجی موضوعات پر مبنی فلموں نے ناظرین کی تربیت کا فریضہ بھی انجام دیا۔ فلم کی ٹیکنالوجی میں آنے والی جدید تبدیلیوں (modernisation) نے فلم کے ذریعے ابلاغ کو زیادہ مؤثر بنا دیا۔ امریکہ میں پہلی فلم 1888ء میں بنی۔ 1896ء میں امریکہ میں بڑی اسکرین پر فلم دیکھنے کا تجربہ ہوا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد 1947ء میں ہالی وڈ میں کمیونسٹوں کے حامیوں کی تلاش کے لیے ایک کمیٹی قائم ہوئی۔ اس زمانے کے مزاحیہ اداکار چارلی چیپلن پر بھی کمیونسٹ ہونے کا الزام لگایا گیا۔ 1920ء سے پہلے خاموش فلمیں بنتی تھیں مگر پھر ساؤنڈ سسٹم کی ٹیکنالوجی میسر ہونے سے اداکاروں کی آوازیں دیکھنے والوں کو سنائی جانے لگیں۔ ہندوستان میں 1920ء سے فلمیں بننا شروع ہوئیں۔ (ہندوستان کی پہلی بولتی فلم عالم آرا تھی)۔ ہندوستان میں بننے والی فلموں نے

ہندوستانی کلچر کو بھی عام کیا اور ہندوستانی تہذیب وتمدن کو دوسرے علاقوں کے علاوہ بیرون ہندوستان متعارف کیا۔ گلوبل سینما کا دور آیا۔ اس دوران ہالی وڈ کے علاوہ برطانیہ، ہانگ کانگ، کوریا، آسٹریلیا، کینیڈا، فرانس، جرمنی، اٹالین، چین اور سوویت یونین کی فلمیں دنیا بھر میں مقبول ہوئیں۔

پاکستانی فلم انڈسٹری 1947ء کے بعد ترقی کی راہ پر گامزہ ہوئی مگر بھارتی فلموں پر پابندی کے بعد چربہ فلموں کا آغاز ہوا۔ یوں مذہبی احکامات، فرسودہ خیالات، موسیقی اور فن کو اہمیت نہ دینے کی بناء پر پاکستانی فلمی صنعت خاطر خواہ ترقی نہ کرسکی اور نتیجتاً بھارتی فلموں نے پاکستان کی فلمی مارکٹ پر قبضہ کرلیا۔ برسراقتدار حکومتوں کی پالیسیوں کی بناء پر پاکستانی فلمی صنعت زوال پذیر ہوئی (مگر سائنس کے مختلف موضوعات پر فلمیں بنا کر عوام کے شعور کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے)۔ انٹرنیٹ کی دریافت نے معلومات اور اطلاعات کی راہ میں رکاوٹیں ختم کردیں۔ اب گوگل سرچ انجن، یوٹیوب، فیس بک اور ٹیوٹر کے دور میں دنیا انفارمیشن سپر ہائی وے میں تبدیل ہوچکی ہے اور انٹرنیٹ نے زبان، کلچر، سماجی، سائنسی علوم کے احیاء میں جو کردار ادا کیا ہے وہ واضح اور روشن ہے اور جدیدیت کی بہترین مثال ہے جس سے ابلاغ میں مفید فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

بعض ملکوں میں مستقبل یاتی صحافت Futurative Journalism کے نام سے کام کیا جارہا ہے۔ پاکستان میں اس پر اول تو کام ہی نہیں ہوا اور اگر کہیں ہوا بھی ہے تو ابھی تو ابتدائی اقدامات اور اولین منزل پر ہے اور کوئی واضح قومی لائحہ عمل کی غیر موجودگی میں کسی ترقی کی امید نہیں کی جاسکتی۔ اقتصادی ترقی، مستقبل کی پیش بینی اور منصوبہ بندی وہ ضرورتیں ہیں جو کہ صحافتی اور معاشرتی ذمہ داری social responsibilities کے طور پر ادا کیا جانا چاہیے۔ اس subject کو نہ صرف نصاب میں شامل کیا جانا چاہیے بلکہ عملی اقدامات کے لئے بھی استعمال کیا جانا چاہیے۔ سماجی خرابیوں میں سے ایک خرابی مختلف قسم کی Cooperation بھی ہے خواہ وہ اقتصادی ہو یا سیاسی بہرحال اس کا تعلق معاشرہ کے اندرونی طبقات اور سماجی رویوں سے بھی ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں ابلاغ عامہ Gate Keeper کے فرائض انجام دے سکتی ہے اور معاشرے اور سماج کے اندر تبدیلی کی لہر پیدا کی جاسکتی ہے اور جدیدیت کی فتح کی جانب سفر جاری ہوسکتا ہے۔

پھر جدیدیت کی حامل ٹیکنالوجی نے ابلاغ اور سماجی علوم کے بڑھاوے میں جس تیزی سے ترقی کی اس نے ساری دنیا سمیت پاکستان میں بھی Computer Technology کے استعمال کو ضرورت بنا دیا ہے اور ابلاغ کے نئے نئے ذرائع مثلاً Internet، Facebook، Twitter رائج ہوئے۔ خصوصاً کراچی میں اس سلسلے میں 1989 میں سندھی زبان کا ''عوامی آواز'' نامی اخبار پہلی بار مکمل طور پر Computer Technology کے ذریعہ شائع کیا گیا۔ پاکستان میں اس وقت FM ریڈیو کے باقاعدہ 131 اسٹیشنز ہیں۔ علاوہ ازیں اس FM ٹیکنالوجی کے ذریعہ سے جو کہ Mobile Phone میں حکومتی ریگولیٹری ادارہ PEMRA کے مطابق بچے بچے کے ہاتھ میں نظر آتا ہے۔ اپنے پروگراموں کے ذریعہ اطلاعات، معلومات، تعلیم اور انٹرٹینمنٹ کی نئی دنیا آباد کی ہے چونکہ ریڈیو ایک سمعی ذریعہ ہے اس کو سننے کیلئے کسی تعلیم یا علم کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے ایک دیہاتی بھی اپنے گاؤں میں اوباما کے الیکشن، کراچی ٹارگٹ کلنگ اور لندن اسٹاک ایکسچینج کے ریٹ کی جدید ایجاد سے واقف ہوتا جارہا ہے اور اس کے ذریعہ اس کے سیاسی شعور، سماجی مزاج، کلچر اور بین الاقوامی معلومات میں بھی اضافہ ہورہا ہے۔

صحافت کی باقاعدہ تعلیم کے بارے میں مختلف قسم کے نظریات پائے جاتے ہیں۔ بعض سینئر صحافیوں کا کہنا ہے کہ صحافی بننے کے لیے سماجی علوم اور حالاتِ حاضرہ کے مطالعے کے ساتھ انگریزی اور مقامی زبانوں میں عبور بھی ہونا ضروری ہے۔ ان صحافیوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ برصغیر کے نامور صحافیوں کے پاس صحافت یا کسی اور شعبے کی سند نہیں تھی، وہ اس ضمن میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی وغیرہ کی مثالیں دیتے ہیں جنہوں نے صحافت کے عالمی معیار کو برصغیر میں رائج کیا اور آزادئ صحافت کے لیے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ سینئر صحافی قیامِ پاکستان کے بعد ملک کے نامور صحافیوں فیض احمد فیض، حمید نظامی، الطاف حسین، مظہر علی خان اور خاص طور پر چراغ حسن حسرت، احمد ندیم قاسمی، سبط حسن وغیرہ کے حوالے دیتے ہیں جنہوں نے صحافت کی باقاعدہ تعلیم حاصل کیے بغیر صحافت کے معیار کو بلند کرنے اور آزادئ صحافت کے تحفظ کے لیے ایسی روایات قائم کیں کہ بعد میں آنے والے صحافیوں نے ان روایات پر عمل کرنا صحافت کی آبرو کے لیے ضروری سمجھا۔ قیامِ پاکستان سے قبل پنجاب یونیورسٹی میں صحافت میں ڈپلومہ شروع ہوا۔ بعد میں یہ ڈپلومہ ڈگری میں تبدیل ہوگیا۔ کراچی

یونیورسٹی میں 60ء کی دھائی میں صحافت میں ایم۔اے کا دوسالہ کورس شروع ہوا۔اس زمانے میں صحافت صرف اخبارات تک ہی محدود تھی۔ملک کے واحد سرکاری ریڈیو میں حکومت کی سخت پالیسی کے تحت خبریں مرتب کی جاتی تھیں،اس لیے ریڈیو جرنلزم کو 50 برسوں تک اہمیت نہیں ملی۔کراچی اور پنجاب یونیورسٹیوں میں پڑھائے جانے والے دوسالہ ڈگری کورس کا نصاب انگریزی اور اردو زبانوں کی تدریس، برصغیر کی تاریخ، رپورٹنگ اور سب ایڈیٹنگ، ابلاغ کے نظریات، ابلاغِ عامہ میں تحقیق، تعلقات عامہ اور اشتہارات کے مضامین پر مشتمل ہوتا تھا۔ پھر جب کراچی یونیورسٹی میں بی اے آنرز میں صحافت کا تین سالہ کورس شروع ہوا تو پرانے مضامین ہی کی تدریس پر اکتفاء کیا گیا۔ایم اے اور بے اے آنرز کے اس نصاب میں بیشتر مضامین نظری صحافت پر مشتمل تھے اور عملی مضامین کا حصہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ پھر صحافت کو درپیش چیلنجز خاص طور پر جمہوری نظام میں صحافت کے کردار، بنیادی انسانی حقوق، صحافت سے متعلق قوانین اور صحافتی اخلاقیات پر کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی مگر جب کراچی یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی اور نئی یونیورسٹیوں میں قائم ہونے والے صحافت کے شعبوں کو Mass Communication میں تبدیل کیا گیا تو ریڈیو ٹیلی وژن صحافت کے ساتھ ساتھ صحافتی قوانین، صحافتی ضابطۂ اخلاق اور معاون ترقیٔ ابلاغ جیسے نئے مضامین نصاب میں شامل کیے گئے۔ پھر نظری مضامین سے زیادہ عملی مضامین رائج کرنے پر شعبہ صحافت کے سینئر اساتذہ میں ایک بحث شروع ہوئی۔ان شعبوں کے بعض سینئر پروفیسروں کا یہ مؤقف تھا کہ طالب علموں کو مسلمانوں کی تاریخ اور ابلاغی نظریات کا علم ہونا ضروری ہے کیونکہ جو طالب علم عملی صحافت کا پیشہ اختیار کرتا ہے وہ عملی کام تو سیکھ سکتا ہے مگر نظریاتی معاملات کو اس کو پھر کبھی سیکھنے کا موقع نہیں ملتا اس لیے نصاب میں نظری مضامین کا حصہ زیادہ ہونا چاہئے۔ یہ سینئر اساتذہ جمہوریت اور صحافت کے باہمی ربط، عوام کے بنیادی حقوق اور ذرائع ابلاغ کے کردار کے تعلق کی اہمیت کو بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔اسی طرح یہ اساتذہ صحافتی تنظیموں اور پریس کلب کے آزادیٔ صحافت کے تحفظ اور صحافیوں کے حالات کار کو بہتر بنانے کی جدوجہد کو بھی نصاب میں جگہ دینے پر غور نہں کرنا چاہتے تھے۔ یوں ابلاغِ عامہ کے شعبوں اور سماجی سائنس کے بنیادی مضامین میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔نئی صدی کے آغاز کے ساتھ ہی اعلیٰ تعلیم میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن (U.G.C) کو نئی شکل دے کر ہائر ایجوکیشن کمیشن

(H.E.C) میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ملک میں نجی شعبے کو ریڈیو اور ٹیلی وژن چینل قائم کرنے کی اجازت مل گئی۔ نجی شعبے میں قائم ہونے والے ایف ایم ریڈیو اور ٹیلی وژن چینل کی نشریات نے جغرافیائی سرحدوں کو بے بس کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ملک کی 22 سے زائد سرکاری یونیورسٹیوں اور غیر سرکاری یونیورسٹیوں میں ابلاغِ عامہ Mass Communication اور میڈیا سائنس Media Science کے شعبے قائم ہوئے۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن نے بی ایس کا چار سالہ پوسٹ گریجویٹ کورس، 2 سالہ ایم ایس/ ایم فل اور 2 سالہ پی ایچ ڈی کے کورسز لازمی کر دیئے ہیں۔ بی ایس کے علاوہ ایم اے کا دو سالہ کورس بھی جاری رہا۔ ایچ ای سی نے یونیورسٹی کے لیے سالانہ امتحانی طریقہ کار کے بجائے سیمسٹر سسٹم کو لازمی قرار دے دیا۔ ایچ ای سی نے اردو، انگریزی، کمپیوٹر، اسلامیات، مطالعہ پاکستان اور شماریات (Statistics) کے مضامین کو بھی لازمی قرار دے دیا۔ یوں بی ایس کا چار سالہ پروگرام 40 مضامین پر محیط ہوا۔ اس ابلاغِ عامہ سے متعلق 25 مضامین کی تدریس کی گنجائش پیدا ہوئی۔ 2002ء سے 2013ء تک نصاب کی تیاری میں ریاستی کردار محدود ہوا، یونیورسٹیوں کے تین بنیادی اداروں شعبہ کے بورڈ آف اسٹڈیز، فیکلٹی بورڈ اور اکیڈمک کونسل کو نصاب کی تیاری میں مکمل خودمختار قرار دیا گیا۔ یونیورسٹیوں کے ان تینوں اداروں کے اراکین کا تعلق اساتذہ برادری سے رہا مگر رجعت پسندی کے تابع اساتذہ نے ابلاغِ عامہ کے نصاب کو عملی طور پر جدید اور سیکولر بنانے پر توجہ نہیں دی۔ ایک جمہوری معاشرے میں ذرائع ابلاغ کی اہمیت بنیادی، انسانی حقوق خاص طور پر خواتین، بچوں اور اقلیتوں کے حقوق میں میڈیا کے کردار خبروں میں معروضیت، امن وصحافت Photo Journalism Peace Journalism جیسے سوشل میڈیا۔۔۔۔ جیسے مضامین کو نصاب میں شامل کرنے کی اہمیت محسوس نہیں کی گئی۔ ملک کی مختلف یونیورسٹیوں خاص طور پر ملک کی سب سے بڑی پنجاب یونیورسٹی اور کراچی یونیورسٹی کے ایم ایس سی میڈیا سائنس کے دو سالہ پروگرام کے چاروں سمسٹر کی اسکیم آف اسٹڈیز کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ جمہوریت اور میڈیا، انسانی حقوق اور میڈیا، امن صحافت Peace Journailsm وغیرہ کے مضامین شامل نہیں ہیں۔ اسی طرح 2002ء میں قائم ہونے والی سرگودھا یونیورسٹی کے ایم اے دوسالہ پروگرام کے 4 سمسٹروں پر مشتمل نصاب میں جدید مضامین شامل نہیں ہیں۔ نیشنل

یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز National University of Modern Languages کے ایم ایس سی ابلاغِ عامہ کے دوسالہ پروگرام کے نصاب کے مقاصد بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس نصاب کا مقصد To train Mass Communicators اس نصاب میں سوشل میڈیا، Online Journalism، Development Communication، ڈیجیٹل ایڈورٹائزنگ وغیرہ کے مضامین شامل کیے گئے ہیں مگر جمہوریت اور میڈیا، بنیادی انسانی حقوق اور میڈیا سے متعلق کوئی مضمون شامل نہیں۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن کے تحت مارچ 2013ء میں لاہور میں ہونے والے 22 یونیورسٹیوں کے ابلاغِ عامہ کے شعبوں کے سربراہوں کے نصاب کے بارے میں ہونے والے اجلاس میں انسانی حقوق اور میڈیا، صحافت برائے امن اور فوٹو جرنلزم وغیرہ کے نئے مضامین شامل کرانے کی تجویز پیش کی گئی تھی مگر اس اجلاس میں ان مضامین کو بطور ضمنی مضامین ابلاغِ عامہ کے نصاب میں شامل کرنے پر اتفاق رائے کیا گیا۔ جب تک ابلاغِ عامہ کا نصاب سیکولر بنیادیوں پر تیار نہیں ہوگا، اس نظام میں جمہوریت اور میڈیا اور انسانی حقوق کی ترویج میں میڈیا کے کردار اور صحافتی ضابطہء اخلاق پر مشتمل مضامین شامل نہیں ہونگے۔ ابلاغِ عامہ کے ڈگری یافتہ نوجوان نہ تو میڈیا انڈسٹری میں کوئی اہم کردار ادا کرسکیں گے نہ میڈیا کا جمہوری نظام کے استحکام اور ایک لبرل اور سیکولر معاشرے میں کردار ہوگا۔ یوں انتہاپسندی پروان چڑھے گی۔

پاکستان میں سماجی علوم کی ابتر ہوتی صورتحال

مقتدا منصور

ابتدائیہ:

پاکستان میں سماجی علوم کی ابتر ہوتی صورتحال پر گفتگو کرنے سے پہلے ہمیں مثبت حقیقت پسندی کے نمائندہ فلسفی برٹرینڈ رسل کی اس بات کو ذہن میں رکھنا ہوگا کہ " جیسے جیسے دنیا میں ہنر مندی(Skills) میں اضافہ ہورہا ہے، حکمت ودانشمندی(Wisdom) میں کمی آرہی ہے"۔ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ دنیا کی ترقی میں جہاں سائنس وٹیکنالوجی نے اہم کردار ادا کیا ہے، وہیں سماجی علوم نے سماجی تشکیلات اور انسانی فکری رویئوں کی تربیت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔اس لئے انسانی معاشروں کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ تعلیم کا مقصد صرف کسبی ہے یا اس سے بڑھ کر بھی کچھ ہے۔

کارل مارکس نے کہا تھا کہ "ذرائع پیداوار انسانی معاشروں کے سیاسی، سماجی اور فکری رجحانات کا تعین کرتے ہیں"۔یہی سبب ہے کہ انسان کی صدیوں پر محیط جدوجہد اور ذہنی، علمی، ثقافتی، سماجی، سیاسی اور معاشی ارتقاء کا منطقی نتیجہ چار سو برس پہلے صنعتی انقلاب کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جس نے ذرائع پیداوار کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا۔مشین کی ایجاد نے ذہنی قوت کی جسمانی طاقت پر کئی گنا برتری قائم کردی۔مشین کی وجہ سے انسان، انسانی یا حیوانی طاقت کا سہارا لئے بغیر پیداوار میں حسب منشا اضافہ اور اسکے معیار کو بہتر بنانے پر قادر ہوا۔معاملہ صرف ذرائع پیداوار میں حسب ضرورت تبدیلی تک محدود نہیں تھا، بلکہ صنعتی انقلاب نے انسانی معاشروں میں صدیوں سے جاری سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی ڈھانچوں کو بھی منہدم کر کے نئے سیاسی وسماجی نظام کی بنیاد رکھی۔

اس میں شک نہیں کہ تمام علوم کا ارتقاء انسانی ارتقاء کے ساتھ شروع ہوا، مگر 19 ویں صدی میں جب نیچرل سائنسز نے ادارہ جاتی شکل اختیار کرنا شروع کی، تو Social Sciences کو علوم کے ایک الگ شعبہ کے طور پر منظّم کیا گیا۔

پس منظر:

قدرت (Nature) نے انسان کو تین ایسے خواص عطا کئے، جن کی وجہ سے وہ دیگر جانداروں خاص طور پر مامالیہ جن سے اس کا جنیاتی تعلق ہے، ممتاز وممیّز کیا۔ یہ خواص سوچنے والا دماغ، ہاتھ کی انگلیوں کی مخصوص ساخت اور ریڑھ کی ہڈی میں اتنی طاقت کہ وہ دو پیروں پر عموداً کھڑا ہوسکتا ہے۔ ان خواص کی وجہ سے انسانوں میں فکری ارتقاء کا عمل شروع ہوا۔ غور کرنے والے دماغ (Mind) نے انسان کو سوچنا سکھایا۔ انگلیوں کی مخصوص ساخت کی بدولت انسان نے ذہن میں جنم لینے والی سوچ کو عملی شکل دی۔ اس طرح انسان کے ذہنی ارتقاء کا یہ سفر جو کئی سوصدیوں پہلے شروع ہوا، اس کے نتیجے میں ایک طرف حکمت ودانشمندی میں اضافہ ہوا اور دوسری طرف ہنرمندی کی راہ ہموار ہوئی۔ انسان کی ذہنی صلاحیتوں میں اضافے نے اسے اپنی ذات، اپنے اطراف اور کائینات کے بارے میں غور وفکر اور نت نئے تجربات کرنے پر اکسایا۔

جب انسان کی تحقیقی اور تخلیقی صلاحیتوں کے نتیجے میں نت نئی ایجادات کا آغاز ہوا، تو دراصل یہ نیچرل سائنسز کی ابتدا تھی۔ ان ایجادات کے انسانی زندگیوں پر براہ راست اثرات مرتب ہونا شروع ہوئے اور طرز حیات میں تبدیلیاں رونماء ہونے لگیں۔ طرز حیات میں تبدیلی کے نتیجے میں سماجی ڈھانچوں میں وسعت آنا شروع ہوئی تو انسان کیلئے اپنے سماج اور اسکی تبدیل ہوتی حرکیات کو سمجھنے کا احساس پیدا ہوا۔ لہٰذا ایسے علوم متعارف کرائے جانے کی شدت سے ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ جن کی مدد سے ایک طرف سماجی حرکیات پر تحقیق ہوسکے اور اور دوسری طرف علمی بنیادوں پر نئے عمرانی معاہدوں کیلئے تشکیلات کی راہ ہموار ہوسکے۔ اس کے علاوہ تبدیل ہوتے معاشروں کیلئے نئے اصول وضوابط اور قوانین کی تیاری میں معاون ثابت ہوسکیں۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فطری سائنسی علوم نے تحقیق وتخلیق کی مدد سے انسانی معاشروں کو نئی سہولیات سے روشناس کرایا جبکہ سماجی علوم نے معاشروں کی تشکیلِ نو میں اہم کردار ادا کیا۔

انسان کے صدیوں کے ذہنی، تخیلاتی اور تخلیقی ارتقاء کا منطقی نتیجہ صنعتی انقلاب کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ابتدائے افرینش سے انسان نے اپنے لئے جو بھی سہولیات حاصل کیں، ان میں جسمانی طاقت اور محنت کا کلیدی کردار ہوا کرتا تھا، گو کہ یہ سہولیات ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہوا کرتی تھیں۔ مگر مشین کی ایجاد نے پورے پیداواری نظام کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ ذہنی قوت نے جسمانی قوت کی جگہ لے لی۔ یوں انسان نے اپنی ذہنی طاقت کے بل پر معمولی جسمانی طاقت کے اشارے پر بھاری بھرکم کام سرانجام دینا شروع کر دیئے۔ یوں صدیوں سے جاری ذرائع پیداوار تبدیل ہو گئے۔ کارل مارکس کا کہنا ہے کہ "ذرائع پیداوار سماجی، سیاسی اور فکری رجحانات کا تعین کرتے ہیں"۔ اس طرح ایک نئی معاشرت، نے جنم لینا شروع کیا، جس کے اپنے سیاسی، سماجی اور فکری تقاضے تھے۔ کہتے ہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے، پرانے پیداواری نظام سے نئے نظام کی طرف مراجعت کے نتیجے میں علم ایک اہم ترین ضرورت کے طور پر سامنے آیا۔ صنعتکاروں کو اگر ایک طرف اپنے کارخانوں کیلئے ہنرمند افرادی قوت درکار تھی، تو دوسری طرف ایسے عالی دماغ سائنس دانوں کی بھی ضرورت تھی، جو ان کی مشینوں اور پیداواری نظام کو مزید بہتر اور جدید بنا سکیں۔ ایسے معاشی ماہرین کی طلب پیدا ہوئی جو پیچیدہ ہوتی معیشت کی گتھیاں سلجھا سکیں۔ ایسے سماجی ماہرین کی ضرورت محسوس ہوئی جو سماج کے تبدیل ہوتے رجحانات کو ایک واضح سمت دے سکیں اور نئے عمرانی معاہدے ترتیب دے سکیں۔

علم و آگہی، جس کی بنیاد زمانہ قبل از تاریخ ہی رکھی جا چکی تھی، صنعتی انقلاب کے بعد معاشرے کے ہر طبقے کی ضرورت بنا۔ وہ طبقات جن کی ذمہ داری خدمت گذاری تھی اور علم تک جن کی رسائی غیر ضروری سمجھی جاتی تھی، انہیں بھی حصول علم کی طرف راغب کیا گیا، تاکہ زیادہ سے زیادہ ہنرمند افرادی قوت پیدا کی جا سکے۔ اس طرح ہر چھوٹے بڑے شہر میں نئے نئے تعلیمی ادارے قائم ہونا شروع ہوئے۔ ان اداروں میں مختلف فیکلٹیاں قائم ہوئیں، جن میں تحقیق و تجربہ کی سہولیات مہیا کی گئیں۔ یوں سولہویں صدی سے نیچرل اور سوشل سائنسز نہ صرف ایک دوسرے سے الگ ہوئیں، بلکہ علم کی ہر شاخ کے درجنوں شعبہ جات قائم ہونا شروع ہوئے۔ وقت گذرنے کے ساتھ کئی ایک شعبہ جات کے ذیلی شعبہ بھی مکمل علم کی شکل اختیار کرتے چلے گئے۔

انگریز کی آمد سے قبل برصغیر میں تعلیم کی صورتحال:

برصغیر کی تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ہندوستان دور قدیم سے علم وآگہی کا مرکز رہا ہے۔ چندر گپت موریہ کے دور میں اس خطے میں کئی بڑی جامعات اور علمی مراکز قائم ہوئے۔جن میں نالندہ، واراناسی اور ٹیکسلا میں قائم جامعات سے علم وفضل کی روشنی پورے خطے میں پھیل رہی تھی۔ان اداروں میں مذہب، بدھ اخلاقیات، ریاضی، منطق، سنسکرت اور شعروادب غیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔اس کے علاوہ ہر گاؤں میں مندر کے ساتھ دھرم شالے قائم تھے، جہاں پنڈت بچوں کو ابتدائی تعلیم دیا کرتے تھے۔ یہ تعلیم کسی مربوط نظام کے تحت نہیں تھی اور نہ ہی حکومتوں کو اس سلسلے میں کسی قسم کی دلچسپی لینے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی، کیونکہ معاشرہ جس سطح پر تھا، بادشاہوں کو امور سلطنت چلانے کیلئے ایسے صاحب معاونین مل جایا کرتے تھے، جن سے ان کی ضرورت پوری ہو جاتی تھی۔

مسلمانوں کی آمد کے بعد ہندو کمیونٹی کے دھرم شالے قائم رہے، جہاں سنسکرت اور دیگر علوم کی تدریس جاری رہی۔مگر ہندو نوجوانوں نے دربار تک رسائی کیلئے عربی اور فارسی میں بھی عبور حاصل کرنا شروع کیا۔ خاص طور پر کائستھوں نے فارسی کے علاوہ اسلامی قوانین اور معاشی امور میں مہارت حاصل کر کے مسلمان حکمرانوں کے درباروں میں اعلیٰ مناصب پائے۔جبکہ مسلمانوں کیلئے ہر گاؤں میں مسجد کے ساتھ مکتب منسلک ہوا کرتے تھے، جہاں قرآن کی تعلیم یعنی حفظ وناظرہ کے علاوہ ابتدائی فارسی اور ریاضی کی ابتدائی تعلیم کا بندوبست تھا۔البتہ شہروں اور قصبوں میں مدارس قائم تھے، جو وسط ایشیاء کا نصاب پڑھاتے تھے۔ جس میں قرآن، حدیث، فقہہ کے علاوہ صرف ونحو، ریاضی، عربی اور فارسی ادب وغیرشامل ہوا کرتا تھا۔کچھ مدارس کو دارالعلوم اور جامعہ کا درجہ ضرور حاصل تھا اور یہ اسناد بھی جاری کیا کرتے تھے، مگر ان کا نصاب بھی روائتی بندشوں میں جکڑا ہوا تھا۔دہلی، آگرہ اور قرب وجوار کے شہروں میں کچھ تعلیمی ادارے ضرور قائم تھے، جو دربار کی ضروریات پوری کرنے کے لئے قائم کئے گئے تھے۔ان میں ایران، سمرقند اور بخارا کے مدارس کا نصاب پڑھایا جاتا تھا۔

اٹھارویں صدی میں دہلی میں قائم مدرسہ رحیمیہ کے شیخ الجامعہ شاہ ولی اللہ نے اپنے مدرسہ

کے نصاب میں بعض تبدیلیاں کیں اور قران وحدیث، فقہہ، ریاضی اور صرف ونحو کے علاوہ فلسفہ، منطق واستدلال، عربی وفارسی گرامر اور ادبیات کے مضامین شامل کئے۔اسی دوران فرنگی محل کے استاد مولوی نظام الدین سہلوی نے ہندوستان کے مسلم مدارس کیلئے نیا نصاب تیار کیا، جس میں درج بالا مضامین کے علاوہ تاریخ کو بھی شامل کیا۔مگر یہ تاریخ نبوت سے خلافت تک کے واقعات اور پھر مسلمان حکمرانوں کی کامیابیوں اور کامرانیوں پر محیط ہوا کرتی تھی۔ملا نظام الدین کا مرتب کردہ نصاب درس نظامیہ کے نام سے مشہور ہوا اور آج تک یہ دینی مدارس میں اس میں طے کردہ مضامین اور مواد پڑھایا جاتا ہے۔لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انگریز کی آمد سے قبل برصغیر میں کسی بڑی جامعہ یا علمی تحقیقی ادارے کا کوئی وجود نہیں تھا۔اس کا سبب شاید یہ تھا کہ ہندوستانی معاشرہ پرانے پیداواری نظام میں جکڑا ہوا تھا، اسلئے معاشرے کو جس قدر علم کی ضرورت تھی، یہ ادارے وہ پوری کررہے تھے اور نئے ادارے قائم کرنے کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں کی جارہی تھی۔

نوآبادیاتی دور:

اس میں شک نہیں کہ دنیا کے ہر خطے میں مختلف انداز میں علم کا فروغ ہورہا تھا، لیکن صنعتی انقلاب کے بعد جدید علوم کا ارتقاء یورپ سے ہوا۔اس طرح یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نیچرل سائنسز کی طرح سوشل سائنسز کی جنم بھومی بھی یورپ رہا، جہاں سے یہ اس کی نوآبادیات تک پہنچا۔اس سلسلے میں انگریزوں نے دیگر یورپی نوآبادتی قوتوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔خاص طور پر برصغیر ہند میں انگریز کی کاوشیں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔

1757ء میں پلاسی کے مقام پر نواب سراج الدولہ کو شکست دینے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی مدراس کے علاوہ بنگال پر بھی قابض ہوچکی تھی۔ہندوستان کیلئے کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ ویلسلے نے برطانوی اہلکاروں کے مقامی آبادی کے ساتھ رابطے کیلئے ان کا مقامی زبانوں کا جاننا ضروری قرار دیا، جن میں سنسکرت، فارسی، عربی، ہندی، اردو اور بنگالی شامل تھیں، بعد میں مراٹھی کو بھی شامل کرلیا گیا۔اس مقصد کیلئے کلکتہ میں ایک کالج کے قیام کا منصوبہ پیش کیا، جو فورٹ ولیم کی حدود میں 10 جولائی 1800ء کو قائم ہوا۔کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز اس کالج کے قیام کے مخالف تھے، کیونکہ ان کے خیال میں ہیلے برے (انگلستان) میں اسی نوعیت کا کالج قائم کردیا گیا تھا۔لیکن

ان رکاوٹوں کے باوجود یہ کالج 1854ء تک کام کرتا رہا۔معروف دانشور سبطِ حسن مرحوم کا کہنا ہے کہ بظاہر اس کا مقصد کمپنی بہادر کے ملازمین کو مقامی زبان سیکھانا بتایا گیا تھا،لیکن اصل مقصد ہندوستانیوں کے مزاج سے آشنائی حاصل کر کے بقیہ ہندوستان پر قبضہ کی راہ ہموار کرنا تھی۔جس کے لئے اردو اور ہندی کا الگ الگ رسم الخط متعین کیا گیا۔

بنگالی ایک زبان تو تھی،مگر اس کا رسم الخط اور ادبی حیثیت خاصی کمزور تھی۔کالج میں جن بنگالی پنڈتوں کا تقرر کیا گیا،وہ زیادہ تر سنسکرت کے ماہر تھے،جس کی وجہ سے انہیں بنگلہ زبان پر عبور نہیں تھا۔اس دوران راجہ رام موہن رائے کلکتہ منتقل ہو گئے اور انہوں نے جدید تعلیم کے متعارف کرائے جانے پر زور دینے کے علاوہ بنگالی زبان وادب کے فروغ اور ترویج کو اپنا مقصد حیات بنایا۔ان کے تعاون بنگلہ زبان کو واضح شکل دی گئی۔اس طرح اس کالج نے پچاس برس کے دوران اردو، ہندی اور بنگالی زبان کی گرامر تیار کی اور ان کے رسم الخط کو حتمی شکل دی۔اردو کیلئے فارسی رسم الخط میں "ڈ" اور "ڑ" کا اضافہ کیا گیا۔ہندی اور بنگلہ کیلئے معمولی فرق سے دیوناگری رسم الخط تجویز کیا گیا۔

لارڈ میکالے:

اس دوران لارڈ ٹامس بیبنگٹن میکالے،جنہوں نے 1833ء میں برطانوی پارلیمنٹ میں پہلے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی تیاری میں فعال کردار ادا کیا تھا،1834ء میں ہندوستان آئے تو گورنر جنرل کی ایڈوائزری کونسل کے رکن کی حیثیت میں دو اہم کارنامے سرانجام دیئے۔اول، کریمنل پروسیجر کوڈ کا مسودہ تیار کیا۔دوئم،ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر اثر ہندوستان کیلئے ایک جامع تعلیمی پالیسی مرتب کی۔ان کا بنائے ہوئے قوانین پر 1857ء میں جنگ آزادی شروع ہو جانے کی وجہ سے عملدرآمد نہیں ہو سکا۔لیکن ہندوستان پر مکمل قبضے اور براہ راست تاج برطانیہ کے زیر اثر آنے کے بعد 1860ء میں انڈین پینل کوڈ (IPC)،1872ء میں کریمنل پروسیجر کوڈ (Cr. P.C) اور 1909ء میں سول پروسیجر کوڈ (CPC) منظور ہو کر نافذ ہوئے۔یہ تمام کوڈز آج بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش، شری لنکا، نائیجیریا اور زمبابوے کے قوانین کا حصہ ہیں۔

ہمارے یہاں ایک عمومی تصور یہ پایا جاتا ہے کہ لارڈ میکالے ہماری مشرقی اقدار کا دشمن تھا،

جس نے انگریزی تعلیم رائج کر کے ہم سے ہماری مشرقی شناکت چھین لی۔ یہ تصور جہل آمادگی پر مبنی ہے، کیونکہ اس پر الزام تراشی کرتے وقت ہم سیکڑوں برسوں پر محیط علمی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی جمود کو بھول جاتے ہیں، جو مسلمان حکمرانوں نے اس خطے پر مسلط کر رکھا تھا۔ ہم یہ بھی فراموش کر چکے ہیں کہ جس وقت گیلیلیو زمین کو گول ثابت کرنے کے الزام میں چرچ سے سزا بھگت رہا تھا، برصغیر فکری جمود کی بدترین صورتحال سے دوچار تھا۔ جب نیوٹن قوانین حرکت ترتیب دے رہا تھا، اکبر اعظم کے درباری تان سین خان کی دھنوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔ فکری تفاوت کے فرق کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جس زمانے میں ممتاز محل کا دوران زچگی انتقال ہوا، اسی زمانے میں آسٹریا کی ملکہ بھی دوران زچگی انتقال کر گئیں۔ شہنشاہ ہند نے اپنی چہیتی بیگم کی یاد میں دنیا کا ساتواں عجوبہ تاج محل تعمیر کرایا، جبکہ آسٹریا کے بادشاہ نے پورے ملک میں جدید سہولیات سے آراستہ میٹرنٹی ہومز کے قیام کی منظوری دی، تاکہ ہر خاتون کو دوران زچگی مناسب طبی دیکھ بھال اور ادویات میسر آسکیں۔ یہ سوچ کا وہ بنیادی فرق تھا، جو مغربی دنیا اور جمود پذیر ہندوستان میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔

جو نظام تعلیم اس وقت پورے ہندوستان میں رائج تھا، وہ عام ہندوستانیوں کی زندگی سے متروک ہوتی سنسکرت کے پنڈت پیدا کر رہی تھی اور عربی و فارسی کے وہ مُلّاں پیدا ہو رہے تھے، جو عصری تقاضوں سے قطعی نابلد تھے۔ لارڈ میکالے ہندوستان میں دی جانے والی تعلیم کا تقابلی جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ جس تعلیم پر اہل ہند فخر کرتے ہیں، وہ ایک فضول مشق اور وقت کا زیاں ہے۔ وہ انگریزی کا تقابل سنسکرت اور عربی سے کرتے ہوئے ثابت کرتا ہے کہ موخرالذکر دونوں زبانیں سوائے شاعری اور قصہ گوئی کی رطب اللسانی، اپنے اندر معلومات کا کوئی ذخیرہ نہیں رکھتیں۔ اس کے برعکس انگریزی کی وسعت میں جدید سائنسی علوم کی وجہ سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ وہ برطانوی (مقبوضہ) علاقوں میں سائنس و ٹیکنالوجی اور جدید سماجی علوم کی تدریس کی وکالت بھی کرتا ہے، تاکہ ان باشندوں کے شعور و آگہی میں اضافہ ہو سکے اور وہ کارآمد انسان بن سکیں۔ اگر لارڈ میکالے کے تصور تعلیم کا غیر جانبداری کے ساتھ ناقدانہ جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مشرقی تعلیم جس پر قدامت پسند راہنماء اصرار کرتے رہیں ہیں، سنسکرت سے ماہر ہندو پنڈت اور عربی و فارسی کا رٹو طوطا مولوی پیدا ہوتا ہے، جبکہ جدید انگریزی و عصری تعلیم کی

بدولت ہندوستان کے عوام میں زندگی برتے کا شعور اور آزادی کے معنی و مطالب سے آشنائی ہوسکی۔ یہ جدید تعلیم ہی کا ثمر تھا کہ ہندوستان میں گاندھی، جناح، نہرو اور اقبال جیسی شخصیات پیدا ہوئیں، جنہوں نے ہندوستانیوں میں آزادی کے جذبے کو اجاگر کیا۔

چنانچہ لارڈ میکالے نے 1834ء میں برٹش انڈیا کیلئے ایک جامع اور مربوط تعلیمی پالیسی ترتیب دی جس میں جدید عصری علوم کی تدریس اور انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے پر زور دیا۔ ان کی پالیسی کی رو سے پورے ہندوستان میں تحصیل کی سطح پر ہائی اسکول کا قیام، ضلع کی سطح پر کالج اور ڈویژن کی سطح پر اعلیٰ تعلیمی ادارے کا قیام شامل تھا۔ اس پالیسی کے تحت پورے ہندوستان میں اسکولوں اور کالجوں کی تعمیر کا کام شروع ہوا اور مختلف حصوں میں یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آنا شروع ہوا۔ ان تعلیمی اداروں میں فزکس، کیمسٹری، بیالوجی اور ریاضی کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، شہریت، فلسفہ، سیاسیات اور ادب جیسے مضامین کی تدریس شروع ہوئی۔ انگریز حکمرانوں نے دوسرا اہم کام یہ کیا کہ سرکاری سطح پر تعلیمی ادارے قائم کرنے کے علاوہ نجی شعبہ میں اسکول سے یونیورسٹی کے قیام کی حوصلہ افزائی کی۔ اس طرح پورے ہندوستان میں جدید عصری تعلیم کے معیاری ادارے قائم ہونا شروع ہوئے۔

اس کی اسی پالیسی کا نتیجہ تھا کہ سرکار ہند 1857ء سے 1947ء کے دوران پبلک سیکٹر میں 7 یونیورسٹیاں قائم کرنے پر مجبور ہوئی۔ جن میں کلکتہ، مدراس اور ممبئی یونیورسٹیوں کا قیام 1857ء میں عمل میں آیا۔ پنجاب یونیورسٹی 1882، الٰہ آباد یونیورسٹی 1887، پٹنہ یونیورسٹی 1917 اور ڈھاکہ یونیورسٹی 1920 میں قائم ہوئیں۔ جبکہ نجی شعبہ میں بیسویں صدی کے آغاز میں تین جامعات قائم ہوئیں۔ 1916ء میں ہندو یونیورسٹی بنارس، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ 1920ء میں مکمل یونیورسٹی بنیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی بنیاد 1875ء میں محمڈن اینگلو اورینٹیل کالج کے طور پر رکھی گئی، جسے 1920ء میں جامعہ کا درجہ دیا گیا۔ ان تمام جامعات میں نیچرل سائنسز کے مضامین کے ساتھ سوشل سائنسز کے مضامین بھی پڑھائے جاتے تھے اور تحقیقی عمل ہوتا تھا۔

جدید عصری تعلیم کے نتیجے میں برٹش انڈیا میں تعلیمیافتہ اور ہنرمند نوجوانوں کی ایک نئی کھیپ تیار ہونا شروع ہوئی، جس کیلئے روزگار کے نئے ذرائع بھی پیدا ہو رہے تھے۔ انگریز حکمرانوں نے

گو کہ بعض اقدامات اپنے مفاد میں کئے مگر ان کے فوائد بہر حال مقامی افراد تک پہنچے۔ برٹش انڈیا میں ریلوے لائین بچھانے کا کام 1853ء میں شروع ہوا اور 1920ء تک 67 برس کے عرصہ میں 61,220 کلو میٹر طویل لائین ہندوستان کے طول وعرض میں بچھائی جا چکی تھی۔ اسی طرح ہندوستان کی تاریخ کی پہلی ٹیکسٹائل مل 1817ء میں کلکتہ کے مقام پر لگائی گئی، دوسری مل 1853ء میں ممبئی میں لگی۔ یوں بیسویں صدی کی آمد تک پورے ہندوستان میں صنعتکاری کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ جس کی وجہ سے ہنرمند ہندوستانیوں کیلئے روزگار کے نئے ذرائع پیدا ہوئے۔ ساتھ ہی مختلف جامعات سے امتیازی نمبروں میں گریجویشن کرنے والے ہندوستانی نوجوانوں کیلئے تعلیمی اداروں اور مختلف سرکاری دفاتر پیدا ہونے والی آسامیوں پر تقرریوں کے علاوہ انڈین سول سروس (ICS) کے دروازے بھی کھلنا شروع ہو گئے تھے، جو اس زمانے میں انتہائی باوقار اور بااختیار ملازمت تصور کی جاتی تھی۔ اس طرح برطانوی ہند کے نوجوانوں میں جدید عصری تعلیم کے حصول کا شوق اور زندگی کے مختلف شعبہ جات میں مسابقت کا آغاز ہوا۔ یوں برصغیر کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جدید عصری علوم اور ہنرمندی سے آراستہ ایک نئی مڈل کلاس وجود میں آنا شروع ہوئی۔ جدید عصری علوم تک رسائی کے سبب ہندوستانی نوجوانوں کی ذہنی استعداد میں اضافہ ہوا اور انہیں سوچنے کے نئے زاویئے عطا ہوئے۔ انہوں نے اپنی تاریخ کو Revist کرنا اور سماجی وسیاسی معاملات پر جدید دنیا کے فکری تناظر میں غور فکر اور تقابلی جائزہ لینا شروع کیا۔ جس کے نتیجے میں آزادی کے لئے تڑپ پیدا ہوئی اور سیاسی امور میں دلچسپی کو فروغ حاصل ہوا۔

پاکستان میں تعلیم اور تعلیمی پالیسیاں:

جس خطے پر پاکستان قائم ہوا، خاص طور پر مغربی پاکستان، وہ پورے برٹش انڈیا میں سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تعلیمی طور پر سب سے زیادہ پسماندہ تھا۔ اسکولوں، کالجوں اور فنی تعلیم کے پبلک اور پرائیویٹ دونوں سیکٹروں میں ادارے نہ ہونے کے برابر تھے۔ اسی طرح تقسیم ہند کے وقت پاکستان کو دو یونیورسٹیاں ورثے میں ملیں۔ ایک پنجاب یونیورسٹی مغربی پاکستان کے شہر لاہور میں تھی، جبکہ دوسری مشرقی پاکستان کے دارالحکومت ڈھاکہ میں تھی۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد 1947ء میں پہلی تعلیمی پالیسی تیار کرنے کیلئے کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ جس سے خطاب کرتے ہوئے

بانیٔ پاکستان نے فرمایا، "ہمیں تعلیم کی اہمیت اور طرزِ تعلیم کی غیر ضروری بحث میں الجھے بغیر تعلیم کے فروغ کیلئے کوششیں کرنا ہوں گی۔ اگر ایک طرف طرزِ تعلیم مستقبل کے معماروں کی تعمیر کرتی ہے، تو دوسری طرف ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ عالمی سطح پر مقابلہ کیلئے اہداف بھی طے کرنا ہیں"۔ اس کانفرنس میں پرائمری، سیکنڈری اور اعلیٰ تعلیم کے اہداف متعین کرنے کی کوشش کی گئی۔ ساتھ ہی تعلیم بالغان کی ضرورت بھی محسوس کی گئی، تاکہ خواندگی کی شرح میں اضافہ کیا جا سکے، جو اس وقت مجموعی طور پر 15 فیصد سے زائد نہیں تھی۔

تعلیم کی تشویشناک صورتحال سے نمٹنے کے لئے اسی برس یعنی 1947ء میں کراچی میں سندھ یونیورسٹی قائم کی گئی۔ 1950ء میں پشاور میں یونیورسٹی آف پشاور اسوقت کے وزیراعظم لیاقت علی خان نے قائم کی، جو 1913ء میں قائم ہونے والے اسلامیہ کالج پشاور کا تسلسل تھی۔ 1951ء میں وفاقی پارلیمان نے کراچی میں فیڈرل یونیورسٹی قائم کرنے کے بعد سندھ یونیورسٹی کو حیدرآباد منتقل کر دیا، جو بعدازاں جامشورو منتقل کر دی گئی۔ 1962ء میں ایک حکمنامہ کے ذریعہ کراچی یونیورسٹی کی وفاقی حیثیت ختم کر کے اسے صوبائی حکومت کی تحویل میں دیدیا گیا۔ اس وقت سے یہ جامعہ صوبائی حکومت کے زیر اثر کام کر رہی ہے۔ 1949ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اردو کالج کی بنیاد رکھی اور اسی برس کئی علم دوست اصحاب اور انجمنوں نے پورے ملک میں اسکول اور کالج قائم کرنا شروع کئے۔ 1951ء میں چھ برسوں کیلئے تعلیم کے فروغ کے لئے قومی منصوبہ کا اعلان ہوا۔

تعلیم کے فروغ کا چھ سالہ قومی منصوبہ 57-1951:

1951ء میں تعلیم کے فروغ کے لئے ایک قومی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ اس کانفرنس کا مقصد آئندہ چھ برسوں (1951 سے 1957) کیلئے تعلیم کے فروغ کے ایک مربوط منصوبے کی تیاری تھا۔ اس کانفرنس نے جو سفارشات پیش کیں، ان میں کئی مثبت اقدامات کے علاوہ بعض منفی رجحانات بھی سامنے آئے۔ اس کانفرنس کے دوران ان رکاوٹوں اور کمزوریوں پر بھی کھل کر گفتگو ہوئی، جو نوزائیدہ ملک کو درپیش تھیں۔ مثال کے طور پر پورے ملک میں پرائمری تعلیم کو یقینی بنانے کے لئے پورے ملک میں 24 ہزار نئے اسکولوں کے قیام اور 86 ہزار اساتذہ کی فوری ضرورت

سامنے آئی۔ جو اساتذہ اس وقت کام کر رہے تھے، ان میں سے 80 فیصد کے قریب غیر تربیت یافتہ تھے۔ ان کی تربیت کیلئے انتظام کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا۔ مگر 1957ء میں منصوبے کے اختتام پر جب اس کا جائزہ لیا گیا، تو اس سے 20-15 فیصد کے قریب نتائج حاصل ہو سکے تھے۔

اس کے علاوہ اس منصوبہ میں اردو کو قومی زبان کا درجہ دینے اور لازمی تدریسی زبان قرار دینے کے نتیجے میں سب سے زیادہ احتجاج بنگال سے اٹھا اور اس کے خلاف مزاحمت شروع ہوگئی۔ سندھ سے بھی تحفظات سامنے آئے۔ اس کے علاوہ اس منصوبہ میں اعلیٰ تعلیمی اداروں کیلئے نصاب تعلیم میں مناسب تبدیلی کی سفارش کی گئی۔ ان سفارشات میں کہا گیا کہ پاکستان کے قیام کے مقاصد کے مدنظر (اس وقت تک ابھی نظریہ پاکستان دریافت نہیں ہوا تھا) نصاب تعلیم میں مناسب تبدیلیاں لائی جائیں۔ خاص طور پر تاریخ اور فلسفہ کے مضامین کے نصاب کو قومی خواہشات سے ہم آہنگ کرنے پر زور دیا گیا۔ اس سوچ سے اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ حکمران بعض مضامین کے نصاب میں من مانی تبدیلیاں لانے کی منصوبہ بندی کر چکے ہیں۔

پہلا پنج سالہ منصوبہ 60-1955ء:

پہلا پنج سالہ منصوبہ دسمبر 1957ء میں پیش کیا گیا۔ اس میں ایک بار پھر پرائمری تعلیم پر زور دیا گیا اور 4 ہزار نئے اسکول قائم کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی۔ جن کیلئے 43 ہزار 5 ہزار مزید اساتذہ کی ضرورت کا زور دیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی طے کیا گیا کہ اس وقت پرائمری اسکولوں میں بچوں کے داخلہ کی ابتدائی مجموعی تعداد کو 6 لاکھ سے بڑھا کر 10 لاکھ تک پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔ مگر چونکہ حکومت منصوبے کیلئے طے کردہ رقم مہیا کرنے میں ناکام رہی، اس لئے منصوبے کے اہداف حاصل نہیں ہو سکے۔

قومی تعلیمی کمیشنز: اول، 1959:

پہلا قومی تعلیمی کمیشن ایوب خان نے قائم کیا۔ اس کا مقصد یہ بتایا گیا کہ ملک میں پرائمری تعلیم کے فروغ کے ساتھ نوجوانوں کو جدید سائنس و ٹیکنالوجی تک رسائی اور جدید معاشرتی نظام

سے آگہی۔اس کمیشن نے جو سفارشات پیش کی وہ درج ذیل تھیں:

1- 15 برس یعنی 1975ء تک پرائمری تعلیم کی عمر تک پہنچنے والے ہر بچے کا اسکول میں داخلہ۔
2- ہائی اسکول، کالج اور یونیورسٹی سطح پر جدید سائنسی علوم کا متعارف کرایا جانا۔
3- سائنس وٹیکنالوجی کی تعلیم کو عام کرنے کیلئے فنی تعلیمی اداروں کا قیام۔
4- میٹرک کو گیارہ سال کی بجائے 10 برس کرنا اور میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے لئے امتحانی بورڈز کا قیام۔
5- اسکول کی سطح پر تاریخ، جغرافیہ اور شہریت کی الگ حیثیت ختم کر کے ان تینوں مضامین پر مشتمل معاشرتی علوم کے مضمون کا متعارف کرایا جانا۔

اس تعلیمی پالیسی کے نتیجے میں پورا تعلیمی نظام تبدیل ہو گیا۔اس سے قبل اسکول کی سطح پر قدیم ہندوستان کی تاریخ پڑھائی جاتی تھی۔تاریخ کو معاشرتی علوم کا حصہ بنا دینے سے دو خرابیاں پیدا ہوئیں۔اول، نصاب میں اس کا حجم بہت کم رہ گیا۔دوئم، اسے صرف پاکستان تک محدود کرنے کی کوشش کی گئی۔اس میں ان علاقوں کی سابقہ تاریخ کو بھی نظر انداز کیا، جن پر پاکستان قائم ہوا تھا۔ بلکہ محمد بن قاسم کی آمد سے تاریخ کا سلسلہ شروع کیا گیا، جو قطعی غیر فطری اور تاریخ کے بنادی اصولوں سے متصادم تھا۔اسی طرح جغرافیہ جو ایک مکمل مضمون ہے، اسے بھی چھٹی سے آٹھویں جماعت تک معاشرتی علوم کا حصہ بنانے سے اسکی اہمیت خاصی حد تک کم ہو گئی۔یہی کچھ شہریت کے ساتھ ہوا، جس کی ایک مکمل مضمون کے طور پر اہمیت ختم ہو گئی۔

البتہ جنرل سائنس کا مضمون خاصی حد تک بہتر ہوا، جس میں فزکس، کیمسٹری اور بیالوجی کی ابتدائی معلومات فراہم کی گئیں۔اسی طرح ریاضی میں نئے تصورات خاص طور پر سیٹ تھیوری کو متعارف کرایا گیا۔اسی طرح ٹیکنیکل تعلیم کے دائرہ کار کو بھی وسیع کیا گیا۔یونیورسٹی کی سطح پر بعض نئے مضامین متعارف ہوئے۔مگر فلسفہ، تاریخ، سیاسیات، عمرانیات کے مضامین کے نصاب میں پاکستانیت کے نام پر بعض ایسے موضوعات شامل کئے گئے، جن سے ان مضامین کی علمی حیثیت متاثر ہوئی۔محسوس یہ ہوا کہ ایوب خان کے دور میں نافذ کی جانے والی تعلیمی پالیسی میں زیادہ تر سماجی علوم کو تختہ مشق بنایا گیا۔

دوسرے پنج سالہ منصوبے ((1960-65) میں 1959ء کی تعلیمی پالیسی کی سفارشات پر

عملدرآمد کی یقین دہانی کرائی گئی تھی۔اس کے علاوہ یہ بھی وعدہ کیا گیا کہ پہلے پنج سالہ منصوبے میں جو کام ادھورے رہ گئے ہیں،انہیں پائے تکمیل تک پہنچایا جائے گا۔مثال کے طور پر پہلے پنج سالہ منصوبے میں مغربی پاکستان میں 4 ہزار نئے پرائمری اسکول قائم کرنے کا ہدف طے کیا گیا تھا، مگر صرف 2,400 اسکول قائم ہو سکے تھے۔لہٰذا یہ طے کیا گیا کہ باقی رہ جانے والے 1,600 اسکول تعمیر کر کے اس ہدف کو مکمل کیا جائے اس کے بعد دیگر اہداف پر توجہ دی جائے۔اس دوسرے پنج سالہ منصوبے میں سماجی سیکٹر کے لئے مختص ترقیاتی فنڈ کا 66 فیصد یعنی 990 ملین روپئے پرائمری تعلیم کے فروغ کیلئے مخصوص کئے گئے۔مگر اس منصوبے پر بھی مکمل عمل نہیں ہوسکا، جس کی کئی وجوہات رہی ہیں۔خاص طور پر اس رقم کا ایک بڑا حصہ نئے دارالحکومت اسلام آباد کی تعمیر کے لئے منتقل کر دیا گیا۔

تیسرے پنج سالہ منصوبے (1965-70) میں تعلیم کی منصوبہ بندی کے درج ذیل مقاصد متعین کئے گئے:

1- ایک ایسا تعلیمی نظام ترتیب دیا جائے، جو قوم کو سائنس وٹیکنالوجی کی آگہی دے، سیاسی، سماجی اور معاشی ترقی کا سبب بنے اور لک کے مذہبی اور ثقافتی ورثے کو جدید دنیا سے ہم آہنگ کر سکے۔

2- ملکی نوجوانوں کو ایک ایسا ماحول مہیا کیا جائے، جس میں وہ اپنی انفرادی اہلیت کو فرودے سکیں اور کردار سازی کر سکیں۔

3- تمام سطحوں پر تعلیم کے معیار کو بلند کیا جائے تا کہ قومی تعمیر کے مقاصد کی تکمیل ہو سکے۔

اس منصوبہ میں 42,500 نئے اسکول قائم کرنے کے علاوہ پرائمری اسکولوں میں داخلے کا ہدف 1970ء تک 45 سے 70 فیصد کرنا طے کیا گیا۔جو پہلے 1965 کی جنگ اور پھر 1968 سے ملک میں ہنگامہ آرائی کے سبب تکمیل پذیر نہیں ہو سکے۔

مارچ 1969ء میں جنرل یحیٰی خان نے ملک کا اقتدار سنبھالا۔انہوں نے سابقہ صوبے بحال کر دیئے اور 1970ء میں انتخابات کا اعلان کیا۔ساتھ ہی انہوں نے عبوری آئینی فریم ورک کے علاوہ 1970ء میں ایک تعلیمی پالیسی کا بھی اعلان کیا۔مگر اسی سال دسمبر میں عام انتخابات اور اس کے بعد سابقہ مشرقی پاکستان میں شروع ہونے والی شورش کے نتیجے میں اس پالیسی

پر عمل درآمد نہیں ہو سکا۔

سقوط ڈھاکہ کے بعد 20 دسمبر 1971ء کو مرحوم ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کے صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے عہدے کا حلف اٹھایا۔ انہوں نے 1972ء میں عبوری آئین اور مختلف شعبہ جات کے لئے پالیسیوں کا اعلان کیا۔ ان میں تعلیمی پالیسی بھی شامل تھی۔ اس تعلیمی پالیسی کے درج ذیل نکات تھے:

1۔ میٹرک تک مفت تعلیم کی فراہمی۔

2۔ نجی تعلیمی اداروں کا قومیایا جانا۔

3۔ 1979ء تک لڑکوں کیلئے اور 1984ء تک لڑکیوں کیلئے لازمی پرائمری تعلیم۔

4۔ اسی طرح 1982ء تک لڑکوں کے لئے اور 1989ء تک آٹھویں تک لازمی تعلیم۔

5۔ 150,000 اساتذہ کی تربیت۔

5 جولائی 1977ء کو لگنے والے مارشل لاء کے نتیجے میں مسٹر بھٹو کی پالیسیوں پر عملدرآمد روک دیا گیا۔ جنرل ضیاء نے 1981ء میں ایک نئی تعلیمی پالیسی دی، جس میں نام نہاد اسلامائزیشن کے نام پر پورے نصاب تعلیم کو یکسر تبدیل کر دیا۔

جنرل ضیاء کے دور میں جو تعلیمی پالیسی نافذ کی گئی، اس میں لبرل سائنسز کے حجم کو تقریباً معدوم کر دیا گیا۔ سماجی علوم خاص طور پر تاریخ، فلسفہ اور سیاسیات کو خصوصی طور پر تختہ مشق بنایا گیا۔ دینیات کی جگہ اسلامیات کا مضمون ہائی اسکول کی سطح پر متعارف کرایا گیا، جس میں شیعہ اور سنی طلبہ کیلئے الگ الگ سیکشن نے فرقہ وارانہ تقسیم کو گہرا کیا۔ تاریخ کے مضمون کو محدود کرنے کے علاوہ فلسفہ سے منطق، استدلال جیسے موضوعات کو خارج کرنے اور اسلامی فلسفہ جیسے موضوعات شامل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے علاوہ اس پالیسی میں میڈیکل، انجینئرنگ اور ایگریکلچر کے طلبہ کیلئے اسلامیات اور مطالعہ پاکستان کو بھی لازمی قرار دیا گیا۔ اس طرح ایک طرف سماجی علوم کے موضوعات کو کہ محدود کئے جا رہے تھے، لیکن ان کا دائرہ (Scope) بڑھ رہا تھا۔

پاکستان میں سماجی علوم:

جس خطے میں پاکستان قائم ہوا ہے، یہاں قیام پاکستان کے وقت تمام علوم بالخصوص سماجی

علوم کی صورتحال خاصی تشویشناک تھی۔ 1960ء کے عشرے میں ملک کی جامعات نے مغربی دنیا میں پڑھائے جانے والے بعض اہم سماجی مضامین متعارف کرانے کا سلسلہ شروع کیا۔ ڈاکٹر عنایت اللہ مرحوم کی تحقیق کے مطابق 1963ء سے 1983ء کے دوران 20 برس کے عرصہ میں ملک کی 9 عام اور 3 زرعی یونیورسٹیوں میں تین درجن کے قریب سماجی علوم کے مختلف نئے شعبہ جات قائم ہوئے۔ ان کی تحقیق کے مطابق اسی دوران درجن بھر کے قریب تحقیقی ادارے قائم ہوئے جہاں مختلف سماجی علوم پر تحقیق کا کام کیا جاتا ہے۔ ان میں کچھ ایسے تحقیقی ادارے ہیں، جو حکومتی امداد سے چل رہے ہیں، جن میں انسٹیٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئر ز کراچی اور اسلام آباد میں قائم پاکستان انسٹیٹیوٹ آف ڈیولپمنٹ اکنامکس وغیرہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر عنایت مرحوم ہی کی تحقیق کے مطابق 1983ء تک سماجی علوم کے مختلف شعبہ جات میں ایم اے اور اس سے اعلیٰ تعلیم یافتہ سماجی سائنسدانوں (Social Scientists) کی تعداد 16 ہزار سے تجاوز کر چکی تھی اور اس تعداد میں تسلسل کے ساتھ اضافہ بھی ہو رہا تھا۔

دنیا میں دوسری عالمی جنگ کے بعد نیچرل اور سوشل سائنسز میں نئے نئے مضامین کی تعداد تیز رفتار اضافہ شروع ہوا جو ترقی یافتہ ممالک میں متعارف ہونے کے ساتھ ساتھ پاکستان میں بھی متعارف ہونا شروع ہوئے۔ مگر پاکستان میں بعض سیاسی اور سماجی مصلحتوں کے تحت کچھ مضامین کی تدریس پر قدغن عائد کئے گئے، جبکہ کچھ مضامین کے موضوعات میں ردوبدل تجویز کی گئی۔ ابتداء میں صنفی مطالعہ (Gender Studies) کے بارے میں علماء نے فتویٰ دیا کہ اس مضمون کی تدریس کی پاکستان میں اجازت نہ دی جائے۔ بیسویں صدی کے آخری عشرے میں اس مضمون کو محدود موضوعات کے ساتھ تدریس کی اجازت دی گئی۔ یہی معاملہ فلسفہ اور دیگر سماجی مضامین کے ساتھ روا رکھا گیا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، جنرل ضیاء کے دور میں نیچر اور سوشل سائنسز کے مضامین کو اسلامائز کرنے کی خواہش میں ان کے موضوعات میں انتہائی بھونڈی تبدیلیاں کی گئیں۔ جس طرح میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں میں اسلامیات اور مطالعہ پاکستان کو لازمی قرار دیا گیا۔ اسی طرح سوشل سائنسز کے بیشتر مضامین کے موضوعات میں ردوبدل کی گئی، خاص طور پر تاریخ اور فلسفہ کو خصوصی نشانہ بنایا گیا۔

بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں کے دوران ملٹی نیشنل کمپنیوں کے دفاتر کھلنے اور کئی عالمی

برانڈ کی پاکستان میں فرنچائز کے بعد MBA، CA وغیرہ کی مانگ میں اضافہ ہوا۔اسی دوران حکومت نے نجی شعبہ میں اسناد تقسیم کرنے والے تعلیمی اداروں کے قیام کی اجازت بھی دیدی۔لہٰذا نجی شعبہ میں یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آنے لگا۔سب سے پہلے میڈیکل اور انجینئرنگ کے شعبہ میں یونیورسٹیاں اور کالج قائم ہوئے اس کے بعد دنیا بھر کی طرح پاکستان میں بھی مینجمنٹ سائنسز کے نام سے ایک نئی فیکلٹی دریافت ہوئی۔نجی شعبہ میں قائم ہونے والی بیشتر یونیورسٹیوں نے خود کو صرف مینجمنٹ سائنسز تک محدود رکھا۔ لارڈ برٹرینڈ رسل کے مطابق جدید دنیا میں نوجوانوں ان مضامین کی طرف متوجہ ہوتی ہے،جن کے پڑھنے سے انہیں روزگار تک رسائی میں سہولت ہو۔اس طرح تعلیم کا مقصد علمی استعداد میں اضافہ کی بجائے کسبی ہو چکا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں ایک اور پیش رفت نجی شعبہ میں الیکٹرونک میڈیا کے پھیلاؤ کی شکل میں ہوئی۔حکومت سٹیلائیٹ ٹیکنالوجی کے نتیجے میں غیر ملکی چینلوں کی نشریات کے بڑھتے ہوئے پھیلاؤ کے نتیجے میں معاشرے میں پیدا ہونے والے دباؤ سے مجبور ہو کر اپنے ملک کے نجی شعبہ کو ریڈیو اور ٹیلے ویژن نشریات کی اجازت دینے پر مجبور ہوئی۔ یوں 2000ء سے نیوز اور تفریحی ٹیلے ویژن چینلوں کے علاوہ ایف ایم ریڈیو کا جال پورے ملک میں تیزی کے ساتھ پھیل گیا۔ ان چینلوں کی ابتدائی ضروریات کو پرنٹ میڈیا اور سرکاری ٹیلی ویژن کے ریٹائرڈ اہلکاروں نے پوری کی۔لیکن چینلوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے پبلک سیکٹر کی جامعات کو اپنے Mass Communication کے شعبہ جات کو جدید بنانے اور پرائیویٹ سیکٹر کی جامعات کو میڈیا سائنسز کے نام سے نئی فیکلٹی قائم کرنے پر مجبور کیا۔یوں نوجوانوں کی کشش کی ایک اور فیکلٹی قائم ہوگئی۔

صورتحال میں آنے والی ابتری:

1980ء کے عشرے تک انجینئرنگ، میڈیکل اور مینجمنٹ سائنسز کی فیکلٹیاں پبلک سیکٹر کی جامعات میں ہوا کرتی تھیں۔جن میں داخلے کیلئے کڑے مقابلے سے گذرنا پڑتا تھا۔ہزاروں کی تعداد میں طلبہ ان شعبہ جات میں داخلہ سے محروم رہ جاتے تھے۔نجی شعبہ میں یونیورسٹیوں کے قیام سے ان طلبہ کو اپنی پسند کے شعبہ میں جانے کا موقع مل گیا جو میرٹ پر پورے نہیں اترتے تھے۔

یوں لارڈ برٹرینڈ رسل کے کہنے کے مطابق نوجوان ان شعبہ جات میں جانے کو ترجیح دیتے ہیں، جہاں انہیں بہتر معاشی مواقع ملتے ہوں۔ جدید دنیا میں یہ حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ علم کی تمام شاخوں کیلئے یکساں پرکشش ماحول پیدا کرے تاکہ ملک میں ہر سمت میں ترقی ہو سکے۔ مگر محکمہ تعلیم اور اس میں بیٹھے منصوبہ سازوں کی نظر میں سوشل سائنسز کی کوئی اہمیت نہیں، اسی لئے وہ ایک کے بعد ایک مضمون کو پبلک سیکٹر جامعات سے ختم کرتے جا رہے ہیں۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر اکبر زیدی کا کتابچہ Dismal Conditions of Social Sciences انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں انہوں نے مختلف ادوار میں سماجی علوم کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا جائزہ لینے کے علاوہ سماجی علوم کے جریدوں کے معیار پر اپنی تشویش کا بھی اظہار کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ پاکستانی معاشرے میں چونکہ برداشت کی کمی ہے، اسلئے سماجی امور پر بحث ومباحثہ کا ماحول پیدا نہیں ہو پا رہا۔ جس کی وجہ سے سماجی علوم کی ترقی مشکوک بنی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ وہ پاکستان کی تاریخ کو پانچ ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلا دور 1947ء سے 1958ء کے درمیان ہے، جس میں برٹش انڈیا کی روایات جاری رہتی ہیں۔ دوسرا دور 1958ء سے 1971ء کے دوران تھا، جس میں فوج اور بیوروکریسی کے اتحاد (Nexus) نے جدید پاکستان کے لئے حکمرانی کے اصول وضوابط تیار کئے۔ 1971ء سے 1977ء کا تیسرا دور سابقہ دونوں ادوار کے مقابلے میں زیادہ لبرل اور تخلیقی تھا۔ چوتھا دور 1977ء سے 1988ء کے دوران تھا، جو جنرل ضیاء کا تاریک دور تھا جس میں اسلامی احیاء اور نظریۂ پاکستان جیسے معاملات کو اٹھایا گیا۔ پانچواں دور 1988ء کے بعد شروع ہوا۔ یہ دور عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کا دور تھا، جس کے پاکستان پر اثرات مرتب ہوئے۔

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ پاکستان میں سماجی علوم انتہائی کمزور صورتحال سے دوچار ہیں۔ انہیں کاری اور غیر سرکاری سطح پر کسی قسم کی سرپرستی حاصل نہیں ہے۔ بلکہ بعض حکومت اور سیاسی جماعتیں دیگر علوم کے مقابلے میں ان علوم سے زیادہ خوفزدہ رہتی ہیں، اسلئے ان کے موضوعات میں من مانی تبدیلیاں کر کے فکری ارتقاء کا راستہ روکنے کی کوشش کرتی ہیں۔

پاکستان میں فلسفہ سے بے اعتنائی

اشفاق سلیم مرزا

پاکستان میں یوں تو تمام سماجی علوم کی حالت دگرگوں ہے لیکن فلسفہ کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جا رہا ہے وہ انتہائی قابل رحم ہے۔ روایتی طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ سوتیلے پن کا شکار ہے۔ لیکن جہاں کہیں عرب توسیع پسندی اور عظمت کا ذکر مقصود ہو تو بڑے فخر سے یہ بات تکرار کے ساتھ کی جاتی ہے کہ عہد ظلمت کے بعد مغربی دنیا کو یونانی فلسفہ سے متعارف کروانے والے عالم یا مترجم مسلم دنیا سے تعلق رکھتے تھے۔ ماضی کی عظمت، وہ بھی کسی اور ملک کے حوالے سے، کے گیت گانے والوں کے اطمینان کے لئے بس چند ایسے ہی سنے سنائے جملے کافی ہیں، اور وہی علماء جو مغربی عالموں اور علوم کو ہر وقت کوستے رہتے ہیں اپنی دلیل کو مستحکم کرنے کے لئے اُن محققین اور عالموں کا حوالہ دینا اپنا فرض عین سمجھتے ہیں جنہوں نے مسلم مترجمین اور علماء کی اس کاوش کو سراہا ہوتا ہے۔

اُنیسویں صدی کے وسط کے بعد جب انگریز حکمرانوں نے یہاں مغربی طرز کے طریقہ تعلیم کو رائج کیا اور اُس کو فروغ دینے کے لئے کالج اور یونیورسٹیاں قائم کیں تو دوسرے سماجی علوم کے ساتھ ساتھ فلسفہ بھی متعارف کروایا گیا۔ چونکہ زیادہ تر کتابیں انگریزی زبان میں تھیں اس لئے اُردو پڑھنے والوں کے لئے فلسفہ کی تعلیم کا ماحول سازگار نہ تھا۔ اس لئے اس کی تعلیم انگریزی میں پڑھنے والوں تک محدود رہی۔

میرے علم کے مطابق سب سے پہلے فلسفہ پر جو مربوط کتاب شائع ہوئی وہ شمس العلماء نواب سیّد امام اثر کی کتاب ''مراۃ الحکما'' تعارف فلسفہء جدید تھی جس کی اشاعت اول 1877ء

میں ہوئی۔ بعدازاں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے جہاں اور بہت سے سائنسی اور سماجی علوم سے متعلق اہم کتب کے ترجمے کا بیڑا اُٹھایا وہاں فلسفہ کی اہم کتابوں کو بھی اُردو زبان میں منتقل کرنے کی ذمہ داری لی۔ میں سمجھتا ہوں گو ادق ہی سہی لیکن مشکل ترین کتابوں کے ترجمے شائع ہونے لگے۔ جن میں کانٹ کی کتاب (Critique of Pure Reason) تنقید عقل محض کا ترجمہ بھی شامل تھا۔ اس کے علاوہ شوپن ہار (Schopenhaur) اور نیٹشے کی کتابوں کے ترجمے بھی شامل تھے۔ یہ ایک ضیائی سطح کا کام تھا جو وہاں سے کیا گیا۔ بعدازاں انفرادی اور ادارتی حوالے سے بھی اچھے ترجمے دیکھنے میں آئے جن میں سے ول ڈیورانٹ (Will Durant) کی کتاب (Story of Philosophy) داستانِ فلسفہ کا ترجمہ سیّد عابد علی عابد اور برٹرینڈ رسل (Bertrand Russel) کی کتاب (History of Western Philosophy) کا ترجمہ پروفیسر محمد بشیر نے کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی نادر کتابوں کا ترجمہ بھی اُردو میں کیا گیا، اور فلسفہ پر کتابیں اُردو زبان میں لکھی بھی جارہی ہیں۔

جب ہم فلسفہ کی طرف بے اعتنائی کا ذکر کرتے ہیں تو جامعات اور کالجوں میں فلسفہ کی جو تعلیم دی جارہی ہے اُس کو ملکی تناظر کے حوالے سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ فلسفہ کی تعلیم میں جو عناصر مانع آرہے ہیں وہ تین بڑے عوامل یا عناصر ہیں۔

1- نظریاتی
2- منہاجی
3- اطلاقی

نظریاتی

ایسے تمام ممالک جہاں ریاستی سطح پر کسی (Ideology) نظریہ کو پروان چڑھانے کی ذمہ داری حکمران طبقات نے اپنے ذمہ لے رکھی ہو وہاں دوسرے نظریات کی پذیرائی کے لئے فضا موافق نہیں ہوتی خواہ وہ ریاست کسی مذہب کی راسخ العقیدیت نے یرغمال بنائی ہو یا کسی اور نظریئے کی گہری چھاپ کے زیر اثر ہو۔ وہاں آزادانہ طور پر دوسرے نظریات کو پنپنے کا موقع نہیں ملتا۔ اسٹالن (Stalinist) استبدادیت اور ہٹلر کی فاشزم نے بھی اپنے اپنے دور میں اس رجحان کو

روا رکھا۔ دوسرے نظریات کو دبانے کے لئے بہیمانہ قسم کا رویہ اپنایا۔

تو ایسے تمام ممالک یا ریاستیں جہاں کوئی بھی نظریہ راسخ العقیدیت یا بنیادی پرستی کی راہ اپنالے وہاں سماجی علوم اور خصوصاً فلسفہ پر مشکل اور کٹھن دور آ جاتا ہے۔ چلئے باقی علوم میں تو کچھ گنجائش نکل ہی آتی ہے۔ لیکن فلسفہ کے حوالے سے اس خاص مضمون کی اساس کو برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کا جواب تخصیصی طور پر فلسفہ کے مسائل سے منسلک ہے۔ مابعدالطبیعات کا سورج غروب ہونے سے پہلے فلسفیوں کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ حقیقت مطلق کیا ہے، یہ الٰہیات اور مابعدالطبیعات کا مشترکہ مسئلہ اور سوال تھا۔ الٰہیات کے ہاں جو تعقل (Concept) خدا کا تھا۔ مابعدالطبیعات اور (Ontology) کے ہاں وہ حقیقت اولیٰ یا حقیقت مطلق کی شکل میں سامنے آیا۔

تو طے یہ ہوا اُن مذہبی ریاستوں یا معاشروں میں جہاں خدا کی واحدانیت ایک حتمی اور طے شدہ حقیقت تھی وہاں دوسرے تعقلات کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ جب عیسائیت کے مبلغین کا سامنا منکرین (Pagans) سے ہوا تو اُنہوں نے بھی طاقت کے بل بوتے پر اُن کا قلع قمع کرنا شروع کر دیا اس طرح نظریات کی یہ مسلح جنگ یہودیت، مسیحیت اور اسلام کے مابین بھی تھی۔

پاکستان میں مذہبی بنیاد پرستوں کا یہ دعویٰ ہے کہ چونکہ یہ ریاست اسلام کے نام پر بنی ہے اس لئے حقیقتِ اولیٰ یا مطلق کے لئے توحید کے علاوہ کسی اور قسم کے نظریات اگر سماجی علوم کے تحت زیرِ بحث آتے ہیں تو اُن کی اس اسلامی ریاست میں کوئی گنجائش نہیں۔ گو ریاست کے نظام کو چلانے والے آئین کی ساری ساخت مغربی انداز کی ہے لیکن قرارداد مقاصد میں حاکمیت اعلیٰ کا مسئلہ طے کرنے کے بعد اور اُسے آئین کا حصہ بنا کر سارے آئین کی تعبیر اُسی حوالے سے ہونے لگی بعدازاں اس شق کو دوہرایا جانے لگا کہ تمام قوانین شریعت کی رو سے اسلامی رنگ میں رنگے جائیں گے۔

اس کا اثر براہ راست فلسفہ پر بھی ہوا کیونکہ فلسفہ میں حقیقت مطلق کے بارے میں اگر واحدانیت سے روگردانی کی جاتی بھی تھی یا ہے تو انتہائی معذرت خواہانہ انداز میں۔ جس کی گفتگو

صرف سرگوشیوں میں کی جاسکتی ہے اور اُس کا برملا اظہار ممکنات میں سے نہیں کیونکہ اُس پر قدغن لگائی جاتی ہے۔اس لئے عمومی طور پر طالب علم ایسے مباحث میں اُلجھنے سے گریزاں رہتے ہیں اور فلسفہ کے بارے میں انتخاب پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

جہاں تک اس مضمون میں اعلیٰ تحقیق کے مسائل ہیں تو عام رجحان یہ رہا ہے کہ مسلم فلاسفر سے متعلق مضامین کی زیادہ پذیرائی کی جاتی ہے اور تھیسس اور مقالوں کے انتخاب میں اُن موضوعات کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی جو عمومی تعلیمی فضا سے انحراف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

منہاجی

فلسفہ پڑھانے کے ڈھنگ میں ایک طرح کی بے قاعدگی پائی جاتی ہے۔فلسفہ کی بنیادی نشست و برخاست کے بارے میں ابتدائی تعلیم کا مکمل فقدان ہے۔بغیر کسی منصوبہ بندی کے مابعدالطبیعات، منطق، اخلاقیات، تاریخ فلسفہ مغرب اور تاریخ مسلم فلسفہ کے بارے میں لیکچر دیئے جاتے ہیں اور طالب علم یہ سمجھ نہیں پاتا ہے کہ کس بات کو کس خانے میں فِٹ کرے، اور جب ایم اے کرنے کے بعد فارغ التحصیل ہوتا ہے تو ایک علم کی عمومی سوجھ بوجھ ہونے یا چند ایک اصطلاحات کا وقوف ہونے کے علاوہ اُس کا علم اُس سے باہر کی حدوں کو نہیں پھلانگتا۔

جیسا کہ کانٹ کے بعد فلسفہ کا مضمون نظریہ علم (Epistemology) کے گرد مرتکز ہو گیا اور فلسفہ کے تمام مکاتیب فکر اُسی حوالے سے اپنی شناخت کرنے لگے۔لیکن تدریس کے دوران نظریہ علم کے حوالے سے دو بڑے مکاتیبِ فکر کی تقسیم یعنی عینیت پرستی (Idealism) اور مادیت (Materialism) کے بارے طالب علموں کو واضح طور پر کچھ نہیں بتایا جاتا اور ایک سائنسی منہاج (Scientific Method) کو نہیں اپنایا جاتا، تاکہ طالب کا تناظر صحیح ہو سکے اور وہ اُن باقی مکاتیبِ فکر کو بھی فہم میں نہیں لاسکتا جو ان دو بنیادی مکاتیب فکر سے پھوٹتے ہیں۔

اُسے یہ نہیں بتایا جاتا کہ عقلیت (Rationalism) تجربیت (Empiricism) موضوعی عینیت (Subjective Idealism) معروضی عینیت (Objective Idealism) میکانکی مادیت (Mechanical Materialism) اور جدلیاتی مادیت (Dialectical

(Materialism) کا تعلق کس کیٹگری یا زمرے سے ہے۔ اسی طرح نئی تحریکات یعنی وجودیت (Existentialism) منطقی اثباتیت (Logical Positivism) اور ردِ تشکیل (De-construction) کس ضمن میں آتی ہیں۔ اساتذہ اپنے مطالعہ کو محدود رکھتے ہیں۔

ہمارے ہاں تاریخ اور فلسفہ کو باہم ناگزیر نہیں سمجھا جاتا اور فلسفیانہ مکاتیب فکر کو تاریخ کے تناظر میں رکھ کر نہیں دیکھا جاتا اور نہ ہی فلسفہ تاریخ کے مضامین کو اس حوالے سے کارآمد سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ ہیگل (Hegel) کے فلسفہ تاریخ کے اور مغربی فلاسفہ کے ہاں یہ ایک اہم موضوع ہے یہی سلوک مارکس (Marx) کے نظریہ تاریخی مادیت سے کیا جاتا ہے۔

پاکستان میں فلسفہ کے مضمون کے وقوف کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے لئے ایک ایسا منہاج وضع کیا جائے جہاں بنیادی اصطلاحات، تعقلات اور مکاتیبِ فکر طالب علموں کے لئے بالکل واضح ہو جائیں اور اُن کا تناظر اُن کے ذہن میں اس طرح بیٹھ جائے کہ وہ فلسفہ کی کسی کتاب کو بھی اُٹھا کر آسانی سے پڑھ سکیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو فلسفہ کا مضمون پاکستان میں مزید انحطاط کا شکار ہوگا۔

اطلاقی

عمومی طور پر طالب علم اور اُن کے والدین یہ سوال کرتے ہیں کہ فلسفہ پڑھ کر کریں گے کیا؟ اگر صحیح تناظر میں جائزہ لیا جائے تو یہ سوال بے معنی نہیں ہے۔ کیونکہ پیشہ وارانہ دائرہ کار میں فلسفہ کے مضمون کی کہیں مانگ نہیں ہے سوائے چند اُن نشستوں کے جہاں فلسفہ کے اساتذہ کی ضرورت ہوتی وہ بھی اگر کوئی اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دے یا پھر ریٹائر ہو جائے وگرنہ ایک لمبی مدت کے لئے انتظار کرنا پڑتا ہے۔

جہاں تک فلسفہ کے مضمون کے انتخاب کا مسئلہ ہے تو عمومی طور پر دو قسم کے طلباء اس کا انتخاب کرتے ہیں ایک تو وہ ہیں جو حقیقتاً فلسفہ میں دلچسپی رکھتے ہیں اور اس دنیا اور کائنات کو ایک مہا بیانیے کے طور پر سمجھنا چاہتے ہیں اور دوسرے وہ طالب علم ہیں جنہیں دوسرے مضامین میں داخلہ نہیں ملتا اور وہ چار و ناچار فلسفہ میں داخلہ لے لیتے ہیں۔ پہلی قسم کے طالب علم کا زیادہ تر تعلق اُن گھرانوں سے ہوتا جو نسبتاً خوشحال ہوتے ہیں اور ماں باپ اپنے بچوں کی خواہش کا احترام

کرتے ہوئے اُن کی اس خواہش کے سامنے سرِتسلیم خم کر دیتے ہیں اُن کے تعلقات حکمران طبقات سے کسی نہ کسی طریقے سے استوار رہتے ہیں اس لئے فلسفہ میں ایم اے کرنے کے بعد بھی اُنہیں اپنی خواہشات کے مطابق نوکریاں مل جاتی ہیں۔ جب میلٹس میں چھٹی صدی ق۔م میں فلسفیانہ مباحث شروع ہوئے تو وہ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے نوجوان تھے جو مغربی تاریخ فلسفہ میں پہلے فلسفی کہلائے میری مراد تھیلیز (Thales) انگیزی مینڈز (Anaximandes) اور انگیز مینیز (Anximenes) سے ہے، اور دوسری قسم کے طالب اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارنے کے بعد یا تو مایوس ہو جاتے ہیں یا پھر کوئی معمولی درجے کی ملازمت قبول کر لیتے ہیں۔

ہمارے ہاں فلسفے کو اطلاقیات سے منسلک نہیں کیا گیا۔ ریاستی منصوبہ بندی میں ایسے وژن کی ضرورت ہوتی جہاں فکر و دانش سے وابستہ لوگ ریاست کے تمام اداروں کو ایک لڑی میں پرو کر ایسی ہم آہنگی کو جنم دیں جو حکومتی دستور کی آئینہ دار ہو۔

پاکستان: امریکی امداد کے بوجھ تلے

حمزہ علوی/ترجمہ: ڈاکٹر ریاض احمد شیخ

''ایک ناقابل انکار (inescapable) حقیقت (conclusion) یہ ہے کہ بین الاقوامی امداد کا ایک بڑا فلاحی جذبہ خیرات (philanthropy) ہے۔'' یہ خیالات پاکستان ادارہ برائے بین الاقوامی تعلقات (PIIA) کی طرف سے شائع ہونے والے جریدے Pakistan Horizon کے ایک حالیہ شمارے میں ایک مضمون نگار نے رقم کئے ہیں۔ یہ خیالات ایک بار پھر اس تاثر کو مزید مستحکم کرنے والی بات ہے جس کا خیال یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک کو ملنے والی امداد خوشحال ممالک کی جانب سے خالصتاً انسانی ہمدردی کی بنیاد پر دی جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں تک امداد کا تعلق ہے اسے فراہم کرنے والے ممالک میں امداد دینے کے لیے عوام میں کافی جذبہ اور مقبولیت موجود ہے۔ یہ جذبہ بین الاقوامی سطح پر اس تصور کی توسیع ہے جس کے تحت تمام انسانوں کے مساوی حقوق تسلیم کیے گئے ہیں۔ لیکن ان عملی لوگوں کے متعلق کیا کیا جائے گا جو کہ خوشحال ممالک کے معاملات چلا رہے ہیں اور بین الاقوامی امداد کے عمل کو کنٹرول کر رہے ہیں؟ اس امداد کے عمل میں وہ کون سا طریقہ کار استعمال کر رہے ہیں؟ اس کے ذریعے وہ بین الاقوامی سیاست میں اپنے کون سے اہداف حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں؟ اور کس مرحلے پر بین الاقوامی کاروبار اس پر اپنا کنٹرول کھو دیتا ہے؟ یہ وہ خیالات ہیں جن پر ہمارے وہ افراد جو کہ اس وقتی امداد کے حصول کے لیے ہمارا مستقبل گروی رکھ چھوڑتے ہیں وہ بالکل دھیان نہیں دیتے۔ اسی طرح بہت کم جمہوریت پسند لوگ ہیں جو کہ امداد دیئے جانے اور بیرونی امداد وصول کرنے کے عمل کی تحقیقات کرنے کی زحمت کرتے ہیں۔ بہت زیادہ

چیزوں کو بڑے عام سے انداز میں دکھایا جاتا ہے۔ ہمارے اس مضمون کا مقصد ان تمام مراحل (processes) کا جائزہ لینا ہے۔

امر یہ کہ ایک سرکاری امریکی دستاویز بیرونی امداد کے 'اغراض ومقاصد' کو کچھ اس طرح بیان کرتی ہے:

''تکنیکی امداد کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو کہ ایک حکومتی enterprise کے طور پر اپنے مقاصد یا پھر کسی اور مقاصد کے لیے فراہم کی جائے۔ حکومت امریکہ نہ تو خود ایک خیراتی ادارہ ہے اور نہ ہی امریکی عوام کے خیر سگالی کی روح کو آگے بڑھانے کا درست وسیلہ ہے۔ ان احساسات کو آگے بڑھانے کا بہترین راستہ وہ ان گنت نجی خیراتی تنظیمیں اور مذہبی ادارے ہیں جو کہ اس نیک کام کو بڑے احسن طریقے سے بیرون ممالک سرانجام دیتے آ رہے ہیں۔ تکنیکی امداد ان دیگر کئی طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے جو کہ امریکہ کو میسر ہے وہ اس طریقے کے ذریعے اپنی خارجہ پالیسی کو آگے بڑھانے اور اس کو اپنے قومی مفادات کو بیرون ممالک فروغ دینے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ تکنیکی امداد کے سوا خارجہ پالیسی کے دیگر قوت طریقہ کار میں اقتصادی امداد، فوجی امداد، سکیورٹی معاہدات، سمندر پار اطلاعاتی پروگرام، اقوام متحدہ اور دیگر بین الاقوامی اداروں میں شمولیت، انسان افرادی کے تبادلہ (exchange) پروگرام، تجارتی اور نرخی (tarrif and trade) پالیسیاں، اضافی زرعی اجناس کی نکاسی کی پالیسیاں اور سفارتی نمائندگی کا روایتی عمل شامل ہیں۔''(۱)

اگرچہ یہ الفاظ سرابی (disillusioning) ہیں لیکن بہرحال یہ کم از کم غور طلب ضرور ہیں۔ یہ کم از کم ایک ناقابل انکار معاملے کی طرف تو اشارہ کرتے ہیں یعنی کہ ترقی پذیر ممالک کو فراہم کی جانے والی امداد کے سوال کو کسی بھی ملک کی خارجہ پالیسی کے عمومی مقاصد سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ بیرونی امداد کا طریقہ کار اور مقاصد کو امداد فراہم کرنے والے ممالک کی بالادست سیاسی قوتیں طے کرتی ہیں اور اس کے ذریعے وہ بین الاقوامی تعلقات میں اپنے مقاصد کے حصول کو یقینی بناتی ہیں۔ بین الاقوامی امداد کی فراہمی کے ذریعے بے لوث مدد فراہم کرنے کے مقاصد کو اس وقت تک حاصل نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اس امداد کے پس پشت حقیقی مقاصد یعنی امداد دینے والے ممالک کے vested مقاصد کا خاتمہ نہیں کیا جائے جن کا اصل مقصد اس کے

ذریعے اپنے قومی مفادات کا حصول ہے۔ یہ کہ کیا کیا جائے اور کس طرح کیا جائے؟ اس معاملہ کا فیصلہ کرنے کا اختیار تو امریکی شہریوں کا ہے۔ اگر وہ عظیم انسانی عظمت کے فلسفے پر یقین رکھتے ہیں تو پھر انہیں یہ بھی سوچنا ہوگا کہ اس تصور کو کس طرح بین الاقوامی سطح تک پھیلایا جائے۔ ان کی خوشحال قوم اور ان قوموں کے درمیان جن کی سماجی اور اقتصادی ترقی کو نوآبادیاتی دور کے دوران روک دیا گیا، ان کے تعلقات کیسے ہوں گے۔

پاکستان اور دنیا کے دیگر ترقی پذیر ممالک اس معاملے کو مختلف انداز سے دیکھتے ہیں۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس حقیقت کو بخوبی جانیں کہ کس طرح بین الاقوامی امداد ہمارے سیاسی اور اقتصادی نظام پر اثر انداز ہو رہی ہے اور کس طرح یہ ہمارے جمہوری عمل کو روکنے اور اقتصادی ترقی کو تباہ کرنے کا باعث بنی ہے۔ فلاحی (altruistic) امداد کے سراب کو (جس کے متعلق یہ تصور پایا جاتا ہے کہ اس کے بغیر ہمارا معاشرہ ختم ہو جائے گا) مزید حقیقت پسندانہ طریقہ کار کی نظر سے جانچنا ہوگا۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا اس امداد کے نتیجے میں ملنے والے وسائل حقیقی فوائد بھی پہنچا رہے ہیں یا پھر آگے چل کر یہ ثانوی نتائج کے طور پر مزید نقصان (deficit) کا باعث بن رہے ہیں۔ ہمیں اس بات کا بھی جائزہ لینا ہوگا کہ اس بیرونی امداد کی فراہمی کے باعث کس طرح ہمارے وسائل کا وسیع پیمانے پر نقصان ہو رہا ہے جن کا کہ ہم بہتر استعمال کر سکتے تھے لیکن بیرونی اتحاد کے تحت عائد ہونے والی شرائط کے باعث ہم ان کا مفید استعمال نہیں کر سکے اور اس کے باعث ہماری شرح نمو (rate of growth) نہایت کم ہوتی جا رہی ہے۔ ہمیں یہ بھی ضروری طور پر محسوس کرنا چاہیے کہ کس طرح اس کے نتیجے میں ہماری آزادی (خودمختاری) بھی متاثر (undermined) ہو رہی ہے۔

پرانے طرز کی شہنشاہیت کو بیرونی سرمایہ کاری اور براہ راست نوآبادیاتی حکمرانی کے ساتھ بہت کم شناخت کی گئی ہے۔ کچھ لوگ بیرونی سرمایہ کاری کی سطح کو بادشاہت کے پیمانے (barometer) کے طور پر دیکھتے ہیں۔ لیکن بعد از جنگ (جنگ عظیم دوئم) کے بعد کی دنیا میں پاکستان جیسے ممالک میں براہ راست بین الاقوامی سرمایہ کاری کا حجم کم رہا ہے اور حقیقی معنوں میں وسائل کی منتقلی کا عمل کچھ زیادہ نہیں رہا ہے۔ ایک طرف جہاں کلاسیکی ماڈل یہ بتاتا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک (جہاں آجرتیں مہنگی ہیں) وہاں سے غریب اور ترقی پذیر ممالک میں کم اُجرتوں پر

محنت کشوں کے مہیا ہونے کے باعث زائد (Surplus) سرمایہ غریب ممالک کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔لیکن یہاں دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کے لیے زیادہ دلچسپی کی بات منڈیوں پر قابض ہونے اور خام مال کی فراہمی کے ماخذ پر قابض ہونا زیادہ اہمیت رکھتا ہے بنسبت کہ ان علاقوں میں براہ راست سرمایہ کاری کرنے کے مواقع تلاش کرے۔

پاکستان میں ۳۱ دسمبر ۱۹۵۶ء (جب پہلی مرتبہ ملک میں بیرونی سرمایہ کاری کا سروے کیا گیا) اور ۳۱ دسمبر ۱۹۵۹ء کے درمیان مینوفیکچرنگ کے شعبے میں بیرونی سرمایہ کاری صفر کے برابر تھی۔لیکن بہرحال اس عرصے میں بیرونی سرمایہ کاری کی مد میں ۴۰ فیصد اضافہ دیکھا گیا۔اس میں زیادہ اضافہ کامرس میں دیکھا گیا جبکہ دوسرے درجے پر کان کنی (mining) کا شعبہ رہا۔کیونکہ مینوفیکچرنگ کے شعبے میں کوئی بیرون سرمایہ کاری نہیں کی گئی اس لیے سرمایہ کاری کے طرز (pattern) میں عموی طور پر (overall) منتقلی (shift) دیکھنے کو ملتی ہے۔ بین الاقوامی ملکیت کے اثاثوں سے کسی بھی صورت میں، بیرونی کمپنیوں کی حرکیات (activists) کا درست اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کیونکہ اکثر ان بیرونی کمپنیوں نے مقامی بینکوں سے قرض لے کر سرمایہ کاری کی ہوتی ہے اور انہیں یہ قرض کوئی بڑی ضمانتیں (mortgage) فراہم کیے بغیر ہی باآسانی حاصل ہوجاتا ہے جبکہ ان کے مقابلے میں مقامی کمپنیوں کو اپنے قرضوں کے حصول کے لیے بڑی مستحکم ضمانتیں فراہم کرنا پڑتی ہیں۔مزید یہ کہ مینوفیکچرنگ میں کی جانے والی بیشتر سرمایہ کاری چاہے وہ مقامی سطح کی ہو یا بیرونی سرمایہ کی وہ حقیقی معنوں میں مقامی صنعت کی ترقی کے لیے وقف نہیں ہوتی بلکہ اس کا حدف پیکنگ یا پھر باہر سے درآمد شدہ پرزوں کو جوڑنے پر خرچ ہوتا ہے۔اس کا مقصد بیرونی ممالک سے درآمدات پر حاصل سہولیات (concessions) سے بھرپور مستفید ہونا اور بیرونی مینوفیکچرز کی تیار شدہ اشیاء کے لیے زیادہ سے زیادہ منڈیوں کی تلاش ہوتا ہے۔بہت ہی کم صنعتیں ایسی ہیں مثلاً صابن اور سگریٹ کی صنعتیں جہاں کہ بیرونی کمپنیاں کوئی کام کررہی ہیں اور جنہیں صحیح معنوں میں مینوفیکچرنگ کہا جاسکے اور یہاں ان کی حرکات (activities) نے مقامی enterprise کا گلا گھونٹ دیا ہے۔

بیرونی سرمائے نے پاکستان کے دوسرے پنج سالہ منصوبے (۶۵-۱۹۶۱ء) میں اپنے لیے ایک بڑی جگہ حاصل کی۔ بڑے پیمانے کی صنعتوں تیل اور معدنیات کے شعبوں میں بیرونی

سرمایہ کاری کا حجم ۱۰۳۰ ملین روپے ہوگا جبکہ مقامی کمپنیوں کی سرمایہ کاری ۱۰۴۰ ملین روپے رہی۔ اس کل رقم میں سے دونوں (یعنی بیرونی اور مقامی سرمایہ کاروں) نے ۳۰۰ ملین روپے اسٹاک ایکسچینج کے ذریعے حاصل کیے جائیں جبکہ ۲۵۰ ملین روپے مقامی کمرشل بینکوں سے لیے جائیں گے اور ۶۰ ملین روپے مخصوص صنعتی ترقیاتی اداروں سے قرض لیے جائیں گے۔ اس طرح دوسرے پنج سالہ منصوبے میں بیرونی سرمائے کا حصہ مقامی فرموں کے سرمائے سے نصف زیادہ رہے گا۔ یہ اضافہ کرنا ضروری ہے کہ یہ تخمینے صرف ہمارے وزیرخزانہ کے خوش آئند توقعات نہیں ہیں جنہوں نے کہ ایسے معاملات میں پہلے بھی کئی 'امیدیں' توڑیں ہیں۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے کے آغاز سے قبل ہی انہوں نے اس بات کا اعلان کیا کہ وہ بیرونی سرمایہ کاروں کی طرف سے توقعات سے کئی گنا بڑھ کر زیادہ درخواستیں وصول کر چکے ہیں۔ لیکن اس بیرونی امداد کا بڑا حصہ نجی صنعت کاروں (enterprise) (دونوں پاکستانی اور غیر پاکستانی) کو فراہم کیا جانے والا قرضہ تھا۔ یقیناً ہمیں اس بات کو تسلیم کرنا چاہیے کہ بیرونی سرمایہ کاری ہماری اقتصادی ترقی میں ایک اہم کردار ادا کرے گی لیکن ہمیں اس بات کا بھی احساس ہونا چاہیے کہ امریکی امداد کے اس مہیا کیے جانے کے باعث امریکہ ہماری حکومت پر کس قدر اثر انداز ہوگا اور امریکی فرم (Firms) کو اس کے باعث تعمیرات اور صنعتوں میں کس قدر فوقیت حاصل ہو جائے گی۔ درحقیقت اس تمام سرمایہ کاری کا اصل حدف امریکی مصنوعات اور خدمات (services) کے لیے پاکستان کی محفوظ منڈیوں کا حصول اور اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کے ترقی کے عمل پر اثر انداز ہو کر اس کو اس راستے پر ڈالنا تاکہ یہ صرف ترقی یافتہ صنعتی ممالک کی ضروریات کو خاطر خواہ پورا کر سکے نہ کہ اپنے آپ کو صنعتی ترقی کی راہ پر گامزن کر سکے۔

کینیڈی کا المیہ:

ڈیموکریٹ پارٹی کی انتخابی ٹیم کے ریڈیکل طرز (tone) اور کینیڈی کے انتخابی جلسوں کی نعرے بازیوں نے اس اُمید کو جلا بخشی کہ امریکہ میں روشن خیالی (لبرل ازم) کی بحالی (Revival) ہوگی اور ماضی کی پالیسیوں سے سلسلہ منقطع کیا جائے گا۔ امریکی عوام کے نئے تبدیل شدہ رویے کا کینیڈی کے اس لہجے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جس کے تحت اس نے ماضی کی امریکہ کی بیرونی

امداد کی پالیسیوں کے منفی پہلوؤں سے لاتعلقی کا اظہار کیا جس کے تحت ترقی پذیر ممالک کی انتہائی دائیں بازو کے رجعت پسند جاگیرداروں کے ساتھ مل کر کام کیا گیا۔لیکن بدقسمتی سے ماضی سے تعلق توڑنے کا وعدہ وقتی ثابت ہوا۔کینیڈی کی مہم کے دوران لبرل خیالات کی باتیں اور بعدازاں کینیڈی کی 'ماہر'(Expert) کابینہ میں لبرلز کے مقام بنالینے کے باوجود جلد ہی یہ حکومت پسپائی (defensive) کی طرف چلی گئی۔صدر کینیڈی کی سامنے آنے والی پالیسیاں بھی کچھ کم خطرناک نہیں کیونکہ یہ بھی ترقی پذیر ممالک کے سماجی ڈھانچے کو اس کی موجودہ شکل میں تسلیم کرنے کو تیار ہے۔اس صورت میں اب صرف ایک ہی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ کس طرح صرف کوئی نئے طریقے(techniques) تلاش کیے جائیں جو کہ اس نئی صورتحال میں موثر ثابت ہوسکیں۔

لائیڈ جانسن Lyndon Johnson کے انڈیا اور پاکستان کے حالیہ دورے نے کینیڈی انتظامیہ کی پالیسیوں میں موجودہ تضادات کو عیاں کردیا ہے۔جانسن کے ''غیر جانبداری کے اصول اپنانے''(Coming to terms with neutralism) کے ساتھ ساتھ ہمیں انڈیا کی غیر جانبداری(neutralism) کے رجحان میں آہستہ آہستہ کمی(erosion) نظر آرہی ہے جس کے پس پشت امریکی امداد(US Aid) کے باعث اس پر پڑنے والا دباؤ بھی ہے۔جواہر لعل نہرو کی پختہ (determined) یقین دہانی کے باعث ابھی تک انڈیا کی غیر جانبداری کی پالیسی کا مکمل خاتمہ نہیں ہوا ہے لیکن اس کے باوجود نہرو کو بھی بالآخر بین الاقوامی انحصار (Dependency) کے باعث اس ناقابل برداشت دباؤ کے آگے جھکنا پڑے گا۔کیوبا کے معاملے کے بعد تو کینیڈی انتظامیہ سے اب بہت کم اُمیدیں لگا رکھنی چاہئیں۔

کینیڈی انتظامیہ اب مستقبل کے بارے میں کس طرح سوچ رہی ہے اس کو سمجھنے کے لیے فارن افیئر (Foriegn Affairs) کے اپریل ۱۹۶۱ء میں جان کینتھ گلبرتھ (John Kenneth Galbraith) کا شائع ہونے والا مضمون بڑا اہم ہے۔یہ سب سے زیادہ پریشان کردینے والی دستاویز ہے۔اگر یہی تحریر کسی اور پروفیسر نے تحریر کی ہوتی تو اسے باآسانی یہ کہہ کر مسترد کیا جاسکتا تھا یہ ایک پروفیسر کی انفرادی تعلیمی(Academic) کوشش ہے۔جو کہ حقیقت سے مکمل طور پر آگاہی نہ ہونے کے باعث یہ بات رقم کرگیا ہے۔لیکن گلبرتھ کی تحریر کو کسی بھی صورت نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔گلبرتھ امریکہ کا ایک انتہائی بااثر دانشور ہے جس کو

صدر کینیڈی نے انڈیا کے لیے امریکی سفیر چنا ہے۔گلبرتھ اپنے اس مضمون کا آغاز ایک درست (justified) تنقید سے کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے 'ماضی میں دی جانے والی بیرونی امداد صرف vested مفادات کو بچائے رکھنے پر خرچ ہوگئی۔اس لیے محض اس امداد میں اضافے کی وجہ سے شرح نمو میں اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔۔گلبرتھ محسوس کرتا ہے کہ سماجی اصلاحات (reform) کی فوری ضرورت ہے۔لیکن اس کا تعین کون کرے گا کہ کس قسم کی اصلاحات (reform) کی ضرورت ہے؟ ہم کس قسم کے معاشرے کو پروان چڑھائیں؟ ضروری نہیں ہے کہ پاکستان میں تعینات امریکی امداد (US Aid) کے اہلکار جس قسم کی تبدیلی کو مناسب اور بہتر سمجھیں وہی تبدیلی ہمارے لوگ بھی پسند کرتے ہوں۔امریکہ کی طرف سے اس سلسلے میں وضع کی گئی پالیسیاں جو کہ تفریق اور تعصب پر مبنی ہیں جس کے تحت نجی اور سرکاری enterprise میں تفریق برقرار رکھی گئی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ مزید تفریق یہ رکھی گئی ہے کہ بیرونی سرمائے کو ''ٹیکس کی چھوٹ'' (Tax holiday) جبکہ مقامی سرمائے پر ٹیکس کا بھاری بوجھ ڈالا گیا ہے۔اپنے ہم وطنوں کے لیے تعصب پر مبنی ایسی پالیسیوں کو شاید ہم پاکستانی قبول نہ کریں۔

گلبرتھ کا منصوبہ (The Galbraithian Blue Print):

گلبرتھ کے پاس سماجی تحریکوں اور اپنے معاشروں کی خود تعمیر کرنے والے آزاد افراد کو متحرک (mobilize) کرنے کے لئے کوئی وقت نہیں۔اس کے بجائے پدرانہ assumptins کے تحت آگے بڑھتے ہوئے وہ یہ ذمہ داری امداد فراہم کرنے والے، امریکہ کے حوالے کر دیتا ہے اور اس کو یہ اختیار سونپ دیتا ہے کہ وہ ترقی کا طریقہ کار وضع کرے جسے ہمیں (پاکستان کو) ہر صورت میں اپنانا ہوگا۔اس سلسلے میں وہ ایک تجویز دیتے ہوئے امریکہ میں ''ترقی کا ادارہ'' (Development Institute) قائم کرنے کی تجویز دیتا ہے جس میں امریکی ماہرین کا اسٹاف مقرر کیا جائے جو کہ ان منصوبوں پر عملدرآمد کا تجربہ رکھتا ہو اور اس عملے کے ذریعے ہی امداد وصول کرنے والے ترقی پذیر ممالک میں دی جانے والی امداد پر عملدرآمد کے لیے ایک سات سالہ 'مثبت ترقیاتی منصوبہ' تیار کیا جائے۔مزید یہ کہ اس منصوبے پر عمل درآمد کسی بھی صورت میں امداد وصول کرنے والے ممالک کے حوالے نہ کیا جائے، کیونکہ وہ اس کام کو شاید

پوری دلجمعی کے ساتھ انجام نہ دے سکیں۔گلبرتھ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ تجویز دیتا ہے کہ امداد وصول کرنے والے ممالک میں 'منصوبہ بندی اور ترقی کا ایک بااختیار ادارہ'' (Planning and Development Authority) بنائی جائے۔ یہ 'اتھارٹی' حکومت سے بالادست (Super-government) ایک 'اتھارٹی' ہونا چاہیے جس کا تمام عملہ امریکی حکام پر مشتمل ہو۔گلبرتھ کا مزید خیال ہے کہ اتھارٹی کو دیئے جانے والے وسیع اختیارات کے باعث اس کو اس بات کا مکمل اختیار دیا جانا چاہیے کہ وہ کسی بھی اہمیت کی چیز بشمول خزانہ، صنعتی پالیسی، زراعت، تعلیم اور مزید یہ کہ سماجی اور اقتصادی شعبے میں جامع طور پر منصوبہ سازی کا کام کر سکے۔ اس طرح دیکھا جائے تو گلبرتھ کی تجاویز درحقیقت ہم سے ہماری آزادی چھیننے کا منصوبہ ہے۔

امریکی امداد کا پاکستان میں داخلہ:

حکومت پاکستان نے لیاقت علی خان کی قیادت میں جو خارجہ پالیسی اپنائی اس کا واضح طور پر ادراک نہیں کیا جاسکا۔ لیاقت (علی خان) کی انڈیا میں کانگریس کی حکومت کی طرف شدید دشمنی (bitter hostility) اور (آزادی کے بعد) انڈیا کے عزائم (intentions) نے ان کی غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی کی تشکیل میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ اپنی اس دشمنی اور خوف کے باوجود وہ سرد جنگ کی عالمی سیاست میں تمام بین الاقوامی معاملات میں نہرو کے ساتھ کھڑے نظر آئے۔(امریکی صدر) ٹرومین کی انتظامیہ اور برطانیہ کی لیبر حکومت کو ابھی پاکستان میں اپنی دلچسپی ظاہر کرنا شروع کر دی تھی۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء سے قبل تک پاکستان کو کوئی امداد وصول نہ ہوئی تھی۔

لیاقت (علی خان) کا اکتوبر ۱۹۵۱ء میں قتل ہوگیا، اور تقریباً اسی وقت برطانیہ میں لیبر حکومت کا بھی خاتمہ ہوا۔ آنے والے آئندہ برسوں میں پاکستان میں برطانیہ کا اثر ورسوخ بڑھتا گیا لیکن یہ عرصہ عمومی طور پر کوئی خاص اہمیت (remarkable) کا حامل نہیں۔ ۱۹۵۰ء میں لیبر سرکار کے زیر اہتمام شروع کیا جانے والا کولمبو پلان بڑی کامیابی سے سرانجام پایا۔ بہرحال اس منصوبے کے تحت ملنے والی امداد کافی کم تھی۔

۱۹۵۳ء میں امریکہ پاکستانی سیاست میں بڑی ڈرامائی انداز میں داخل (entry) ہوا۔ یہ

وہ پہلا سال تھا جس میں امریکہ نے پاکستان کو ایک قابل ذکر امداد فراہم کی۔ اس صورتحال میں تبدیلی بڑی واضح تھی، ایک طرف تو امریکہ میں تبدیلی کے بعد آئزین آور کی انتظامیہ کا حکومت کی باگ ڈور سنبھالنا اور ڈیلس (Dallas) کی طرف سے غیر مشکوک (unssuspecting) دنیا کا تصور (unleashing) تھا۔ جبکہ دوسری طرف پاکستان میں گندم کی کمیابی کے مسئلے کو اولین نوعیت کا مسئلہ بنا کر پیش کیا گیا۔ امریکہ کی طرف سے گندم کی فراہمی کرنے کے منصوبے (package deal) نے امریکی حکومت کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ پاکستان میں اپنی پسند کے شخص محمد علی بوگرہ کو وزیراعظم نامزد کروا سکے۔ بوگرہ اس وقت امریکہ میں پاکستان کے سفیر کی ذمہ داری نبھا رہے تھے۔ اس وقت سے لے کر امریکہ پاکستان کے معاملات میں انتہائی غالب (dominent) کردار ادا کرتا چلا آیا ہے۔

جدول (ii) پاکستان کو امریکی امداد کی فراہمی کی تفصیلات:

اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ امریکی امداد میں بڑا واضح اضافہ ۱۹۵۵ء کے بعد دیکھنے میں آیا۔ ۱۹۵۴ء اس لحاظ سے پاکستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس سال ملک میں جمہوری تحریک کو آگے بڑھنے کا موقع ملا اور مشرقی پاکستان میں ہونے والے انتخابات میں حکمران جماعت مسلم لیگ کا انتخابات میں مشرقی پاکستان سے صفایا ہوگیا۔ مشرقی بنگال میں مرکزی سرکاری پر امریکہ کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ پر شدید تنقید کی جارہی تھی۔ یہ وہی سال تھا جب ملک میں دستور کو پس پشت ڈالتے ہوئے ایک آمرانہ حکومت بنائی گئی جس نے پارلیمان سے منظوری لیے بغیر امریکہ سے فوجی معاہدے کر لیے۔ اسی سال پاکستان اور ترکی میں ہونے والے ایک معاہدے کے نتیجے میں معاہدہ بغداد (Baghdad Pact) کی بنیاد رکھی گئی جسے بعدازاں سینٹو (CENTO) کے نام سے پکارا گیا۔ پاکستان سیٹو (SEATO) کی تشکیل میں بھی شریک رہا۔

۱۹۵۳ء کا بحران:

بین الاقوامی حالات و واقعات جنہوں نے ۱۹۵۳ء کے بحران میں بڑا اہم کردار ادا کیا ان

کی اہمیت پاکستان کے اندرونی واقعات سے کہیں زیادہ ہے۔شاید اس میں سب سے زیادہ اہمیت کا واقعہ جان فوسٹر دولس (John Foster Dulles) کا برسر اقتدار آنا تھا۔ اس مرحلے پر امریکہ کی دلچسپی میں مشرق بعید (مشرق وسطی اور جنوب مشرقی ایشیا کے کچھ حصوں کی طرف جو کہ اس سے قبل برطانیہ اور فرانس کے زیر اثر رہے تھے) کی طرف واضح تبدیلی تھی۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں اس عرصے میں ہونے والی سب سے نمایاں تبدیلی ایران میں مصدق سرکار کی طرف سے تیل کی صنعت کو قومیائے جانے کا عمل تھا۔اس وقت تک اس خطّے میں امریکی مفادات بڑی حد تک پھیل چکے تھے اور اس خطّے میں کنٹرول حاصل کرنے کے لیے امریکہ کی دلچسپی بڑھ گئی تھی کیونکہ اس کی وجہ سے امریکی مفادات پر براہ راست اثر پڑ سکتا تھا۔

جغرافیائی بنیادوں پر پاکستان کی اہمیت کئی گنا بڑھ چکی تھی کیونکہ اس علاقے میں 'سیاسی توازن' کو برقرار رکھنے کے لیے فوجی وسائل اور خصوصاً اضافی وسائل کی کسی بھی لمحے ضرورت پڑ سکتی تھی جو کہ کسی بھی ابھرنے والی قوم پرست تحریک (جیسا کہ ایران میں مصدق کی زیر قیادت ابھرنے والی تحریک) کو دبانے کے لیے فوج کی ضرورت پڑ سکتی تھی تاکہ تیل کی آزادانہ فراہمی کو پیش آنے والے خطرات کو کم کیا جا سکے۔اس لیے خیال کیا گیا کہ ایسی کسی تحریک کے ابھر کر سامنے آنے کی صورت میں پاکستانی فوج کی کارروائی کی صورت میں اس کے خلاف اتنی مزاحمت دیکھنے کو نہ ملے جو کہ امریکی فوج کی براہ راست کاروائی کی صورت میں دیکھی جا سکتی تھی۔ان ممالک کی 'قائم حکومتوں' کو بچانے کے لیے امریکہ کی طرف سے براہ راست فوج بھیجنے کے باعث یہاں قوم پرست جذبات مزید زیادہ بھڑک سکتے ہیں۔پاکستان اور اس علاقے کی انحصاری حکومتوں (dependent government) خصوصاً مشرق وسطی اور جنوب مشرقی ایشیا کی حکومتوں کے درمیان قائم ہونے والے اتحاد نیٹو (NATO) اور (ANZUS) کے درمیان رابطہ کاری کا کام کرے گا اور ایک ایسے فوجی اتحاد کو یقینی بنائے گا جو کہ اس پورے علاقے کو اپنے گھیرے میں لے لے گا اور اس میں امریکہ کو مرکزی مقام حاصل ہوگا۔ پاکستان کے ایسے کسی منصوبے میں شریک ہونے کا واضح مطلب اس کی اس گذشتہ پالیسی سے مکمل انحراف ہوگا جو کہ غیر جانبداری کے اصول کو مدنظر رکھ کر لیاقت علی خان کے دنوں میں تشکیل دی گئی تھی۔

لیکن اقتصادی بدحالی اور انتظامی بے ضابطگی اور حکومت کی طرف سے سماجی اصلاحات

(reform) اور اقتصادی ترقی کے نہ ہونے کی وجہ سے حالات خراب ہو چکے تھے۔ لیکن کوریا کی جنگ کے باعث وقتی طور پر پاکستانی خام مال کی قیمتوں میں بہتری کے باعث خوشحالی کا ایک سہراب (illusion) دیکھنے کو ملا۔ کوریا کے بحران کے معاشیات میں آنے والا ابھار بہت جلد ختم (dissipate) ہو گیا، اور نرخ نیچے آنے لگے اور پاکستان اس بحران سے پوری طرح متاثر ہونے لگا۔

اس پس منظر میں ۱۹۵۳ء کی قحط سالی کا خدشہ اچانک سامنے آ گیا۔ اس مرحلے پر امریکہ کی فراہم کردہ گندم جوان حالات میں انتہائی ضروری تھی (چاہے اس کے لیے سیاسی سطح پر کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے) وہ ملک میں آنے والے قحط کو روک سکتی تھی۔ لیکن اس مرحلے پر امریکہ ایک مشکل bargainer ثابت ہوا۔ لیکن اب جب ہم ماضی کے اس واقعے کا جائزہ لیں تو حیرت ہوگی کہ کیا یہ قحط کا یہ خدشہ حقیقت پر مبنی تھا یا پھر 'نام نہاد' بیرونی ماہرین نے اس چھوٹے سے مسئلے پر بڑھ چڑھ کر بیانات دینا شروع کر دیئے اور بیان کو مقامی پریس نے بغیر کسی تحقیق کیے من وعن تسلیم کر لیا اور اس کی خوب اشاعت شروع کر دی۔ جیسے ہی قحط آنے کی باتیں شروع ہوئیں تاجروں نے ذخیرہ اندوزی شروع کر دی۔ اس کے نتیجے میں گندم کی قیمتیں آسمان کو چھونے لگیں۔ آخر کار یہ بات واضح ہوگئی کہ گندم کی اصل کمی ان اعداد و شمار سے کہیں زیادہ کم تھی جن کا بیرونی ماہرین خدشہ ظاہر کر رہے تھے۔ لیکن اس دوران بحران کا پروپیگنڈہ اپنا کام دکھا چکا تھا اور حکومت نے پریشانی اور بوکھلاہٹ میں ہتھیار پھینک دیئے اور 'امریکہ کے دوستوں' کے ایوان اقتدار میں پہنچتے ہی گندم کی قیمتیں کم ہو گئیں اور قحط کے تمام خدشے بھی منظر عام سے غائب ہو گئے۔

پاکستان کے وزیر خزانہ نے مالی سال ۵۳-۱۹۵۲ء کے لیے بجٹ پیش کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ ملک کے دونوں حصوں میں زرعی اجناس کی صورتحال بڑی حد تک قابل اطمینان رہی صرف مغربی پاکستان میں اگست تا نومبر خشک سالی کے باعث خریف کی فصل کے مطلوبہ ہدف حاصل نہ ہو سکے۔ مارچ ۱۹۵۳ء میں اس نے دوبارہ مشرقی پاکستان میں زرعی اجناس کی فراہمی کی قابل اطمینان صورت حال بتائی جبکہ مغربی پاکستان کے متعلق کچھ اس طرح کہا:

''عمومی طور پر زرعی اجناس کی کمی رہی اور کچھ علاقوں میں صورتحال سنگین تھی۔ زرعی اجناس کی صورتحال میں بگاڑ ۱۹۵۱ء میں مون سون میں بارشوں کی کمی کے باعث شروع ہوا۔ یہ صورتحال

مزید خراب اس وقت ہوئی جب جاری خشک سالی کے ساتھ ساتھ دریاؤں کے پانی کا رخ انڈیا کی طرف موڑنے اور مغربی پاکستان کے دریاؤں میں پانی کی کمی نے ربی کی فصل کو بڑی بری طرح متاثر کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۵۲ء میں گندم کی پیداوار ۹۹ء۲ ملین ٹن رہی جبکہ گذشتہ سال یہ پیداوار ۹۳ء۳ رہی تھی۔ نتیجتاً ایک ملین ٹن گندم کی کمی رہی''۔

ملک میں گندم کی مجموعی کمی کا تخمینہ ۵ء۱ ملین ٹن سے کم نہ تھا۔ کیونکہ ماہرین کا خیال تھا کہ ملکی ذخائر بڑی حد تک کم ہو چکے تھے اور ان میں اضافے کی فوری ضرورت تھی۔ جیسا کہ آنے والے سال یعنی ۳-۱۹۵۲ء کے دوران گندم کی پیداوار میں مزید کمی کا اندیشہ تھا اس لیے اس کی کمی کا تخمینہ ۵ء۲ ملین ٹن تک لگایا گیا۔ لیکن اس کے برعکس صورتحال حیران کن تھی، کیونکہ ۵۱-۱۹۵۰ء وہ مسلسل تیسرا برس تھا جس کے دوران ملک میں گندم کی بڑی بھرپور پیداوار حاصل ہوئی تھی اس لیے اس کا کافی ذخیرہ موجود ہونا چاہیے تھا۔ فروری ۱۹۵۳ء کے پہنچنے تک گندم کی حصول کے لیے بیرونی امداد طلب کی گئی۔ وزیر خزانہ نے ۵۵-۱۹۵۴ء کا مالی بجٹ پیش کرتے ہوئے یہ بات بتلائی کہ آسٹریلیا سے ۴۳۰۰۰ ٹن اور کینیڈا سے ۱۶۰۰۰ ٹن گندم وصول کی جا چکی تھی۔ امریکہ نے پاکستان کی طرف سے کی گئی درخواست پر کئی ماہ تک کسی قسم کی کوئی یقین دہانی نہ کرائی حالانکہ پاکستان کو امریکہ سے سب سے زیادہ امیدیں وابستہ تھیں۔ اسی دوران محلاتی سازشیں اندرون خانہ شروع ہو چکی تھیں۔ مئی ۱۹۵۳ء میں خواجہ ناظم الدین کی سرکار کا خاتمہ ہوا اور (مرحوم) محمد علی بوگرہ نے حکومت کی باگ دوڑ سنبھال لی۔ حکومت میں اس تبدیلی کے تقریباً ساتھ ہی امریکہ نے ۷ لاکھ ٹن گندم فراہم کرنے کا اعلان کیا جبکہ ۳ لاکھ ٹن اضافی گندم مختص کرنے کا عندیہ بھی دیا جو کہ مزید ضرورت کی صورت میں اضافی طور پر فراہم کی جا سکتی تھی۔ لیکن اس وعدے کو عملی جامع پہنچانے میں مزید کئی ماہ لگے، ضروری دستوری کاروائیوں اور سمندری راستے سے منتقلی کے لیے تیاری کے مرحلے میں بھی کافی ضروریات حائل تھیں۔ ان تمام مراحل میں ایک سال صرف ہو گیا اور ایک برس گزر جانے کے بعد پہلی جہازی کھیپ پاکستان پہنچ سکی۔

یہ عرصہ (یعنی ایک سال) گندم کی حقیقی کمی اور اس کو کم کرنے میں امریکی کردار بڑا اہمیت کا حامل ہے۔ وزیر خزانہ نے ۵۴-۱۹۵۳ء کے سال کی بجٹ تقریر میں کہا کہ گندم کی کمی کا حقیقی اثر ستمبر ۱۹۵۲ء میں محسوس کیا گیا''۔ جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا گندم کی کمی کا کل تخمینہ ۵ء۲ ملین ٹن لگایا گیا

تھا۔ جب کہ اس دوران دولت مشترکہ سے ڈیڑھ لاکھ ٹن گندم حاصل کی جا چکی تھی (کینیڈا اور آسٹریلیا نے کولمبو منصوبے کی شرائط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جس کے تحت نقد امداد کی گنجائش اور اشیاء کی فراہمی کا کوئی معاہدہ نہ تھا، یہ گندم فراہم کی) اس بحران کے شروع کے بارہ ماہ بعد تک امریکی امداد پاکستان نہ پہنچ سکی اور اس وقت تک گندم کی اچھی فصل کھیتوں میں کٹنے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ اس غیر یقینی کے عرصے کے دوران نرخ بڑھ چکے تھے اور منافع خور خوب منافع کما چکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وسیع پیمانے پر بھوک (starvation) کے کوئی شواہد نہ ملے۔ اس بحران کے ڈیڑھ برس بعد مارچ ۱۹۵۴ء میں بجٹ تقریر کرتے ہوئے وزیر خزانہ نے کہا کہ امریکہ کی طرف سے اعلان کردہ ۶ لاکھ ٹن گندم پاکستان پہنچ چکی ہے۔ لیکن اس گندم کو پہنچنے میں کافی دیر ہو چکی تھی۔ امریکی سینیٹر تھوڈو گرین (Theodove F. Green) جس کے ذمے امریکہ کی طرف سے فراہم کی جانے والی امداد پر ہونے والی پیش رفت کا جائزہ لینا تھا، اس نے کئی ایشیائی ممالک کے دورے کے اختتام پر جنوری ۱۹۵۶ء میں کہا 'پاکستان کو فراہم کی جانے والی امدادی گندم کا نصف سے زائد ۱۹۵۴ء کے موسم گرما تک حکومت کے گوداموں میں موجود تھا اور اس وقت تک ملک میں گندم کی بھرپور فصل پہلے ہی تیار ہو چکی تھی''۔ وزیر خزانہ نے بتایا کہ امریکی امداد سے ملنے والی گندم کا ۱/۳ (one third) ان لوگوں میں مفت تقسیم کیا جا چکا تھا جو کہ اس کی قیمت ادا کرنے کے قابل نہ تھے''۔ یہ بات عام سنی گئی کہ فراہم کی گئی اس گندم کا بیشتر حصہ بعد ازاں اس بناء پر ضائع کر دیا گیا کیونکہ وہ انسانی استعمال کے قابل نہ رہا تھا۔

فوجی امداد:

امریکی گندم کی امداد پاکستان میں امریکہ کے لیے خیر سگالی کا کتنا ماحول پیدا کر سکی اس کا مکمل اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ گندم کی صورت میں فراہم کی جانے والی امداد جو کہ ملک کو قحط سالی کی صورت حال سے بچا سکتی تھی اس کی وجہ سے پاکستان میں امریکہ سے مستقبل میں ہونے والے کسی بھی اتحاد کے خلاف مخالفت کو کافی کم کیا جا سکتا تھا۔ ۱۹۵۳ء تک یہ اطلاعات ملنا شروع ہو چکی تھیں کہ پاکستان نے امریکہ کو ہوائی اڈے (bases) مہیا کرنے کے عوض امداد کی درخواست کر دی تھی۔ اس بات سے سرکاری سطح پر انکار کیا جاتا رہا۔ بلکہ اس کا انکار صدر نکسن کے 'بڑے کامیاب'

دورے کے بعد بھی ہوا جس میں انہوں نے پاکستان کے لیے امریکی فوجی امداد کا اعلان بھی کیا۔ فروری ۱۹۵۴ء میں امریکہ کی نیشنل سیکورٹی کونسل نے اس بات کا حتمی فیصلہ کرلیا کہ پاکستان کو فوجی امداد ملنی چاہیے اور پاکستان اور ترکی کا ایک اتحاد بنوایا جائے اور یہ اتحاد یقیناً معاملات کو مستقبل میں احسن طریقے سے چلانے میں اہم کردار ادا کرے گا۔ ان فیصلوں پر عملدرآمد کرتے ہوئے حکومت پاکستان نے ۱۹ اور ۲۲ فروری (۱۹۵۴) کو ترکوں کے ساتھ مذاکرات کیے اور باقاعدہ طور پر امریکی امداد کے حصول کے لیے درخواست کردی۔ امریکی صدر آئزن ہاور نے اس درخواست کے وصول ہوتے ہی صرف تین دن کے اندر ہی ۲۵ فروری کو امریکہ کی طرف سے پاکستان کو دی جانے والی فوجی امداد کا باضابطہ اعلان کردیا۔

پاکستان اور ترکی کا باضابطہ معاہدہ ۲ اپریل کو دستخط ہوا جس کے تحت دونوں خدمتگاروں کو مشرق وسطی میں امریکہ کے تیار کردہ 'سیکورٹی نظام' پر عمل درآمد کے لیے خود کو تیار کرنا تھا۔ امریکہ کے ساتھ معاہدہ ہونا باقی تھا۔ دونوں ممالک کے درمیان 'باہمی دفاع کا معاہدہ'' ۱۹ مئی کو دستخط ہوا۔ اس معاہدہ کی سب سے زیادہ اچھنبے والی بات یہ تھی کہ امریکہ پاکستان کے باہمی دفاعی معاہدہ میں کوئی بھی بات 'باہمی' نہ تھی۔ اس کی تمام شرائط مکمل طور پر یکطرفہ ہیں۔ اس معاہدے میں سب سے خاص بات یہ ہے کہ امریکی حکومت نے کسی بھی بات کی کوئی ذمہ داری اٹھانے کا کوئی اشارہ نہیں دیا۔ جبکہ دوسری طرف اسی معاہدے کے تحت پاکستان کو امریکی مفادات کے تحفظ کے لیے کئی شرائط پر عمل درآمد کا پابند کردیا گیا خاص طور پر ان حالات میں جب امریکی مفادات کو خطرات (hostility) لاحق ہوں۔ اس معاہدے کی ایک شرط کے مطابق پاکستان کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ وہ پاکستان میں امریکی افسران کو نہ صرف قبول کرے گا بلکہ ان کو تمام ممکن سہولیات بھی فراہم کرے گا۔ جن کا کام پاکستان کو فراہم کی جانے والی امریکی امداد پر نظر رکھنا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ امداد ملنے کی صورت میں امریکی نگران پاکستانی فوج تک براہ راست رسائی رکھ سکیں گے۔ یہ معاہدہ پاکستان کو اس بات کا پابند کرتا ہے کہ پاکستان ہر صورت میں امریکی مفادات کے تحفظ کے لیے ہر معاملے میں اس کی مدد کرے چاہے ایسا کرنے میں پاکستان کا اپنا کوئی مفاد شامل ہو یا نہ ہو۔ یہ پورا معاہدہ کسی بھی امداد حاصل کرنے والے ملک کے لیے انتہائی ذلت آمیز (humaliating) دستاویز ہے جس پر شاید ہی کوئی ملک دستخط کرنا چاہے۔

فوجی امداد کے مقاصد:

پوری دنیا(globe) کو امریکی فوجوں یا پھر امریکہ کے زیر کنٹرول فوجوں کے ذریعے گھیراؤ (encirclement) کرنے کے پس پشت اصل مقاصد کیا ہیں؟ امریکہ کے مغربی ایشیا (مشرق وسطی) اور جنوب مشرقی ایشیا میں اسٹریٹجک (strategic) مفادات کیا ہیں؟ دونوں ممالک کے اس معاہدے کا گہرائی سے جائزہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا علاقائی اور بین الاقوامی پہلوؤں سے جائزہ لیا جائے۔ ان دونوں ممالک کے اتحاد کے پس پشت اصل محرک 'اشتراکی (کمیونسٹ) 'دنیا' کے خلاف صلیبی جنگ (Crusade) کرنا ہے۔ دوسری طرف اگر سوویت یونین بیرونی دنیا میں اگر اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کا خواہش مند ہو (اب تک تو اس کے رویے سے ایسے کوئی اشارے نہیں ملے) تو اسے اس کے لیے بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی اور خاص طور پر اس کے لیے پاکستان پر حملے کی صورت میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔ ایسے کسی حملے کی صورت میں فوجی اور مادی قیمت کے علاوہ سوویت یونین کو سیاسی طور پر بھی بڑی بھاری قیمت ادا کرنا پڑسکتی ہے۔ پاکستان پر حملہ کی صورت میں بھارت خوف زدہ ہوکر مغربی کیمپ میں جاسکتا ہے۔ اس صورت میں علاقے میں غیر جانبداری کے اصول کو جھٹکا لگ سکتا ہے اور کمیونسٹ بلاک کے خلاف بین الاقوامی بلاک مزید مستحکم ہوسکتا ہے۔ اس لیے اس صورت میں سوویت یونین کی طرف سے پاکستان پر حملے کے کوئی امکانات نہیں۔ جن کو کہ بنیاد بنا کر پاکستان مغربی قوتوں کے اتحاد میں شامل ہونے جارہا ہے۔

اس ساری صورت حال میں صرف ایک ایسی وجہ ہوسکتی ہے جو کہ پاکستان اور سوویت یونین کے درمیان وجہ تنازعہ بن سکتی ہے اور وہ ہے ہمارا (پاکستان) کا امریکہ کے اتحادی بننے کا یہ معاہدہ جو کہ ہمارے دفاعی مقاصد میں تو کسی بھی صورت میں اہمیت کا حامل ثابت نہ ہوگا لیکن یہ ضرور ہے کہ بین الاقوامی تنازعات میں بڑا جارحانہ (offensive) اہمیت کا حامل ہوگا۔ مشرق وسطی کے کچھ علاقوں کی طرح شمالی مغربی پاکستان کا علاقہ بھی سوویت یونین پر ممکنہ حملے کے لیے امریکہ کو محفوظ ہوائی اڈے فراہم کرتا ہے۔ پاکستان کے شمالی علاقوں میں واقع ہوائی اڈے سوویت یونین کے مرکزی علاقوں اور اہم مقامات پر حملے کے لیے سب سے نزدیک ترین مقامات ہیں۔ بہرحال

براعظموں کے درمیان حملے کے لیے بنائے گئے بلسٹک میزائل(ICBM) اور Plaris بنائے جانے کے بعد ان اڈوں کی اسٹریٹجک اہمیت کچھ کم ہوچکی ہے۔ بہرحال مشرق اور مغرب کے درمیان شدید اختلاف کی صورت میں ڈی اے ریسٹو(D.A.Rustow) کے مطابق مشرق قریب(Near East) سوویت یونین کے اولین احداف میں شامل نہیں ہوگا۔لیکن مغرب پر اچانک حملہ کر کے اس کو پسپائی دینے کی خواہش میں بھی سوویت یونین کی فوری خواہش یہی ہوگی کہ وہ مشرق قریب میں موجود امریکی اور اتحادیوں کی بیسوں کو تباہ کر کے اس علاقے میں ان کا اثر کم کر سکے''۔ہم (پاکستانیوں) نے اس معاملے میں الجھ کر اپنے مفادات محفوظ نہیں کیے بلکہ اپنے آپ کو مزید غیر محفوظ اور خطرناک لڑائی میں اُلجھا لیا ہے۔ہم نے اپنے لوگوں کی زندگیاں خطرے میں ڈال دیں اور ملک میں مہیا محدود وسائل کو اپنے لوگوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کرنے کے بجائے اس تنازعے کے باعث فوجی مقاصد پر خرچ کر رہے ہیں جس کا کوئی بھی فائدہ ہمیں حاصل نہیں ہوگا۔حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی قیادت کو اس بات سے بخوبی آگاہی ہے کہ اس ملک کو سوویت یونین کے حملے کا کوئی سنجیدہ خطرہ موجود نہیں۔اس لیے ان کی دلیل یہ تھی کہ وہ اس معاہدے میں صرف اس وجہ سے داخل ہوئے ہیں تاکہ وہ اس کے ذریعے بھارت کے مقابل اپنا دفاعی نظام بہتر بنا سکیں۔جبکہ امریکہ میں اس اتحاد (جو کہ کمیونسٹ مخالف ہے) کو زبردست عوامی حمایت حاصل ہے۔اگر روشن خیال (لبرل) امریکیوں کو کمیونسٹ مخالف demogogy اس فوجی اتحاد کے اصل محرکات کا علم ہو جائے تو یقیناً وہ اس کے لیے بھرپور مخالف ہو جائیں گے۔اس اتحاد میں ایسی کوئی ٹھوس بات نہیں جس کی وجہ سے سوویت یونین کو کوئی پریشانی لاحق ہو۔لیکن اس سے برعکس وہ ممالک بشمول پاکستان جو کہ امریکہ کے ساتھ اس اتحاد میں شریک ہوئے ہیں ان کو اس سے کئی خطرات محسوس کرنا چاہئیں۔

انڈیا سے اختلافات کے موضوع پر پاکستانیوں کے درمیان اختلاف رائے پایا جاسکتا ہے۔ کئی مصنّفین کا خیال ہے کہ پاکستان اور انڈیا کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کا بات چیت اور دوستانہ طرز سے پُرامن حل بہت مشکل ہے۔اگر ہم اس نقطہ نظر کو مسترد بھی کر دیں پھر بھی یہ بات اپنی جگہ برقرار رہتی ہے کہ پاکستان اور امریکہ کے درمیان بننے والا یہ اتحاد بھارت اور پاکستان کے کسی تنازعے کی صورت میں کیا پاکستان کو امریکہ کی طرف سے امداد کی فراہمی کو یقینی

بنا سکے گا۔اس تنازعہ میں ہمارے لیے(اس مضمون میں) یہی علمی(Academic) سوال بڑا اہم ہے۔اس بات کے بڑے مبہم امکانات ہیں کہ کسی تنازعے کی صورت میں امریکہ فوری طور پر پاکستان کی مدد کے لیے تیار ہوجائے گا۔ امریکہ سینٹو(CENTO) کا باقاعدہ رکن نہیں بنا (حالانکہ اس کو سینٹو کی تمام کمیٹیوں میں نمائندگی حاصل ہے)۔اس کے باعث اس نے کسی بھی اختلاف کی صورت میں ہر صورت میں رکن ممالک کی لازمی مدد کرنے سے اپنا دامن بچالیا۔جبکہ وہ خود اپنے اتحادیوں سے کئی امیدیں لگائے بیٹھا ہے۔جبکہ اس کے مقابلے سیٹو(SEATO) جس کا امریکہ ایک مکمل رکن ہے وہاں امریکہ کے تمام رکن ممالک کے درمیان تعلق کو اس معاہدے کے سیکشن چہارم (IV) کے تحت درج کیا گیا ہے جس میں یہ بات وضاحت سے لکھی گئی ہے کہ امریکی مدد صرف اشتراکی حملے کی صورت میں ہی ممکن ہوگی۔اس طرح امریکہ نے دیگر رکن ممالک پر تو بھرپور ذمہ داریاں عائد کردیں اور اپنے لیے ممکنہ حد تک (maximum) آزادانہ کردار کا متعین کرلیا۔

استعماری(imperial) سرحدوں کی نگرانی(guarding):

اصولی طور پر تو یہ معاہدے نہ تو انڈیا کے خلاف ہیں اور نہ ہی سوویت یونین ان کا حدف ہے۔ بلکہ یہ مشرقی وسطی میں امریکی اثر ورسوخ قائم رکھنے اور مغربی ممالک کے مفادات کے تحفظ کے لئے پاکستانی فوج کے کردار پر زور دیتا ہے۔لیکن یہاں یہ سوال ضرور پوچھا جاسکتا ہے کہ پاکستان کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ اپنے قومی وسائل کی قیمت اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنی سیاسی آزادی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ مغربی طاقتوں کے لیے کرائے کی فوج(Western mercenaries) کا کردار ادا کرے۔اس اتحاد کا حصہ بننے کا واضح اثر یہ ہوگا کہ ہمیں اپنے سیاسی معاملات میں بھی بیرونی ہدایات(dictation) پر چلنا ہوگا۔ لارڈ برڈووڈ(Lord Birdwood) نے اس سوال پر کئی مرتبہ اپنے خیالات بڑے واضح انداز میں آشکار کیے ہیں۔ برڈوڈ کا خیال ہے کہ آزادی سے قبل مضبوط جسامت(Sturdy) رکھنے والے پنجابی کسان برطانوی فوج کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ ذمہ داری برطانوی ہندوستان کی فوج کی تھی کہ وہ مشرق وسطی میں توازن برقرار رکھنے یعنی اس علاقے میں برطانوی

مفادات کا تحفظ کرے۔ اس کا خیال ہے کہ اب یہ ذمہ داری پاکستانی فوج پر عائد ہوگئی ہے۔ وہ لکھتا ہے مثال کے طور پر تیل سے مالا مال ایرانی (Persian) علاقے اور وہاں ۳۰۰ ملین پاؤنڈ سے زائد کی تیل صاف کرنے والی ریفائنری کی حفاظت کے لیے اب ہندوستان سے برطانیہ کے نکل جانے کے بعد کوئی فوج ہی نہیں۔ اب اس کے نعم البدل کے طور پر یہ امید لگائی ہے کہ یہ کردار پاکستان کی فوج ادا کرے گی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے پاکستان کی فوج کی ایک ڈویژن فوج کو مغربی سرپرستی یا پھر عرب سیکیورٹی معاہدے کے تحت مشرق وسطی میں تعینات کر دیا جائے۔ اس کے نتیجے میں پاکستان کا عرب کے ساتھ ایک نیا تعاون جنم لے گا (صفحہ ۱۸۰)۔ لارڈ برڈ ووڈ پاکستان کے سابق وزیر خارجہ ظفر الدین خان کے الفاظ میں لکھتے ہیں ''اس بات کی قوی اُمید کی جارہی ہے کہ ابتدائی طور پر مشرق وسطی کے علاقوں میں (جن میں خود پاکستان بھی شامل ہے) وہاں امن وامان کو غیر جانبدارانہ انداز میں اور اگر ضروری ہوا تو طاقت کا استعمال کرتے ہوئے بھی برقرار رکھا جائے گا۔''

اس حقیقت کا اظہار کہ پاکستان کو اس اتحاد میں گھسیٹنے کا مقصد مشرق وسطی میں مغربی قوتوں کے مفادات کو تحفظ فراہم کرنا تھا۔ امریکہ میں پاکستان کے ایک سابق سفیر محمد علی بوگرہ نے اپنی ۱۶ جنوری ۱۹۵۹ء کو واشنگٹن میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے (اطلاعات کے مطابق انہوں نے) یوں کہا: ''مجھے اجازت دیجیے کہ میں کہوں کہ پاکستان کو فوجی امداد اس لیے دی جارہی ہے کیونکہ اس نے اپنے کاندھوں پر ایک اضافی ذمہ داری اٹھالی ہے اور وہ یہ ہے کہ مشرق وسطی اور جنوب مشرقی ایشیا میں امن کو برقرار رکھے گا''۔

لارڈ برڈ ووڈ کے اس تجزیے کو سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں ہونی چاہیے۔ موجودہ معاہدے کے نتیجے میں سامنے آنے والی صورتحال ایک مثالی صورت حال ہوگی جس میں مقامی بھرتی کی گئی فوج مغربی قوتوں کے مکمل زیر کنٹرول مشرقی وسطی میں مغربی مفادات کے تحفظ کے لیے مہیا ہوگی۔ اس کے نعم البدل کے طور پر یہ صورت ہوگی کہ تمام دنیا میں امریکہ اپنی فوج کو تعینات کرے۔ ایسی صورت حال کو برطانیہ اور امریکہ کے عوام میں مقبولیت حاصل نہ ہو سکے گی۔ اس صورت حال میں استعماری مقاصد وعزائم مزید کھل کر لوگوں کے سامنے آجائیں گے۔ اس صورت میں دنیا میں بنائی جانے والی امریکی اڈّے (bases) (جہاں پر یہ امریکی فوجی تعینات کیے جائیں) پوری دنیا کے

لیے نفرت اور غصہ کا باعث بن جائیں گی لیکن امریکہ یہ اڈّے اس مقصد کے لیے قائم کرنا چاہتا ہے تا کہ وہ ان کے ذریعے مختلف ملکوں کی آزادی اور خود مختاری کا احترام کروا سکے۔

اس نظم و نسق کے ذریعے ایک اضافی سیاسی فائدہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ایران میں کسی بھی قسم کی قوم پرستانہ بنیادوں پر اٹھنے والی تحریک (جو کہ اس علاقے میں امریکی ملکیت میں چلنے والی سورج مکھی کے فارموں کو قومیائے جانے کے لیے ہو) اس کو کچلنے کے لیے امریکی فوج کی براہ راست مداخلت اس قوم پرستانہ تحریک کو مزید مقبولیت اور امریکہ کے لیے نفرت کے جذبات کو مزید بڑھاوا دے سکتی ہے۔ جبکہ دوسری طرف اگر ہمسائے 'خاکستان' (Khakistan) سے جن کی کہ ثقافت بھی اس علاقے کے لوگوں سے ملتی جلتی ہے، اس فوج کے خلاف شاید نفرت کے جذبات اتنے شدید نہ ہوں۔ تمام علاقوں میں امریکہ کی بڑی چھاونیوں کی موجودگی نہ ہونے کی صورت میں امریکی فوج کے لیے یہ بہت مشکل ہوگا کہ ہوائی راستے کے ذریعے فوج کی ایک بڑی تعداد کو فوری طور پر کسی دور دراز علاقے میں پہنچا سکے۔ ایسی صورت میں مغرب کے زیر کنٹرول مقامی فوج یہ کام زیادہ بہتر انداز سے سرانجام دے سکتی ہے۔ یہی وہ تصور ہے جس کی تکمیل کے لیے یہ فوجی اتحاد تشکیل دیئے گئے۔ لیکن عملی طور پر دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہوگی کہ یہ اتحاد اپنا وہ مقصد ہی حاصل نہیں کر سکا جس کے لیے یہ قائم کیا گیا تھا۔ اس کا پہلا امتحان انقلاب عراق کے وقت سامنے آیا۔ اس موقع پر معاہدہ بغداد بالکل غیر موثر ثابت ہوا۔ معاہدہ بغداد کے نقادوں نے یہ بات کہی کہ یہ معاہدہ کسی بھی مداخلت کے لیے معاون ثابت نہ ہو سکا۔ اس موضوع پر کیے گئے تحقیقی کاموں میں سے ایک اہم کام ہے کیمبل (J. C. Campbell) کا مشرق وسطی کا دفاع (The Defence of Middle East) ہے کیمبل لکھتا ہے:

''مشرق وسطی کے دفاع کے لیے مغرب کی بیشتر کاوشوں کے نتائج کئی اتحادوں اور تعاون کے معاہدوں پر اختتام پذیر ہوئے ہیں۔ مشرق وسطی کی حکومتوں سے ضروری تعاون حاصل کرنے کے لیے یہ منطقی بات ہوگی کہ ان سے کسی بحرانی کیفیت میں مدد کی یقین دہانی حاصل کی جائے..... جہاں تک مشرق وسطی کے مختلف ممالک کا تعلق ہے وہاں کسی بھی مغربی طاقت کے ہاتھ کسی بھی قسم کے فوجی اتحاد کی بات کرنے سے نفرت کے جذبات بھڑک اُٹھتے ہیں..... ان اتحادوں کے نتیجے میں اپنے کسی 'دوست' ملک سے حاصل کی جانے والی یقین دہانی ان دیگر ممالک سے دشمنی کا باعث

بھی بن سکتی ہے جنہوں نے کہ اس اتحاد کا حصہ نہ بننے کا فیصلہ کرلیا ہو.....مشرق وسطی کی صورتحال اور یہ صورتحال آئندہ کچھ عرصے کے لیے اس طرح برقرار رہنے کی امید ہے۔اس صورتحال میں کوئی بھی بیرونی مداخلت اس علاقے میں مزید تناؤ (tension) اور تقسیم (division) کو جنم دے سکتی ہے اور اس علاقے میں دفاعی نظام قائم کرنے کی ہماری تمام کاوشیں سبوتاژ (تباہ برباد) ہوسکتی ہیں اور ہمارے طویل المدت مقاصد حاصل نہیں ہوسکتے''۔

اسی لیے امریکہ کے بااثر حلقوں میں یہ بات قبولیت حاصل کرتی جارہی ہے کہ امریکہ کو ان مقبول عوامی تحریکوں سے براہ راست مڈھ بھیڑ کرنے کے بجائے سوچ بچار کر کے عقلمندانہ (subtler) طریقہ کار اپنانا ہوں گے۔اس حقیقت کا سب کو علم ہونا چاہیے یہ معاہدے درحقیقت ابھرتی ہوئی مقامی (indigenious) تحریکوں کے جن کے باعث اس علاقے میں مغربی قوتوں کے اثر ورسوخ اور مفادات کو خدشات لاحق ہوں، ان کا مکمل ادراک رکھتے ہیں۔اس کا واضح ثبوت سینٹو اور سیٹو کی ان وضع کردہ پالیسیوں سے لگایا جاسکتا ہے جس کا اصل مقصد 'تخریب کاری کو روکنا' (Counter subversion) ہے اسی لیے Royal Institute of International Affairs کے ایک مطالعاتی گروپ نے تحریر کیا ہے: سینٹو کونسل کے نمائندگان کو یہ ہدایت دی گئی کہ ان کا پہلا کام یہ ہوگا کہ وہ ان ماہرین کے اجلاس طلب کریں جو کہ ان امور پر غور کریں جن کے ذریعے باہمی تعاون کو مزید مستحکم کرتے ہوئے دراندازی اور تخریب کاری کو روکنے کا مضبوط نظام بنایا جاسکے۔اس لیے کونسل اپنے ابتدائی اجلاس میں اس مخصوص سوال پر ہی زیادہ غوروخوض کرتی رہی (صفحہ ۱۱۹) امریکہ کی تعریف کے مطابق وہ کوئی بھی شے جو امریکی مفادات کے خلاف جاتی ہو وہ 'اشتراکی' (کمیونسٹ) ہے۔کئی امریکی سیاستدان اس بات پر شدید فکرمند ہیں کہ کس طرح ابھرتی ہوئی قومی جمہوری تحریکوں کو 'کمیونسٹ' ہونے کا نام دے کر ان کو دبانے کے لیے فوری طور پر فوجی طاقت کو حرکت میں لا کر ان کے خلاف بھرپور کاروائی کی جاسکتی ہے۔ پروفیسر رلف برتبانی (Ralfh Braitbanti) نے سیٹو کے متعلق اپنا ایک مقالہ لاہور میں پیسفک تعلقات کی کانفرنس میں پیش کرتے ہوئے ان خدشات کا حوالہ دیا جو کہ سینیٹرز گرین اور واٹکن نے اس کے متعلق پیش کیے۔ برتبانی اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں.....اس علاقے میں کسی بھی قسم کی تخریب کاری (subversion) کو اس علاقے کے امن کو

خراب کرنے کی کوشش سے تعبیر کیا جائے گا اس بات کے خطرات موجود ہیں کہ اس علاقے کے کسی بھی ملک کی ایسی حکومت کو ختم کرنے کے لیے طاقت کا استعمال کیا جا سکتا ہے جو حکومت اتحادی طاقتوں کے لیے ناپسندیدہ قرار دی جا چکی ہو"۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اتحادی قوتوں نے اس علاقے میں دائیں بازو کی حکومتوں کی حمایت کرنا شروع کر دی۔ یہ غیر مقبول اور عوامی حمایت سے محروم حکومتیں عوامی تحریکوں کے دباؤ کے آگے کھڑی نہیں ہو سکتیں۔ ان حکومتوں کا برقرار رہنا وقتی اور عارضی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ لاطینی امریکہ کے ممالک اور عراقی تجربے سے یہ بات عیاں ہو چکی ہے کہ اسلحہ اور اقتصادی امداد کے زور پر مقبول عوامی تحریکوں کو غیر معینہ مدت کے لیے دبایا نہیں جا سکتا۔ امریکی اکثر اس بات پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں کہ اس قدر فراخ دلی سے دی جانے والی امداد کے باوجود یہاں امریکہ مخالف جذبات اس قدر کیوں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکی دائیں بازو کی غیر مقبول حکومتوں سے چپکے ہوئے ہیں اور وہ مقبول عوامی تحریکوں کی مخالفت اس لیے کر رہے ہیں کیونکہ یہ تحریکیں علاقے میں امریکی عزائم کی سخت مخالف ہیں۔ امریکی مخالف جذبات کی شدت میں کمی اس وقت آ سکتی ہے جب امریکہ ان ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنا بند کر دیں۔

عسکریت پسندی اور معاشرہ(Militarization and Society):

طویل وقتی بنیادوں پر اس فوجی امداد کا سب سے بدتر پہلو یہ ہے کہ اس علاقے کی سماجی اور سیاسی قوتوں کا توازن رجعت پسند اور مستحکم (Established) مفاد پرستوں (Vested Interest) کے حق میں کر دیا گیا ہے۔ یہاں ایسی کوئی counter vailing قوت نہیں جو ان پر نظر رکھ سکے۔ ایک بار اقتدار میں آ جانے کے بعد یہ آسان اور پُرامن طریقے سے جمہوری سیاسی عمل کا ارتقاء ہونے نہیں دیتے۔ مشرقی معاشروں میں ٹریڈ یونین کی تحریکیں ایک موثر counter vailing قوت کا کردار ادا کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں جمہوریت کی طویل روایات بھی بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ انڈیا میں جہاں یہ دونوں عناصر (ٹریڈ یونین اور جمہوری روایات) اپنی جڑیں بڑی مضبوط کر چکے ہیں۔ اس لیے ان دونوں کی موجودگی میں کسی بھی قسم کے فوجی شب خون کو عوام مسترد کر دیں گے۔ لیکن دیگر ممالک میں جہاں ٹریڈ یونین تحریک نسبتاً کمزور ہے کسان

تحریکوں کا وجود تقریباً ناپید ہے، اور سیاسی عمل اپنے ارتقائی دور سے گزر رہا ہے وہاں صورتحال کوئی اتنا حوصلہ افزا نہیں ہے ترقی پذیر ممالک میں جمہوری عمل کے آگے بڑھنے میں کوئی اور عناصر اتنی بڑی رکاوٹ نہیں سوائے ان معاشرے میں فوج کا بڑھتا ہوا کردار (militarization) ہے۔

امریکہ ان ممالک میں امریکہ پر انحصار بڑھانے اور وہاں امریکی مفادات کے تحفظ کے لیے بڑی کارپوریشنوں کو وہاں سرمایہ کاری کرنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ اس پالیسی کے تحت ہمارے جیسے ممالک میں سرمایہ کاری بڑے پیمانے پر ہوئی ہے۔ پرنسٹن یونیورسٹی میں امریکی فوجی امداد پر ایک تحقیقی کام میں ایف ایس لکھتے ہیں: ''امریکہ کا دیگر ممالک میں اندرونی استحکام کا مطلب ان ممالک کی اقتصادی، سیاسی اور فوجی صورتحال میں استحکام لانا ہے۔ اقتصادی استحکام کا مطلب قومی اقتصادیات کی بہتر (orderly) اور ترقی اور اس ملک میں امریکی نجی سرمایہ کاری کے لیے موافق (favourable) حالات کا پیدا کرنا۔ امریکہ کا ان ممالک میں اندرونی حالات کو سیاسی مقاصد کے لیے مستحکم رکھنے کا مقصد امریکہ کی طرف سے فوجی امداد کی فراہمی سے حاصل کیا جا سکتا ہے جس کا اصل مقصد مقامی حکمران اشرافیہ کو بچانا ہے جو کہ امریکہ کے ساتھ بھرپور تعاون کرتی ہے۔ کچھ ممالک میں یہ رہنما خود ان ممالک کی افواج ہی میں نظر آ جائیں گے۔ جبکہ یہ سویلین سیاست دان بھی ہیں جو کہ خود کنٹرول کرتے ہیں یا پھر ان کو مقامی فوجی اسٹیبلشمنٹ کنٹرول کرتی ہے۔ یہ منفرد غیر فوجی مقصد (فوجی امداد کے پروگراموں کا) ان ممالک میں زیادہ واضح محسوس (discerns) کیا جا سکتا ہے جہاں کے ادارے اب تک کلی طور پر مغربی طرز کے نہیں ہو گئے''۔

فرینس حوالہ دیتا ہے:

''دوستانہ طاقتور گروہ کو اپنی طرف کھینچنے (کچھ لاطینی امریکہ کے ممالک کو امریکہ کی امداد کی طرف راغب کرنے کے لیے) جہاں کہ قومی فوجی اسٹبلشمنٹ کے رہنماؤں کے متعلق یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ وہ حکومتوں کے سیاسی قائدین کو اپنے اشاروں پر نچانے (juggling) میں اس وقت تک کوئی غیر اہم کردار ادا کرنے کو تیار نہیں ہوتے جب تک وہ سیاسی قیادت میں ایسے لوگوں کو تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو جاتے جو کہ مکمل طور پر فوج کی پالیسیوں کے مطابق چلنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ لاطینی امریکہ کے فوجی افسران کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیشتر اوقات

یہ سویلین قیادت کو اقتدار سے مکمل طور پر علیحدہ کر کے اقتدار کی زین کو براہ راست اپنے ہاتھوں میں لے لیتے ہیں''۔

فوج کو سیاست سے نکال باہر کرنا اس وقت تک انتہائی مشکل ہوگا جب تک کہ امریکی فوجی امداد جاری رہے گی اور یہ ہماری سیاسی زندگی پر اثر انداز ہوتی رہے گی۔ یہ مداخلت اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ ہماری مسلح افواج امریکہ کے ایشیائی منصوبہ بندی (strategies) میں استعمال ہوتی رہے گی۔ پاکستان میں جمہوری اداروں کی بحالی کے لیے پہلا قدم یہ ہوگا کہ اس امریکی فوجی امداد کا خاتمہ ہو اور موجودہ فوجی اتحاد کا خاتمہ کیا جائے۔

اب اگر ہم فوجی امداد اور امریکی مفادات کی طرف واپس پلٹیں تو ہمیں یہ بات ضرور نوٹ کرنا چاہیے کہ فوجی امداد امریکہ کے لیے بھی کئی مفید نتائج کا باعث بھی ہے۔ سابق امریکی وزیر خزانہ (Secretary of Treasury) کے الفاظ ہیں۔

''جہاں تک فوجی امداد کا تعلق ہے اور اس کے کس حد تک جاری رہنے کی بات ہے یہ صرف اتنی سی بات پر منحصر ہے کہ ہم اسے کس قدر برداشت کر سکتے ہیں اور یہ کام کس طرح کر سکتے ہیں۔ اس نقطہ کو ہر وقت تلاش کرتے رہنا چاہیے۔ جب تک ہم کچھ پیسہ بچا کر یہ جاری رکھ سکتے ہیں تو میں اس کے حق میں ہوں۔ جب تک ہم اپنے کچھ لڑکوں (فوجیوں) کی جانیں محفوظ رکھ سکتے ہیں تو میں اس کے حق میں رہوں گا''۔

جہاں تک پیسہ کی کفایت کا سوال ہے اس کے متعلق امریکی رکن کانگریس وہرس (Voorhis) نے امریکی ایوان نمائندگان کو باہمی سیکیورٹی ایکٹ (۱۹۵۶ء) Mutual Security Act (1956) پر بحث کے موقع پر بریف کرتے ہوئے بتایا ''گذشتہ برس امریکہ کو ایک امریکی فوجی کو ہاتھ میں بندوق دیئے بنا بیرون ملک کو قابو میں رکھنے کے لیے ۵۹۰۰ امریکی ڈالر خرچ کرنا پڑے۔ جبکہ اس پروگرام کے تحت یہ کام صرف ۴۴۷ امریکی ڈالر خرچ کر کے بندوق بردار مقامی فوجیوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے جن کے متعلق جوائنٹ چیف کا خیال یہ ہے کہ یہ ہمارے مشترکہ دفاعی نظام کے لیے ہوگا''۔

۱۹۵۹ء تک دس برس کے عرصے میں امریکی حکومت نے اپنے اتحادیوں کو ۲۲ ارب ڈالر فوجی امداد کے طور پر فراہم کیے جبکہ اس کے جواب میں ان اتحادیوں نے اپنے ۱۴۱ ارب ڈالر خرچ

کر کے امریکہ کے دفاعی منصوبے کے لیے ۵۰ لاکھ اسلحہ بردار فوجی اور ۳۰ ہزار ہوائی جہاز فراہم کیے۔ امریکی فوجی امداد اور اتحادوں کی مہربانی اور امریکہ کی طرف سے دی جانے والی فوجی تربیت کے نتیجے میں اب اتحادیوں کی فوجیں امریکی فوجی منصوبہ بندی کا اندرونی (integral) حصہ بن چکی ہیں۔ امریکہ اس بات پر نظر رکھے ہوئے ہے کہ ''اتحادی'' ضروریات کے مطابق مطلوبہ تعداد میں مسلح افواج کو چوکس رکھے ہوئے ہیں۔ یہ معاہدہ امریکوں کو اس بات کی مکمل اجازت فراہم کرتا ہے کہ اگر کسی بھی مرحلے پر اسے اس بات کا اندازہ ہو جائے کہ اس کا کوئی بھی اتحادی دفاعی مقاصد کے لیے تیاری نہیں کر رہا یا پھر اس کے سیاسی اور دفاعی مقصد سے مکمل طور پر ہم آہنگی نہیں رکھتا یا پھر اس کو سہولیات اور وسائل مہیا نہیں کر سکتا تو ایسی صورت میں امریکہ بغیر کوئی تاخیر کیے اس اتحادی سے اپنا معاہدہ توڑتے ہوئے اس کی امداد فوری طور پر بند کر سکتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہے کہ اس معاہدے میں شرکت کرنے کے باعث پاکستان کے دفاعی اخراجات میں کوئی خاطر خواہ کمی نہیں ہوگی جس کا کہ پاکستانی حکومت کہتی آ رہی ہے بلکہ اس کے نتیجے میں پاکستان کو اپنی دی گئی یقین دہانیوں کو پورا کرنے کیلئے پہلے سے اضافی اخراجات کرنا ہوں گے۔ اس معاہدے کے نتیجے میں پاکستان کو جس قسم کا فوجی اسلحہ مہیا کیا جائے گا جس کے متعلق حکومت پاکستان بڑا چرچا اور گمراہ کن پروپیگنڈہ کر رہی ہے اس کی حقیقت کا اندازہ امریکی ایوان نمائندگان اور امریکی کانگریس کی اخراجات کی ذیلی کمیٹی (U.S House Appropriations Sub-Committee) کے چیئرمین اوتو پاسمی (Otto E. Passman) کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے جو کہ یورپی انہوں یورپی ممالک بشمول ناروے، ڈینمارک، اور ہالینڈ کے معائنے اور دورے کے اختتام پر انہوں نے دیا۔ اس کا یہ بیان اس مہیا کیے جانے والی امریکی اسلحہ کی اصل حقیقت عیاں کر دیتا ہے۔ اوتو کہتا ہے کہ اس معاہدے کے تحت فراہم کیا جانے والا اسلحہ درحقیقت بوسیدہ (Discarded) ہتھیاروں کو ٹھکانے (dump) لگانے کا عمل ہے۔ یہ بات رپورٹ کی گئی کہ انہوں نے الزام عائد کیا کہ بیرونی امداد پروگرام کے آڑ میں امریکی افواج اپنی اس ندامت کو چھپانا چاہتے ہیں جس کے تحت انہوں نے اربوں ڈالروں کا غیر ضروری اور اضافی اسلحہ خرید لیا اور اب اس امداد کے نام پر وہ اس فضول خرچہ (wastefully procured) کی نکاسی کرنے کے خواہش مند ہیں۔

کارپوریشنوں کا اندرون خانہ منافع (Underpinning corporate profits)

امریکی فوجی امداد کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جو کہ اس امدادی عمل کی فراہمی میں سب سے مضبوط محرک (strongest driving force) بن گیا ہے وہ ہے اس اسلحہ کی فراہمی میں بڑی کارپوریشنوں کے مخفی مفادات۔ نہ صرف فنڈز بلکہ بڑھتی ہوئی رقوم جو کہ زبردستی لاطینی امریکہ میں دفاعی آلات کی خریداری پر خرچ کی جارہی ہیں۔ اس عمل کے متعلق ڈاکٹر ایڈون لیوین (Edwin Lieuwen) لکھتا ہے:

''امریکہ اس بات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ صرف امریکی اسلحہ خریدا جائے تاکہ پھر اس کی مرمت (maintenance) کا عمل مستقل طور پر جاری رہے..... اس وجہ کے باعث امریکہ لاطینی امریکہ کے ممالک کو سوویت یونین اور برطانیہ کے اسلحہ کی فروخت کا شدید مخالف ہے'' صفحہ ۲۰۵۔ (Arms and Politics in Latin America) ڈاکٹر لیوین لکھتے ہیں کہ امریکی اسلحہ کی خریداری کے لیے ڈالا جانے والا دباؤ صرف اس وجہ سے ہی نہیں ڈالا جاتا ہے بلکہ اس کے پس پشت اضافی دباؤ اسلحہ بنانے والی امریکی کمپنیوں کا بھی ہے۔ اگر پاکستان کلی طور پر امریکی ہتھیاروں پر انحصار نہ کرے تو پھر اس پر دباؤ ڈالنا ناممکن نہ ہوگا۔ اس مرحلے پر کہا جاسکتا ہے کہ اس طرح کتنا بڑا مفاد رسک پر ہے؟ اس کا پہلو صرف یہ نہیں ہے کہ ہم امریکی امداد کے تحت کچھ رقم وصول کررہے ہیں بلکہ اس کا اہم پہلو یہ ہے کہ امریکی فوجی امداد ملنے کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ ہمیں اپنے دفاعی اخراجات کو بھی بڑھانا پڑا ہے۔

آئزن ہاور کی سرکار کے امریکی نائب سیکریٹری برائے دفاع اسپریگ (Sprague) امریکی سینٹ کی خارجہ امور کی کمیٹی کے سامنے اپنا بیان دیتے ہوئے ۲۸ مارچ ۱۹۵۸ء کو کہتے ہیں۔

ہمارے اتحادیوں نے دفاعی مقاصد کے لیے اپنے حصہ میں کافی اضافہ کردیا ہے اور امداد وصول کرنے والے ممالک نے ہمارے فوجی امداد کے مہیا کیے گئے ایک ڈالر کے عوض سات ڈالر خرچ کیے۔ دفاعی مقاصد کے لیے ان ممالک کی طرف سے خرچ کی جانے والی رقم میں اضافے کا اندازہ اس اسلحے کی فروخت سے کیا جاسکتا ہے جو کہ یہ ممالک اب خرید رہے ہیں۔ مثلاً ۱۹۵۶ء میں

کل فروخت ۹۷ملین ڈالر کی تھی جبکہ ۱۹۵۷ء میں اس میں اضافہ ہوکر یہ ۳۱۲ملین ڈالر ہوگئی۔اب اس بات کی بھی امید کی جارہی ہے کہ دفاعی مد میں فراہم کی جانے والی امداد کا کچھ حصہ اب اسلحے کی خریداری کے لیے بھی زیر استعمال لایا جاسکتا ہے۔ یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اس پروگرام کی مد میں خرچ کی جانے والی رقم کا ۸۵ فیصد امریکہ کے اندر ہی خرچ ہوگا۔ ہمارا تخمینہ یہ ہے کہ اسلحہ کی خریداری کے لیے مختص کیے گئے بجٹ کا ۹۲ فیصد امریکی اسلحہ خریدنے پر خرچ ہوگا اس لیے یہ بات واضح ہے کہ اس مد میں خرچ کی گئی رقم کا بیشتر حصہ واپس امریکی اقتصادیات میں شامل ہوجائے گا۔

اقتصادی حوالے سے مزید بہت کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فوجی امداد کا ایک حصہ زائد زرعی اجناس (surplus) کی صورت میں بھی وصول کیا گیا۔ان اجناس کے عوض حکومت پاکستان کو اس کی مساوی رقم (پاکستانی روپوں میں) اسٹیٹ بینک آف پاکستان میں ایک خصوصی اکاؤنٹ میں جمع کرانا پڑتی ہے۔اس فنڈ میں جمع کرائی رقم سے حکومت پاکستان کو مدد (aid) فراہم کی جاتی ہے تاکہ وہ دفاعی اخراجات کرسکے اور حد تو یہ ہے کہ پھر اسی رقم سے بعدازاں امریکی اسلحہ بھی خریدا جاتا ہے (کیونکہ زیادہ تر رقم خریداری پر خرچ ہوتی ہے اس لیے زرمبادلہ (Foreign Exchange) کو پاکستان کے کرنٹ ڈالر آمدنی سے ہی نکالا جاتا ہے۔اس قسم کی فوجی امداد اس لیے نہ صرف غیر تربیت یافتہ افرادی قوت پر غیر ضروری بوجھ ڈالتی ہے جس طرح کہ اوپر بیان کیا گیا بلکہ یہ ہمارے بیرونی ذرائع وسائل (foreign exchage resources) پر بھی بوجھ ڈالتے ہیں اور اس خرچ کے بعد اس بات کے بڑے کم امکانات باقی رہ جاتے ہیں کہ حکومت پاکستان ملک کی اقتصادی ترقی کے لیے کوئی رقم مہیا کرسکے۔

امریکی حکام اور دیگر لوگ یہ بات کہتے چلے آئے ہیں جو کہ بالکل درست بھی ہے کہ پاکستان کو فراہم کی جانے والی اقتصادی امداد دفاعی تعاون (support) کے لیے ہے۔۱۹۵۴ء کے مشترکہ دفاعی ایکٹ کے الفاظ میں اس کا مقصد ایک مستحکم (sustain) دفاعی نظام کا قیام اور فوجی کاوشوں کو مزید تیز کرنا ہے۔اس تناظر میں جب چیزوں کو دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہوگی کہ پاکستان کو مہیا کی جانے والی فوجی امداد میں تو کوئی اضافہ نہیں ہوا البتہ پاکستان نے اپنے وسائل

سے دفاعی اخراجات کی مد میں کافی زیادہ اضافہ کر دیا ہے۔ اور اب یہ اضافہ ملک کی اقتصادیات کے لیے ناقابل برداشت بوجھ بنتا چلا جا رہا ہے۔ اس میں موجود اقتصادی بحران جس کے لیے سیاست دانوں کو مورد الزام ٹھہرایا جا رہا ہے وہ درحقیقت اس بڑھتے ہوئے بوجھ ہی کا نتیجہ ہے۔ اس لیے ہاورڈ میں پاکستان۔ایران کے لیے قائم ایڈوائزری گروپ کے ڈپٹی ڈائریکٹر ڈاکٹر ڈیوڈ بیل جو کہ پاکستان کے منصوبہ بندی کمیشن میں بھی کام کر چکے ہیں وہ امریکی سینٹ کی امور خارجہ کمیٹی کے سامنے ایک بیان دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''یہ ناقابل انکار حقیقت (conclusion) ہے کہ پاکستان جو کہ پہلے ہی فوجی مقاصد کے لیے اپنے وسائل کا بہت بڑا حصہ خرچ کر رہا ہے اس امریکی فوجی امداد کی فراہمی نے اس کی مزید حوصلہ افزائی کی ہے اور لگتا ہے کہ وہ فوجی مقاصد پر مزید خرچ کرے گا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں پاکستان کے لیے اقتصادی ترقی کے اہداف کا حصول ایک بہت بڑا مسئلہ بن جائے گا''۔

اگر اس صورت حال سے اب ہم کوئی نتیجہ نکالنا چاہیں تو ہمیں یہ بات واضح طور پر دکھائی دے گی کہ فوجی مقاصد پر زائد خرچ کیے جانے کے باعث ہماری اقتصادی ترقی معدوم ہوتی (disintegration) جا رہی ہے اور لوگوں کی روزمرہ زندگیوں میں کوئی بہتری دیکھنے کو نہیں مل رہی۔ لیکن ڈاکٹر بیل جیسے لوگوں کی تنقید ہی محض اس بات کے لیے کافی نہیں کہ کس طرح ان اصل قوتوں کو تبدیل کیا جائے جو کہ اس امریکی پالیسی کے پس پشت کام کر رہی ہے۔

امریکی امداد اور اقتصادی ترقی

اقتصادی ترقی میں بیرونی امداد کے کردار کا محض اور خالصتاً اعداد و شمار (Quantitatively) میں اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ بیرونی امداد پر انحصار کرنے والی اقتصادی ترقی کے نمونے (model) کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیرونی امداد کے بغیر شاید اقتصادی ترقی ممکن نہ ہو۔ لیکن اس کے برعکس یہ بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ اس بات میں کوئی صداقت نہیں کہ بیرونی امداد (اپنے اغراض و مقاصد کے حصول کو سامنے رکھتے ہوئے) ہر صورت میں اقتصادی ترقی کا وسیلہ بن سکتی ہے۔ پاکستانی معیشت بھاری پیمانے پر زرعی معیشت ہے اور اسی سے ہی قدرِ زائد حاصل کیا جا رہا ہے۔ اس لیے یہ جاگیردارنہ نظام کو استحکام فراہم کرتا ہے اور مسلح افواج کی تعداد کو

بھی بڑھانے کا سبب بن رہی ہے جو کہ ہمارے وسائل کا بڑا حصہ ہڑپ کر رہی ہے۔ یہ وہ چینل ہیں جو کہ ہمارے وسائل کے بڑے حصے کے زیاں کا سبب بن رہے ہیں اور ان کو روکنے کا کوئی انتظام کیا جا سکے تو اس کے نتیجے میں ہم اپنی ترقی کے لیے اندرونی ذرائع سے ہی کافی وسائل مہیا کر سکتے ہیں۔ اس بات پر بھی غور کیا جا سکتا ہے کہ اپنے زرعی نظام کو بہتر کر کے اور زرعی معاشرے کو چند مراعات (incentive) دے کر اپنی موجودہ پیداوار میں مزید خاطر خواہ اضافہ کر سکتے ہیں۔ آج شراکتی کاشت کاری (Sharecropping) ہماری مراعات پر مبنی طریقہ کار کی تباہی کا باعث بن رہی ہے۔ کیونکہ اس کے باعث زمین پر محنت کرنے والے اصل کسان کو ان مراعات سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو رہا ہے اور اس میں کی جانے والی تمام اضافی سرمایہ کاری کے نتیجے میں حاصل ہونے والی اضافی پیداوار سے وہ کسی صورت مستفید نہیں ہو سکا۔ اس معاملہ پر مزید بات کرنے کے لیے ہمیں عمومی انداز میں بات کرنے کے عمل سے کافی ہٹ کر بات کرنا ہوگی لیکن بنیادی طور پر اقتصادی ترقی کی رفتار اس بات پر انحصار کرتی ہے کہ ہم سماجی ڈھانچے کی تنظیم نو کریں۔ موجودہ صورتحال میں محض اعداد و شمار کی ہیر پھیر کے ذریعے ترقی کا حصول ممکن نہیں۔ اس لیے اس بات کی شدت سے ضرورت ہے کہ ہم بیرونی امداد کے اپنے سماجی ترقی پر پڑنے والے اثرات کا تفصیلاً جائزہ لیں۔

پاکستان کو ۱۹۶۰ء تا ۱۹۵۱ء کے عرصے میں ملنے والی بیرونی امداد کا ۵ / ۴ (Fourth fifth) حصہ امریکہ سے وصول ہوا۔ امریکہ نے پاکستان کو ملنے والی کل ۱۵۹۰ ملین ڈالر میں ۱۲۳۸ء۴ ملین ڈالر مہیا کیا۔ اس امریکی امداد کا ۵۷ فیصد حصہ امریکہ کی طرف سے زائد زرعی اجناس کی صورت میں وصول کیا گیا۔ تعریف چاہے کوئی بھی کی جائے لیکن بیرونی امداد (aid) کی صورت میں کئی مرتبہ گمراہ کن تعریفیں بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ بیرونی امداد کی مد میں ایک لفظ کو بالکل غلط معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے وہ ہے 'گرانٹ' (Grant) عمومی طور پر 'گرانٹ' کے مفہوم سے مراد اس چیز کی فراہمی ہے جس میں کسی واپسی (no quid pro quo) کا سوال نہیں ہوگا۔ اقوام متحدہ کے مطابق امداد (aid) ایک ایسے قرض کی منتقلی ہے جس کی واپسی کے لیے ادائیگی کا کوئی واضح شیڈول نہیں دیا گیا ہو۔ اس منتقلی کو گرانٹ کہا جائے گا۔ لیکن قرض بہرحال قرض ہے۔ چاہے اس کی واپس ادائیگی کے لیے باقاعدہ شیڈول دیا گیا ہو یا پھر نہ دیا گیا

ہو۔لیکن ہم یہ بھی دیکھتے یں کہ بیرونی امداد چاہے وہ اجناس کی فراہمی کے لئے ہی کیوں نہ ہوں ان کو بھی قرض قرار دے دیا گیا ہے مثلاً گندم 'قرض'(loan) کو بھی اسی کیٹگری میں رکھ دیا جاتا ہے جبکہ ایسی (transactions) تو پاکستانی روپوں میں خریدی جانے والی اجناس کے لئے ہیں۔ یقیناً ایسی صورت میں پاکستانی روپیہ ملک کے اندر ہی رہ جاتا ہے لیکن اس transactions کے کردار (character) سے اس بات کا تعین کیا جاتا ہے کہ ان روپوں سے کیا کیا جا سکتا ہے؟ اس رقم کا کچھ حصہ تو 'گرانٹس' کے طور پر تقسیم کیا جا سکتا ہے لیکن اس کا زیادہ تر حصہ یا تو قرضوں کی صورت اختیار کیے ہوئے ہوتا ہے یا پھر کوئی اور قسم کی transactions اس کو مزید وضاحت کے ساتھ ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔لیکن یہاں ہم اپنے قاری کو اس بارے میں آگاہ کریں گے کہ وہ بیرونی مدد (aid) کے لٹریچر (مواد) کا مطالعہ کرتے ہوئے grants کو کس مفہوم میں لیں؟

بیرونی امداد کی درجہ بندی(Classification):

پاکستان کو مہیا کی جانے والی فوجی مدد کی رقم کو علیحدہ طور پر کہیں نہیں دیا گیا جبکہ دیگر کئی ممالک جن کو امریکہ فوجی امداد فراہم کرتا ہے ان کے یہ اعداد و شمار جداگانہ بنیادوں پر دستیاب ہیں۔ بہرحال اس بات کا امکان موجود ہے کہ مہیا اعداد و شمار سے تخمینے کی بنیاد پر فوجی مقاصد کے لیے فراہم کی جانے والی مدد کے اعداد و شمار نکالے جا سکتے ہیں۔ امریکہ کے سرکاری شماریات (statistics) پاکستان اور سعودی عرب کے سوا دیگر تمام ممالک کو فراہم کی جانے والی فوجی امداد کے متعلق جداگانہ تفصیلات فراہم کرتے ہیں۔ان دونوں ممالک کے اعداد و شمار (figures) کو 'علاقائی' (regional) فوجی امداد کی کیٹگری میں شامل کر دیا گیا ہے۔۱۹۶۴ء تا ۱۹۶۰ء تک 'علاقائی' بنیادوں پر فراہم کی جانے والی کل فوجی امداد کا حجم ۵۷ء۴ ملین ڈالر تھا۔اس عرصے میں ترکی اور ایران کو بالترتیب ۱۹۲۴ ملین ڈالر اور ۵ء۵۷ برائے فوجی امداد کے لیے فراہم کیے گئے۔لیکن اس کے مقابل کئی ممالک کو بڑی تھوڑی رقم فراہم کی گئی۔مثلاً لبنان ۷ء۸ ملین ڈالر اور اردن کو ۶ء۱۷ ملین ڈالر فراہم کیے گئے۔اس لیے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مہیا کی جانے والی امداد کا ایک بڑا حصہ پاکستان کو ملا جبکہ عرب ممالک کو فراہم کی جانے والی امداد کا بیشتر حصہ

سعودی عرب کے حصے میں آیا۔ لیکن تیل کی کمپنی آرامکو تیل (Aramco Oil) کا امین (custodian) ہونے کے باعث اسے امداد کا کچھ اضافی حصہ بھی ملا۔ ان امدادی منصوبہ کے کچھ حصوں کو اس طرح تشکیل دیا گیا ہے کہ اس کے فوائد علاقائی بنیادوں پر حاصل کیے جائیں اس طرح سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی جائے کہ یہ رقم کسی مخصوص ملک کو نہیں بلکہ علاقے کی دفاعی ضروریات کو مدنظر رکھ کر دی گئی۔ اس لیے یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اس عرصے میں پاکستان کو ملنے والی امریکی تکنیکی امداد کی مد میں فراہم کی جانے والی امداد کا ایک چوتھائی فوجی امداد کے لیے مختص رہا۔ تکنیکی امداد میں کئی چیزیں شامل ہیں۔ مثلاً ۱۹۶۰ء کا کولمبو منصوبہ (plan) اعلان کرتا ہے: ''امریکی تکنیکی کارپوریشن پروجیکٹ کے نصف سے زائد وسائل (funds) ان ممالک کے تعلیمی اداروں کی بہتری اور ان کے مزید پھیلاؤ کے لیے مختص کیے گئے اور زیادہ تر مواقعوں پر یہ کام امریکی جامعات کو ٹھیکے پر دے کر ان سے کروائے گئے''۔

گذشتہ کچھ برسوں میں اس غیر ملکی مدد (aid) پروگرام کے تحت کئی fields کے غیر معمولی تعداد میں ماہرین پاکستان آئے۔ ہمیں ان ماہرین کے درمیان جو کہ عمومی طور پر منصوبہ بندی اور فیصلہ سازی میں مہارت رکھتے ہیں۔ اور پھر وہ ماہرین جو کہ کسی مخصوص منصوبے کو ڈیزائن کرنے، چلانے اور اس کو عملی جامع پہنانے میں ماہر ہیں، ان کے درمیان فرق کرنا ضروری ہے۔ منصوبہ بندی اور پالیسی وضع کرنے سے جو مسائل اٹھتے ہیں ان پر ہم تو بعد میں بات کریں گے۔ یہاں ہم صرف عمومی معاملات (issues) پر بات کریں گے۔

امریکن سی آئی اے (CIA) کی رائے ان ماہرین کے انتخاب میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ خاص طور پر ان منصوبوں کے سلسلے میں جن میں کہ مدد (aid) کا عنصر شامل ہو۔ ان ماہرین کو زیادہ تر امریکی کمرشل کمپنیوں سے مستعار لیا جاتا ہے۔ جن کے مفادات پاکستان میں شروع کیے جانے والے منصوبوں سے منسلک ہوتے ہیں۔ زیادہ تر ماہرین بڑے قلیل عرصے کے لیے پاکستان بھیجے جاتے ہیں اور ان کے معاہدے (contracts) کی مدت عمومی طور پر دو سال سے زائد نہیں ہوتی اس سے باآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ یہاں کس طرح وفاداری کے ٹکراؤ (Conflict of loyalities) کا شکار ہوتے ہوں گے۔ یہ شکایات تواتر سے سننے کو ملتی ہیں کہ یہ ماہرین کسی بھی منصوبے کی جزیات (specifications) اس طرح ترتیب

دیتے ہیں کہ اس منصوبے میں استعمال ہونے والے تمام آلات اور مواد صرف ان کی گروپ (Parents Firms) سے ہی حاصل کیا جائے۔ کئی cases میں تو تمام اہم فیصلے ان ماہرین کے رحم وکرم پر بھی چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ حکومت پاکستان نے ان ماہرین کے بڑھتے ہوئے کردار سے خوف زدہ ہوکر ۱۹۵۸ء میں ایک اطلاع نامہ (circular) جاری کیا جس میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی گئی کہ ان ماہرین کا کام مشاورت (advisory) فراہم کرنا ہے اور انہیں کسی بھی صورت انتظامی (executive) کردار ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن صرف ایک اطلاع نامہ اس قسم کی جاری روایات (practices) کو فوری طور پر ختم کرنے کا باعث نہیں بن سکتا خاص طور پر اس صورت میں جبکہ ان امریکی ماہرین کی دی گئی رپورٹ سے پاکستانی افسران کا مستقبل وابستہ ہو۔ اس کا نتیجہ بڑا واضح ہے۔ اس صورت میں ان ماہرین کی گروپ کمپنیاں پاکستان کے مفادات پر حاوی ہوجاتی ہیں۔

وہ غیر ملکی ماہرین جو کہ پاکستان مختصر دورانیہ کے ٹھیکے (contract) پر آتے ہیں ان کے سلسلے میں عمومی بنیادوں پر ایک مشکل دیکھی جاتی ہے۔ ان میں سے اکثر کو مقامی مسائل اور مخصوص ضروریات کا بہت کم تجربہ ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد جب وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ وہ کوئی کردار ادا کرسکیں تو اس وقت ان کی واپسی کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔ ان cases میں جہاں یہ ماہرین کسی امریکی مینوفیکچرنگ (manufacturing) کمپنی کے ملازم ہوں تو اس صورت میں ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی کمپنی کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچاسکیں۔ پاکستان کے مقامی حالات کے متعلق تجربہ حاصل کرلینے کے باعث بعدازاں یہ ماہرین مقامی منڈی میں بڑے اچھے عہدوں کی دوڑ میں شریک ہوجاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ پاکستانیوں سے بھی زیادہ فوقیت حاصل کرنا شروع کردیتے ہیں جن سے حکومت بڑا کم تعاون کرتی ہے۔ اس میں ایک اور قسم کی مشکل بھی حائل ہے۔ وہ یہ کہ یہ غیر تجربہ کار ماہرین جو کہ ہنرمند (qualified) پاکستانیوں کے سروں پر مشیر (advisor) بنا کر بٹھادیئے جاتے ہیں۔ اس لیے پاکستانی یہ بات محسوس کرتے ہیں کہ ان کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا جاتا جس کے وہ جائز حقدار ہیں۔ مزید یہ کہ اکثر ماہرین پاکستان میں بڑی بھاری بھرکم تنخواہیں وصول کرتے ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں لگائے جانے والے ایک تخمینے کے مطابق پاکستان کو ایک غیر ملکی ماہر کو رکھنے کے لیے ماہانہ ۱۲۰۰ روپے خرچ کرنا پڑے۔ یہ

وہ رقم ہے جو کہ یکساں تعلیمی قابلیت کا پاکستانی ماہر ایک سال میں پاتا تھا۔ اکثر و بیشتر غیر ملکی ماہرین کی پاکستان کو کوئی ضرورت نہیں لیکن یہ لوگ زبردستی ہم پر تھوپے جاتے ہیں۔ ہندوستان کی وزارت خوراک میں اقتصادیات اور شماریات کے لیے لگائے گئے مشیر (advisor) ڈاکٹر سین ۱۹۵۲ء میں لکھتے ہیں: ''کئی کیسز میں ایسا ہوا کہ ہمارے پاس اپنے ماہرین موجود ہیں اور ہمیں ان کے لیے تکنیکی امداد کے طور پر صرف وہ آلات درکار تھے۔ جن پر کہ ہمارے یہ ماہرین کام کر سکیں۔ لیکن ہمیں یہ بتایا گیا کہ یہ آلات آپ کو صرف اس صورت میں ہی دیئے جا سکتے ہیں۔ جبکہ آپ ہمارے ماہرین کو بھی ان کے ساتھ تعینات کریں۔ ایک بار جب یہ ماہرین آ جاتے ہیں تو پھر وہ اپنے صرف مشاورت (advisory) کے ساتھ منسلک نہیں رہتے۔ پاکستان ٹائمز نے ایک رپورٹ شائع کی ''حکومت پاکستان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جا رہی ہے کہ امریکی ٹیکنیشن اپنی اصل ذمہ داریوں کو پس پشت ڈال کر اندرونی انتظامی معاملات میں دلچسپی لینا شروع کر دیتے ہیں اور اپنی اصل ذمہ داریوں سے غافل ہو جاتے ہیں''۔ (۲۵ اگست ۱۹۵۸ء) اخبار لکھتا ہے کہ مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ عطاء الرحمٰن ملک کے اندرونی معاملات میں امریکیوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو سختی سے رد (deplore) کرتے ہوئے اس کو روکنے کی تنبیہ کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ تجربہ اپنی وزارت اعلیٰ کے دوران مختلف ترقیاتی منصوبوں پر عمل درآمد کے دوران تجربہ کیا۔

منصوبہ کی امداد (Project Assistance):

یہ مدد (aid) مخصوص ترقیاتی منصوبوں مثلاً آبپاشی کے منصوبوں، بجلی گھروں، بندرگاہوں کی دوبارہ تعمیر وغیرہ کے لیے ہوتی ہیں۔ امریکی پروجیکٹ امداد کے پروگرام کی خصوصیت یہ ہے کہ کسی ایک پروجیکٹ کو کلی طور پر مدد نہیں کرتا بلکہ بیک وقت حکومت پاکستان کی طرف سے شروع کیے گئے کئی منصوبوں میں جزوی طور پر مدد فراہم کرتا ہے۔ اس طرح یہ بیشتر پروجیکٹ بذات خود (automatically) مدد فراہم کیے جانے کی شرائط کے زیر اثر آ جاتے ہیں اور بالآخر یہ تمام پروجیکٹ امریکی امدادی مشن کے زیر کنٹرول سمجھے جاتے ہیں۔ امریکہ کی ان منصوبوں میں بڑی کم شراکت داری ہوتی ہے جس کا اندازہ کولمبو پلان کی حالیہ دنوں میں جاری ہونے

والی تازہ ترین رپورٹ سے ظاہر ہوتا جس کے مطابق امریکی امداد ان منصوبوں پر خرچ ہونے والی کل رقم کا صرف ۱۸٫۶ فیصد تھی بقیہ تمام رقم پاکستان اپنے وسائل سے خرچ کر رہا تھا۔ امریکہ کی طرف سے ان منصوبوں پر ایک چوتھائی (less than a fifth) سے بھی کم فراہم کرنے کے باوجود (امریکی امدادی مشن حکومت پاکستان کے وسائل سے شروع کیے گئے ان منصوبوں کا کنٹرول سنبھال لیتا ہے۔

امداد ان مخصوص منصوبوں کے لیے فراہم کیجاتی ہے جن کی منظوری کراچی میں موجود سی آئی اے کا مشن دیتا ہے۔ پروجیکٹ مدد یا تو گرانٹ یا پھر قرض دونوں صورتوں میں دی جاسکتی ہے اور اس کی واپسی پاکستانی روپوں میں ہوگی۔ گرانٹ کی صورت میں حکومت پاکستان کے لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ وہ ایک خاص اکاؤنٹ میں پروجیکٹ کی تخمینی رقم کا ایک بڑا حصہ جمع کرائے جو کہ اس پروجیکٹ کی تعمیر کے دوران فنڈز کی فراہمی کو یقینی بنائے۔ یہ رقم اس رقم کے کم از کم مساوی ہونی چاہیے جو کہ امریکہ ڈالروں کی صورت میں اس منصوبے کے لیے فراہم کرے۔ اس رقم کے اکاؤنٹ سے نکالے جانے کے عمل کی منظوری کراچی میں سی آئی اے کے قائم مشن سے حاصل کرنا ضروری ہوگی اور یہ رقم پروجیکٹ کے مختلف مراحل پر کام کو یقینی بنانے کے بعد ہی آہستہ آہستہ نکالی جاسکے گی۔ اس طرح سی آئی اے نہ صرف ان منصوبوں پر 'نگرانی' (supervision) کے اختیارات حاصل کر لیتی ہے جو کہ ان امدادی معاہدوں کا حصہ ہوتے ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ اس کے تمام اخراجات کا بھی کنٹرول سنبھال لیتی ہے۔ اس طرح حکومت پاکستان کا تمام ترقیاتی کاموں کا نظام (operation) امریکی امدادی مشن (US Aid Mission) کے زیر کنٹرول آجاتا ہے۔

امریکہ ان مہیا کیے گئے فنڈز کا بیشتر حصہ 'منصوبہ بندی اور سروے' کے کام کے نام پر دوبارہ وصول کر لیتا ہے۔ یہ بیان حکومت کی زیر نگرانی میں ہونے والے سرکاری اخبار پاکستان ٹائمز میں 'خصوصی نمائندے' کی طرف سے شائع ہوا (۱۱ جون ۱۹۶۱ء) جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ امریکہ ان منصوبوں کے لیے مختص کی جانے والی کل رقم کے ۶۰ سے ۵۰ کو consultants اور ٹھیکہ داروں کی فیس کی صورت میں واپس وصول کر لیتا ہے۔ اس بیان میں یہاں تک کہا گیا کہ وارسک اور کرنافلی (Karnaphuli) میں شروع کیے گئے دونوں منصوبوں میں اس مد میں وصول کیے جانے

والے اخراجات ۵۰ فیصد سے بھی زائد تھے''۔ مزید یہ کہ امریکی دخل اندازی اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ حکومت پاکستان کا کردار اس صورتحال میں بالکل بے بس رہ گیا ہے، اور اس کی اس بے بسی کے باعث امریکی امدادی مشن اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ تمام ٹھیکوں کی بولیاں صرف امریکی ٹھیکدار ہی دیں اور ان کی یہ بولیاں جو کہ انتہائی اونچے داموں پر ہوتی ہیں وہ ہر صورت میں منظور کر لی جائیں۔ ان معاملات کو سمجھنے کے لیے کراچی کی کاروباری برادری زبردست معلومات فراہم کر سکتی ہے لیکن اس کے لیے مستحکم شواہد اکٹھا کرنے کے لیے ضروری ہوگا کہ اس کے لیے تفصیلی محکمانہ تفتیشی کاروائی عمل میں لائی جائے ہمارے علم میں اب تک صرف ایک معاملہ سامنے آیا ہے (وہ بھی ہندوستان میں) جہاں اس معاملے میں بڑے پیمانے پر ہونے والی خورد برد کی تفصیلات عوام تک پہنچ سکیں۔ یہ معاملہ انڈیا کی طرف سے امریکی امداد سے ریلوے انجن خریدنے کے متعلق تھا۔ حالانکہ ان انجن کے لیے جاپان کی طرف سے پیش کردہ قیمت ۸۱،۵۰۰ ڈالر تھی جبکہ امریکہ نے اس کے مقابل اسی انجن کے لیے ۷۸۰۰۰، ڈالر کی قیمت بتلائی۔ مزید یہ کہ امریکی حکام نے ہندوستانیوں پر زور ڈالا کہ اپنی خریداری کا نصف آرڈر امریکی سپلائرز کو دیں۔ اس دباؤ کے باعث ہندوستانیوں کے انجنوں کی خریداری پر ۴٫۸ ملین ڈالر سے زائد اضافی رقم ادا کرنی پڑی۔ انڈیا نے اس مقصد کے لیے ۲۰ ملین ڈالر کا قرض لیا۔ لیکن حقیقت میں اس کو صرف ۱۵٫۲ ملین ڈالر وصول ہوئے۔ لیکن اس کو واپس ادائیگی ۲۰ ملین ڈالر ہی کرنا ہوگی بمعہ سود۔ اس قسم کا قرض اور اس پر بڑا چڑھا کر سود لگانا ہندوستان کے دیہی علاقوں کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے جہاں جاگیردارانہ ماحول میں سادہ لوح کسان لالچی سود خوروں کے ہاتھوں ہمیشہ ایسے ہی استحصال کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ بین الاقوامی معیار پر یہ 'امداد' (aid) ہے۔ (اس معاملے کی تفصیلی جانچ کے لیے نیویارک ٹائمز مورخہ کا مطالعہ کریں مورخہ ۴ ستمبر اور ۱۹ اکتوبر ۱۹۵۴ء۔

کس طرح حکومت پاکستان امریکی سپلائرز اور امریکی ٹھیکہ داروں کے دباؤ میں آ کر پریشان ہوتی ہے اس کا جائزہ لینے کے لیے حال ہی میں پاکستان ٹائمز میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ یہاں بیان کی جاتی ہے۔ رپورٹ جو کہ حکومت پاکستان کی آشیر باد سے اس وقت شائع ہوئی جب حکومت کو اس بات کی وجہ سے مایوسی ہوئی جب یقین دہانی کرائے جانے کے باوجود پاکستان کو عالمی بینک نے امداد فراہم کرنے سے معذرت ظاہر کی۔ پاکستان ٹائمز کی رپورٹ کہتی ہے:

''سرکاری ملازمین کے لیے یہ انتہائی مشکل ہوگیا ہے کہ وہ پاکستانی انجینئروں، ٹھیکیداروں، اور فرموں کے consultants کو کس طرح قائل کریں کہ ان کے ساتھ یہ ایجنسیاں (امداد دینے والی ایجنسیاں) کوئی امتیازی سلوک نہیں کر رہیں۔ جبکہ عالمی بینک کی طرز کی ایجنسیاں اس حقیقت کے برعکس کام کر رہی ہیں (یعنی مقامی صلاحیت (talent) اور تجربے کے استعمال کے سلسلے میں)..... ٹھیکوں کے دیئے جانے کے دوران اور ٹینڈر طلب کرتے وقت ایسی امتیازی اور مخصوص شرائط عائد کردی جاتی ہیں جو بذات خود (automatility) مقامی پاکستانی کمپنیوں کو اس ٹینڈر کے عمل سے باہر کردیتی ہیں..... یہ بات بتائی جاتی ہے کہ تمام بڑے پروجیکٹ مثلاً جناح بیراج، غلام محمد بیراج (کوٹری بیراج)، تونسہ بیراج، اور گدو بیراج یہ تمام پاکستانی انجینئر اور ٹھیکیداروں نے ڈیزائن کیے۔ منصوبہ بندی اور ان پر عملدرآمد کیا..... لیکن ان کے باوجود عالمی بینک نہ تو اس بات کا کوئی نوٹس لے رہا ہے اور نہ ہی مقامی ٹھیکیداروں اور کمپنیوں کو اس قسم کے کوئی کام دینے کے لیے تیار نظر آتا ہے حالانکہ مقامی کمپنیاں ایسے تمام کام سرانجام دینے کی مکمل قابلیت اور صلاحیت رکھتی ہیں۔

اجناسی امداد:

جیسا کہ ہم نے اوپر دی گئی جدول میں دیکھا کہ پاکستان کو فراہم کی جانے والی امریکی امداد عمومی طور پر زائد زرعی اجناس کی صورت میں فراہم کی گئی۔ یہ نہ صرف امداد فراہم کرنے کا سب سے بنیادی (Principal) وسیلہ ہے۔ بلکہ امداد کی یہ صورت دونوں ممالک کے درمیان اقتصادی (financial) تعلقات کے ایک ایسے نظام (set) کو جنم دیتی ہے جس کا اثر 'اجناس کی امداد' کی روایتی تعریف کے زمُرے سے بہت زیادہ باہر نکل جاتا ہے۔ یہ امداد دو مختلف قوانین کے تحت فراہم کی جاتی ہے۔ اول باہمی سیکیورٹی ایکٹ اور دوئم زرعی تجارت کی ترقی اور مدد کے ایکٹ (Pl.480) ہے۔ امداد کی اس صورت میں مختلف زرعی اجناس پاکستان کو فراہم کی جاتی ہے جن کی ادائیگی حکومت پاکستان روپوں کی صورت میں کرتی ہے۔ اس transaction کے پہلے حصے میں درحقیقت حکومت پاکستان ان زرعی اجناس کی خریدار ہوتی ہے۔ 'امداد' کی نوعیت (character) اور اس کی اقتصادی اہمیت کا تعین بعدازاں اس بات سے ہوتا ہے کہ اس کے عوض کتنے پاکستانی

روپے حاصل (Raise) کیے جاسکتے ہیں، ان فنڈز کا کنٹرول اور پھر ان کو کس مد میں خرچ کیا جارہا ہے۔ ان فنڈز کو مہیا کی جانے والی اجناس 'امداد' کے مقابلے فنڈ (counter-part funds) کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اس اجناسی امداد کے مد میں حاصل ہونے والے فنڈز کے استعمال کو دو کیٹیگریز میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس تقسیم کی بنیاد وہ قانون ہوتا ہے جس کے تحت یہ امداد فراہم کی گئی۔

حکومت پاکستان کے فنڈز:

یہ وہ فنڈز ہیں جو کہ پاکستانی روپوں میں باہمی سیکیورٹی ایکٹ کے تحت اجناس کی صورت میں مہیا کیے جانے سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ یہ رقم مہیا کی جانے والی اجناس کی مالیت (value) اور کسٹم ڈیوٹی کو ظاہر کرتی ہے اور جس کے ذریعے ترقیاتی منصوبوں کو رقم مہیا کی جاتی ہے۔ لیکن حکومت پاکستان کو امریکی امدادی مشن کی منظوری لیے بغیر ان فنڈ کو خرچ کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں۔ اسی طرح PL۴۸۰ (عنوان II) کے تحت مہیا کی جانے والی اجناس جو کہ ریلیف کے مقصد کے تحت فراہم کی جاتی ہے وہ بھی اسی کیٹگری میں شامل ہے۔

امریکی حکومت کے فنڈز:

PL۴۸۰ (عنوان ا) کے تحت مہیا کی جانے والی اجناس سے حاصل ہونے والے فنڈز کی مساوی پاکستانی رقم ایک خاص اکاؤنٹ میں ڈال دی جاتی ہے جو کہ خاص طور پر اس مقصد کے لیے کھولا گیا ہوتا ہے۔ جہاں تک PL۴۸۰ (عنوان ا) کے تحت حاصل ہونے والے فنڈز اور ۱۹۸۵ء تک اس مد میں کل جمع شدہ فنڈز کی پوزیشن کا تعلق ہے وہ کچھ اس طرح ہے:

ادائیگی (ملین امریکی ڈالر میں)

ادائیگی برائے						
ترقیاتی گرانٹ	حکومت پاکستان کو قرض	امریکی ذمہ داریاں	فوجی خریداری	کاروباری قرضہ جات	دیگر	کل
۱۲٫۳	۸۹٫۱	۵۰٫۰	۷۹٫۴	۲۸٫۷	۸٫۸	۳۶۳٫۳

اس بجٹ میں دکھائی گئی رقم جو کہ 'گرانٹ' کی صورت میں دکھائی گئی ہے وہ ابتدائی چھ ماہ جون۔ دسمبر ۱۹۵۸ء کے عرصے یعنی فوج کے اقتدار سنبھالنے کے بعد ہوتی ہے۔ اس جدول میں دکھائی گئی 'امریکی ذمہ داری' کی رقم وہ رقم ہے جو کہ امریکہ کو اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے عوض بصورت دیگر امریکی ڈالروں کی صورت میں پاکستان کو ادا کرنی پڑتی۔ امریکہ اس مد میں بھی خوب فائدے میں رہا۔ اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے عیوض اس نے ڈالروں کے بجائے اپنی اضافی اجناس عالمی نرخوں کے مقابلے میں کافی اونچے داموں پر مہیا کر کے (درج ذیل تفصیل دیکھئے) اپنے آپ کو نقد ڈالروں میں ادائیگی سے کلی طور پر بچالیا۔ ڈالروں میں نقد ادائیگی کی صورت میں پاکستان شاید اس کا مزید بہتر استعمال کر سکتا تھا۔ کاروباری قرضہ جات کی صورت میں یہ قرضہ فقط امریکی فرم کو دیا جا سکتا تھا یا پھر وہ پاکستان فرم مجاز تھی جو کہ امریکی فرموں کے مال کی مارکٹنگ میں مصروف ہوں۔ 'دیگر مصارف' میں دکھائی گئی رقم یعنی ۸ء۸ ملین ڈالر دراصل 'ان ثقافتی activities پر اُٹھنے والے اخراجات کے لیے تھی جو کہ امریکہ بڑی سوچ بچار کے بعد پاکستان میں خرچ کرتا ہے۔ یہ رقم ان امور پر خرچ ہوتی مثلاً 'اطلاعات اور تعلیم' (امریکی اطلاعاتی سروس کی جانب سے) 'ترجمہ اور اشاعت' اور 'بین الاقوامی تعلیمی ایکسچینج' جبکہ حکومت پاکستان کو قرض کی مد میں فراہم کی گئی ۱ء۸۹ ملین ڈالر وہ رقم ہے جو کہ حکومت کو مدد (aid) کے علاوہ فراہم کی گئی۔ اس قرض پر بڑے اونچے داموں پر سود کی ادائیگی کی گئی۔ پاکستان نے اس سلسلے میں امریکہ سے بڑا احتجاج بھی کیا لیکن اس میں کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر ہمیں ادائیگی ہر صورت کرنا پڑی۔

دسمبر ۱۹۵۸ء تک حکومت پاکستان کو PL ۴۸۰ کے تحت ۳ء۲۶۳ ملین ڈالر کی اجناس فراہم کی گئیں۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا یہ ادائیگی روپوں میں کی گئی۔ بہرحال یہ اعداد و شمار مہیا کی گئی امداد کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر مبالغہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ ان اجناس کی قیمتیں امریکہ کا اجناسی قرض دینے والی کارپوریشن (Commodity Credit Corporation of America) مقرر کرتا ہے جو کہ ہمیشہ عالمی منڈی کے نرخوں کے مقابلے میں زیادہ قیمت وصول کرتا ہے۔ کیونکہ ان اجناس کو امریکی بحری جہازوں کے ذریعے پہنچانا ہوتا ہے۔ نیویارک ٹائمز کی ایک رپورٹ کے مطابق جو کہ ۱۳ جون ۱۹۵۳ء کو شائع ہوئی، اس کے مطابق امریکہ کی طرف سے مہیا کی جانے والی اجناس کو امریکی جہازوں کے ذریعے پہنچانے پر

خرچے کا تخمینہ ۲۶ ڈالر فی ٹن تھا جبکہ اگر یہی اجناس کسی دوسرے ملک کے سمندری جہاز سے بھیجی جاتیں تو اس کی لاگت کا تخمینہ ۱۸ تا ۱۴ ڈالر فی ٹن تھا۔

PL۴۸۰ اس لیے متعارف کرایا گیا تھا تا کہ اس کے ذریعے ہزاروں ٹن کی اضافی خریدی گئی اشیاء کا اخراج کیا جا سکے۔ یہ اجناس امریکی حکومت کو کاشتکاروں سے مددی نرخوں کے تحت خریدنا پڑی تھی اور اب اضافی اجناس کو گوداموں میں ذخیرہ کرنے کے لیے صرف ایک برس کے لیے ایک بلین ڈالر کی ضرورت تھی۔ اس اضافی اجناس سے اپنی جان چھڑوانے کے دباؤ کے تحت امریکہ نے یہ اجناس کچھ ممالک کو مہیا کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ امداد کے حصول کے متلاشی ممالک کے امریکہ پر انحصار کو بڑھایا جا سکے۔ کئی مثالیں تو ایسی بھی دیکھنے کو ملیں جہاں امریکہ نے ان تمام ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتے ہوئے ان ممالک کو اپنے ترقیاتی منصوبوں پر عمل درآمد کرنے سے روک دیا۔ خدشہ تھا کہ ایسے ترقیاتی منصوبے کے باعث ان ممالک کے امریکہ پر انحصار میں کمی نہ آ جائے۔ امریکی سینیٹر گرین Formosa میں اپنی ایک رپوٹ جس کا حوالہ قبل ازیں آ چکا ہے کہتے ہیں ''وہ مقام پہلے ہی آ چکا ہے جہاں امریکی مشن نے چاول کی پیداوار پر زور دینا بند کر دیا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ چاول کی برآمد ہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے Formosa کو خود انحصاری کی راہ پر ڈالا جا سکتا ہے۔ جب ہماری پالیسی یہ ہے کہ ہم اپنے اضافی چاول کو پہلے نکالنے کے خواہش مند ہیں''۔ اس طریقہ کار نے امداد وصول کرنے والے ممالک کے زرعی ترقی کے طور طریقوں کو تباہ کر دیا ہے۔ UNRA کا ایک سابقہ اہلکار سی اے مینکمین جو کہ بڑے طویل عرصے تک یونان میں قائم امریکی امدادی ادارے سے وابستہ رہے وہ بتاتے ہیں کہ یونان میں شکر کی کاشت کو وسعت دینے کے کئی منصوبوں کو امریکی دباؤ پر روکنا پڑا۔ اس امریکی امداد دینے والے ادارے (US Aid) کے اس رویے پر یونان میں غصہ پایا جاتا ہے کیونکہ ان کا خیال ہے کہ شکر قندی (sugar beat) کی کاشت کے نتیجے میں زرعی طریقوں میں بہتری لائی جا سکتی ہے۔ امریکی مشن کی اس پالیسی کے پس پشت امریکی کی یہ خواہش کارفرما ہے کہ یونان کی شکر کی منڈی امریکی سپلائی کے لیے کھلی رہے۔

پاکستان کو بھی اس پروگرام کے تحت مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ ایسی امریکی اجناس جس میں کہ ہم پہلے ہی خود کفیل ہیں وہ خریدی جائیں، اس کی سب سے عیاں مثال کپاس کی ہے۔ پاکستان

میں کپاس کی وہ قسم جسے 'امریکی قسم' (American Type) سے تعبیر کیا جاتا ہے نہ صرف خود کفیل ہے بلکہ ضرورت سے زائد پیدا ہوتی ہے اور جسے برآمد بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود پاکستان کو امریکن کپاس کی ۴۴۰۰ ۱۷ بیلیں مہیا کی گئیں اور خصوصاً بہ کثیر تعداد (۱۲۶۰۰۰ بیلیں) جولائی ۱۹۵۴ء اور دسمبر ۱۹۵۵ء کے درمیانی عرصے میں اس وقت مہیا کی گئی جبکہ اس دوران منڈی میں کپاس پہلے ہی ضرورت سے زائد مہیا تھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ملکی کپاس کی قیمتیں مزید نیچے آ گئیں جس کا براہ راست فائدہ کپاس مل مالکان کو پہنچا۔ اس کے باعث کپاس کے کاشتکاروں کو شدید دھچکا لگا اور مزید یہ کہ پاکستان کے ذرائع مبادلہ (Foriegn Exchange earnings) پر بھی منفی اثر پڑا۔ اس صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈی سی شورلنگ (D.C. Swerling) نے اپنے ایک مضمون میں جو کہ American Economic Review کے مئی ۱۹۵۹ء کے شمارے میں شائع ہوا، لکھتے ہیں 'پاکستان PL۴۸۰ کے تحت ہماری گندم کی امداد کو تو خوش دلی سے قبول کر رہا ہے لیکن ہماری کپاس کی وجہ سے پریشانی میں گھرا ہوا ہے۔ اس مضمون میں دیگر کئی ممالک کی حالت زار بھی بیان کی گئی۔ PL۴۸۰ کے تحت تمباکو اور ڈیری کی مصنوعات کی صورتحال بھی زیادہ مختلف نہ تھی۔ تمباکو کی درآمد بھی مقامی تمباکو کی قیمتوں کو گرانے کا سبب بنی۔ لیکن اس صورتحال کا براہ راست فائدہ manufactureres کو ہی پہنچا اور ایک غیر ملکی کمپنی کی تو درحقیقت اس میدان میں اجارہ داری ہی قائم ہے۔

امریکی گندم کو عالمی منڈی کی موجودہ (prevailing) نرخوں کے مقابلے میں مہنگے داموں پر خریدنے کا اعتراف خود پاکستان کے وزیر خزانہ امجد علی نے ستمبر ۱۹۸۷ء میں پاکستانی پارلیمنٹ کے آخری اجلاس سے خطاب کے دوران کیا۔ انہوں نے اس اضافی ادا کی جانے والی رقم کو اس بنیاد پر جائز قرار دیا چونکہ یہ رقم امدادی مدد سے ادا کی جا رہی تھی۔ اگر اس سلسلے کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو اصل صورتحال اس کے برعکس تھی۔ PL۴۸۰ میں ملنے والی کل امدادی رقم ۲۶۸٫۳ ملین ڈلر میں سے صرف ۱۲٫۳ ملین ڈالر امداد تھی۔ جبکہ بقیہ رقم امریکی حکومت کے وہ فنڈز تھے جو کہ ڈالر remittances کے بدلے (lieu) میں تقسیم کی گئی تھی۔ اس طرح حکومت پاکستان نے مہنگے داموں گندم خرید کر امریکی حکومت کے فنڈز کو subsidity فراہم کی نہ کہ پاکستانی سرکار کو فراہم کی گئی۔ مزید یہ کہ اگر ہم یہ دیکھیں کہ حکومت پاکستان کا روپوں کی صورت میں

امریکی حکومت کو ان اجناس کی خریداری کے عوض ادائیگی جن کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں ایسے اقدامات ہیں جس کا کہ ہماری معیشت کو فائدہ پہنچانے کے بجائے اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہورہے ہیں۔اس صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اس 'بیرونی امداد' سے کون مستفید ہورہا ہے۔

اس صورتحال میں ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ سوائے اس مختصر مدت کے دوران جبکہ ملک میں خوراک کی قلت کا امکان تھا، اس عرصے میں فراہم کی گئی گندم کے علاوہ، دیگر اجناس پاکستان کی اقتصادی ترقی کے لیے کسی بھی طرح سودمند ثابت نہ ہوسکیں۔ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اس سلسلے میں ملنے والی امداد جسے ''ہم مقابل فنڈ'' (counterpart funds) کا نام دیا گیا ہے اور جن کو پاکستان میں پاکستانی روپے کی صورت میں رکھا جانا ہے۔اس پر حکومت پاکستان کا کسی قسم کا کوئی کنٹرول نہیں ہے سوائے ان اجناس کے جو کہ ہمیں فراہم کی گئیں۔اس کا واحد استعمال یہ رہا کہ ٹیکس کی مد میں بڑی قلیل رقم اکٹھا کرنے کے باعث حکومت پاکستان کے اخراجات اور محاصل کے درمیان پائے جانے والے فرق کو پورا کرنے کے لیے اس کا استعمال کیا جائے۔ دوسرا نعم البدل یہ ہوگا کہ حکومت اندرونی قرضوں (domestic borrowing) یا پھر deficit financing کا راستہ اپنائے۔ان دونوں راستوں کی وکالت ہمارے وہ اقتصادی ماہرین کررہے ہیں جنہیں کہ حکومت پاکستان نے دوسرے پنج سالہ منصوبے بندی کی تیاری کے لیے کام پر لگایا ہوا ہے۔حکومت نے ان دونوں راہوں میں سے اندرونی قرضہ جات حاصل کرنے کو رد کرتے ہوئے 'عارضی' راہ اپنانے کو ترجیح دی۔کیونکہ حکومت کا خیال تھا کہ اندرونی ذرائع سے قرضہ اٹھانے کے باعث ملک میں deficit financing کو بڑھاوے کا موقع ملے گا جو کہ افراط زر (inflation) کا سبب بنے گی۔لیکن اندرونی financing کی ایک بڑی چھوٹی سی رقم ہوگی جس میں اسٹیٹ بینک کی مداخلت ہوگی۔مزید یہ کہ جمع شدہ 'ہم منصب فنڈز' سے استعمال کے لیے نکالی جانے والی رقم بھی ملک میں اسی درجے کے افراط زر کا باعث بنے گی۔خصوصی طور پر فوجی اخراجات کے مد میں ادائیگی کے لیے حکومت پاکستان نے ہم منصب فنڈز سے ادائیگی کو ترجیح دی۔۵۸۔۱۹۵۷ء کے عرصہ کے دوران حکومت پاکستان نے فوجی مقاصد کے لیے اس فنڈز سے ۳ء۴۷ ملین ڈالر کت مساوی رقم پاکستانی روپوں میں خرچ کی گئی۔کیونکہ اس مد میں خرچ ہونے

والے اخراجات کیونکہ قومی بجٹ میں دکھائے نہیں جاتے اس لیے دفاعی مقاصد کے لیے مختص کی گئی رقم اس رقم کے مقابلے میں بہت کم دکھائی جاتی ہے جو کہ درحقیقت اس میں خرچ ہوتی ہے۔ ہم منصب فنڈ کے ذریعے حکومتی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے بے تحاشہ انحصار بے حد خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ یونان اس کی ایک واضح مثال ہے۔ منکمین (Munkman) لکھتا ہے:

'امریکن مشن' بینک آف یونان کے ہم منصبی اکاؤنٹ کا سب سے بڑا جمع کنندہ (depositor) ہونے کے باعث اس پر اثر انداز ہو کر اسے اپنی مرضی کے مطابق ہیر پھیر (manipulate) بھی کرسکتا ہے..... ۱۹۵۱ء کے آخر میں امریکی مشن نے اچانک جاری تمام سرمایہ کاری کے منصوبوں پر ہم منصب فنڈ کے جانے والے تمام اخراجات پر پابندی عائد کرنے کا اعلان کر دیا۔ ۱۹۵۲ء میں امریکی حکومت نے یونان کو بجٹ کی مدد فراہم کی جانے والی امداد سے لاتعلقی اور سرمایہ کاری کے منصوبوں میں اپنی طرف سے فراہم کی جانے والی امدادی عمل سے اپنے آپ کو علیحدہ کرنے کا اعلان کرتے ہوئے حکومت یونان کو مشورہ دیا کہ وہ ملک میں معاشی استحکام لانے کے لیے خود اقدامات کرے۔ اس مشورے میں ترقیاتی منصوبوں میں کٹوتی اور آہستہ آہستہ امداد کے خاتمے جیسے اقدامات شامل تھے۔ اگلے مالی سال میں اس کا کل (net) نتیجہ یہ نکلا کہ تقریباً تمام پروگراموں کا یا تو کلی طور پر خاتمہ کر دیا گیا یا پھر ان پر عملدرآمد (فنڈز کی عدم دستیابی کے باعث) انتہائی سست رفتار ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یونان میں ہر جگہ نامکمل ترقیاتی منصوبوں پر یہ آویزاں بورڈ مارشل پلان اور امداد امریکی عوام کی طرف سے تحفہ'' جیسے بورڈ نظر آنے لگے، جو کہ شرمندگی کا باعث بننے لگے۔ سفارتی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے امریکی مشن کو بالآخر یہ مشورہ دینا پڑا کہ ان تمام بورڈز کو فوری طور پر ہٹایا جائے۔

کسی بھی ملک میں اکاؤنٹ کھول کر کثیر رقم جمع کرنے کے باعث اس کی اقتصادی منصوبہ بندی میں امریکی حکومت کو اہم کردار ادا کرنے کا نایاب موقع ہاتھ آجاتا ہے، اور وہ حکومت کی طرف سے شروع کیے گئے ترقیاتی منصوبوں میں اپنے مفادات کو سامنے رکھ کر مداخلت کاری کا عمل شروع کر دیتے ہیں۔ امریکہ پر انحصاری اپنانے کے باعث ان ممالک کے پاس اس بات کے علاوہ کوئی راستہ بچ نہیں جاتا کہ وہ ترقیاتی پالیسی میں امریکی مداخلت اور ہدایات پر بڑی تابعداری سے عمل کرتے چلے جائیں۔ اسی طرح پاکستان میں بھی امریکی حکومت پاکستان کے

اقتصادی اور سیاسی نظام میں اپنا بھرپور اثر ونفوذ استعمال کر رہی ہے۔

پاکستان اور امریکہ کے درمیان ہونے والے معاہدوں کی شرائط کے تحت امریکی حکومت کو اس بات کا مکمل حق حاصل ہے کہ وہ ان تمام ترقیاتی منصوبوں (جن میں چاہے امریکی امداد بہت کم تناسب میں خرچ ہو رہی ہو) کی تمام تفصیلات کسی بھی وقت طلب کر سکتی ہے۔ اجناسی امداد کی فراہمی کے لیے کیے جانے والے معاہدے کی شرائط کے تحت یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ چونکہ امریکہ کو پاکستان کی معیشت کے استحکام سے براہ راست دلچسپی ہے اس لیے امریکہ کی خواہش ہے کہ اسے پاکستان کی اقتصادی پالیسی بنانے کے عمل میں باقاعدہ نمائندگی دی جائے۔ امریکہ کی طرف سے اس کنٹرول کے حصول کی خواہش نے اس امداد کے آغاز کے ساتھ ہی دونوں طریقوں یعنی باقاعدہ اور informal طریقوں سے ایسے حربے استعمال کیے جس نے اسے پاکستانی اقتصادی منصوبہ سازی کے عمل پر دسترس مہیا کر دی۔ امریکہ اور پاکستان کے درمیان ہونے والے ان امدادی معاہدوں کے باعث، پاکستان کے لیے ضروری ہوگیا کہ پاکستان اپنی کرنسی کو مستحکم رکھنے اور اس کو مزید مضبوط کرنے اور ترقی کے عمل کو 'مضبوط بنیادوں' پر کھڑا کرنے کے لیے اقدامات کرے۔ اور اس کو یقینی بنانے کے لیے فراہم کی جانے والی امریکی امداد صرف ان مقاصد کے لیے ہی مصرف میں لائی جا رہی ہے جس کے لیے یہ مہیا کی گئی تھی اس کا جائزہ لینے کے لیے امریکی حکومت کو کلی طور پر یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لیے اپنے مشاہدہ کاروں (observers) کو وقتاً فوقتاً پاکستان بھیجتی رہے۔ امریکہ کو یہ حق اس معاہدے کے سیکشن دوئم II میں واضح طور پر دے دیا گیا ہے۔ امریکی ماہرین اسی لیے منصوبہ بندی اور پالیسی سازی کے ہر عمل میں کلی طور پر شریک ہیں۔ اس مداخلت سے ایک بات تو یقینی طور پر واضح ہے کہ ترقی کے لیے بنائے جانے والی مضبوط (sound) پالیسی کی تشریح امریکی نقطہ نظر (interpretation) کے مطابق ہی ہوگی۔

امریکی اقتصادی امداد جو کہ سی آئی اے (CIA) کے توسط سے آتی ہے، وہ کئی قسم کے معاہدوں کے تحت صرف سالانہ بنیادوں پر ہی مہیا کی جاتی ہے۔ اس میں طویل المدتی منصوبہ بندی کا عنصر نہ ہونے کے باعث (جو کہ ایسے منصوبوں کے لیے اشد ضروری ہے) اکثر زیاں اور تاخیر کی باتیں سامنے آتی ہیں اور اسی بناء پر اس پر شدید تنقید بھی کی جاتی رہی ہے۔ لیکن اس کا ایک

فائدہ یہ ہے کہ وہ امریکہ کو اپنی مکمل مرضی تھوپنے سے باز رکھنے کا باعث بھی بنتی ہے۔اس صورت میں امریکہ کے پاس دو راستے ہوتے ہیں یا تو وہ اپنی امداد کو کلی طور پر روک لے یا پھر امداد وصول کرنے والے ملک کی کچھ مرضی کو بھی برداشت کرے چاہے وہ امریکی منشاء کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔قطع امداد کی دھمکی دے کر امداد وصول کرنے والے ملک پر یہ دباؤ ڈال سکتا ہے کہ اس ترقیاتی منصوبے کی تمام تفصیلات مکمل طور پر فراہم کی جائیں۔اپنی بات کی وضاحت کے لیے ہم یہاں صرف دو ایسے cases کیسز کی مثال پیش کریں گے جس سے کہ ہماری بات واضح ہو سکے۔ ۱۹۵۹ء میں امریکہ نے ملتان سے لائل پور (فیصل آباد) کے درمیان بچھائی جانے والی برقی لائنوں کے لیے اپنی مہیا کی گئی پیش کش واپس لینے کا اعلان کر دیا۔اس منصوبے پر لاگت کا تخمینہ ۵ء۳ ملین ڈالر لگایا گیا اور اس کی فراہمی کے لیے CIA اور پاکستان کے صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کے درمیان رضا مندی بھی طے ہوگئی اور اس معاہدے کے تحت پہلی قسط اسی برس فروری میں وصول ہونا تھی۔امریکہ نے اس معاہدے کو کلی طور پر مسترد (Veto) کر دیا اور اس کے پس پشت یہ وجہ کارفرما تھی کہ پاکستان نے چیکوسلاوکیہ کی حکومت سے ایک بار پھر مپیل لیف سیمنٹ فیکٹری کی توسیع کے لیے بات چیت کو آگے بڑھانے میں دلچسپی ظاہر کی تھی۔اسی دوران پی آئی ڈی سی (PIDC) اس پوزیشن میں آ گئی کہ اس منصوبے کو امریکی امداد کے بغیر ہی اپنا تعین ہی مکمل کر سکے۔لیکن کئی منصوبوں کے لیے درکار مالی امداد اور خاص طور پر وہ پروجیکٹ جو کہ زیر تکمیل ہوں،ان کے اچانک بند ہونے کے خدشات سے امداد حاصل کرنے والے ممالک کی پریشان کن صورتحال اور ان کی اس دلی خواہش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس حد تک اس امدادی عمل کو منقطع ہونے سے روکنے کے لیے تگ و دو کریں گے تاکہ ان فنڈز کو یقینی بنایا جا سکے،جن کی کہ ان منصوبوں کے لیے ابتداء میں یقین دہانی کرائی گئی تھی۔ایسی کٹوتی اگر ایسے تمام بڑے ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل میں رخنہ پیدا کرے تو اس کے لیے عملی اقدامات اٹھانے سے قبل ہی صرف دھمکی ہی ان امداد وصول کرنے والے ممالک کو راہ راست پر لانے کے لیے کافی ہوگی۔جس کے تحت انہیں ان منصوبوں کو امداد فراہم کرنے والے ملک کی منشاء کے مطابق چلنا پڑے گا۔امدادی منصوبوں پر یقین دہانی کرائی جانے والی امداد کے وسیع پیمانے پر روک دیئے جانے کے خدشات اور ہم منصبی فنڈز میں کسی قسم کی ہیر پھیر (manipulation) پورے ترقیاتی عمل کو با آسانی روک

سکتی ہے۔جس کے بڑے دوررس اقتصادی اور سیاسی اثرات ہو سکتے ہیں۔

اقتصادی پالیسی میں پوشیدہ ہاتھ:

پاکستان کے منصوبہ بندی کمیشن سے وابستہ ماہرین خصوصاً اس پوزیشن میں ہیں کہ وہ ہماری اقتصادی پالیسی پر اثرانداز ہوسکیں۔ پروفیسر بیل (Prof. Bell) کچھ عرصے تک پاکستان کے منصوبہ سازی کے بورڈ کے ملازم رہے۔امریکی سینٹ کی خارجہ امور کی کمیٹی میں اپنا بیان ریکارڈ کراتے ہوئے انہوں نے جو باتیں کیں وہ بڑی ہی دلچسپ ہیں۔اور وہ یہ بتاتے ہیں کہ حکومت پاکستان اور امریکی امداد کے مختلف عناصر (organs) کے درمیان کسی قسم کے تعلقات قائم ہیں۔ اس سے سوال کیا گیا کہ ''تمہارا ادارہ (یعنی پاکستان کا منصوبہ بندی کا بورڈ) اور FAO، FAS اور ICA (یعنی امریکی مشن) ایک دوسرے کے کتنے قریب ہیں؟'' پروفیسر بیل نے جواب دیا ''ICA مشن کے اہلکاروں کو ہم لوگ بخوبی ذاتی طور پر جانتے ہیں۔سرکاری سطح پر وہ پاکستان کے منصوبہ بندی بورڈ کے اہلکاروں سے باقاعدگی کی بنیادوں پر دو بنیادی نوعیت کے مقامات پر صلاح ومشورہ کرتے ہیں۔سب سے پہلے تو یہ کہ ہم ان کے لیے پاکستان کی اندرونی اقتصادی ترقی کے متعلق معلومات فراہم کرنے کا سب سے بہترین ذریعہ ہیں اور وہ کون سے مخصوص مسائل ہیں جن کا کہ ان کو سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔

دوسرا یہ کہ ابتدا میں بالکل نہیں لیکن کچھ عرصے بعد جب پاکستان کا منصوبہ بندی کا بورڈ کسی حدتک یہ اپنے خیالات بنالیتا ہے کہ کون سی چیز پر پاکستان میں عمل درآمد کیا جاسکتا ہے اور وہ کون سی چیزیں ہیں جن پر یہاں عملدرآمد کیا جانا ممکن نہیں رہتا۔ICA مشن کے لوگ بعدازاں اکٹھی کی گئی معلومات کا استعمال کرتے ہوئے انہیں یہ اطلاع اور رہنمائی فراہم کرتے ہیں کہ جس کی بنیاد پر یہ اپنے فیصلے کرتے ہیں کہ وہ کن منصوبوں پر اپنی رقم لگانا چاہتے ہیں اور کن پر نہیں۔اس سے میرا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ وہ آنکھیں بند کرکے منصوبہ بندی بورڈ کے خیالات پر عملدرآمد شروع کردیتے ہیں لیکن بہرحال یہ ان کو کافی اہمیت دیتے ہیں''۔

یہ بیان کسی لحاظ سے بڑا ہی چونکا دینے والا ہے۔اول تو یہ کہ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امریکہ کو کس حدتک پاکستان کے اہم معاملات کی بڑی گہری معلومات حاصل ہے اور

پاکستان کے اہم اداروں مثلاً منصوبہ بندی کمیشن کی تمام معلومات ان کی دسترس میں ہیں۔لیکن اس سے زیادہ revealing بات یہ ہے کہ کس طرح یہ بیان اتفاقی انداز (casual) میں یہ بتاتا ہے کہ اہم فیصلے منصوبہ بندی بورڈ امریکی امدادی مشن کی تجویز نہیں لیتا بلکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے (یعنی فیصلے امریکی ہی کرتا ہے)۔

اس بیان سے یہ بات بھی عیاں ہوجاتی ہے کہ کس طرح زاہد حسین جیسے مضبوط ہاتھ کے منصوبہ بندی بورڈ سے علیحدہ ہوجانے کے بعد اس کا ایک آزادانہ ادارے کے طور پر کام کرنے کا کردار مکمل طور پر ختم ہوگیا۔ امریکیوں کے امدادی مشن کے لیے ایسے لوگوں کا ان اداروں میں تعینات رہنا کوئی فائدہ مند (make sense) نہیں۔اب پاکستانی منصوبہ ساز کا کوئی اختیار نہیں کہ وہ اپنے ملک کے لیے خود منصوبہ بندی کریں اور بعد ازاں ICA یا پھر دیگر اداروں کو ان منصوبوں کے لیے سرمائے کی فراہمی کے لیے بات کریں۔ یہ صرف ICA کا کلی اختیار ہے کہ وہ منصوبے کی تمام ترجیحات کا تعین کرے۔ اور اس سارے مرحلے میں منصوبہ بندی بورڈ کی حیثیت ICA مشن کے ایک تابعدار (adjunct) سے زیادہ کی نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ مزید یہ کہ ایک بڑی رقم پروپیگنڈہ پر خرچ کی جاتی ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے ایک بڑا محکمہ پاکستان میں قائم کیا گیا ہے۔اس مقصد کے لیے سستی شہرت کا خوب مواد مہیا کیا گیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اس مواد کو مقامی زبانوں میں ترجمہ بھی کیا گیا ہے اور بڑی ہی ارزاں قیمتوں پر کتب اور پمفلٹ بھی مہیا کیے جاتے ہیں۔جس کی ایک واضح مثال Rostow کی The Prospects of Cimmunist China ہے جو کہ صرف ۱۰ سینٹ میں فروخت کے لیے پیش کی گئی۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اس پروپیگنڈہ کے لیے رقم کا انتظام بھی ہم منصبی فنڈز کی رقم سے کیا جاتا ہے اور یہ فنڈ PL۴۸۰ اور باہمی سیکیورٹی ایکٹ (Mutual Security Act) کے تحت اجناس کی فروخت سے ہونے والی امداد سے قائم کیا گیا تھا۔اس مقصد (پروپیگنڈہ) کے لیے صرف PL۴۸۰ میں اکیلے ہی ۸ء۸ ملین ڈالر کے مساوی کی اجناس فروخت کے لیے فراہم کی گئیں۔اس فراہم کی جانے والی امداد کی شرائط میں یہ بات درج کی گئی ہے کہ پاکستان پر یہ لازم ہوگا کہ وہ اپنے عوام کو امریکہ کی طرف سے فراہم کی جانے والی امداد کی تفصیلات سے آگاہ رکھیں، اور اس امداد کے اغراض و مقاصد کے متعلق بھی آگاہی دی

جائے۔قدرتی طور پر یہ بات ذہن میں رکھی جانی چاہیے کہ اس پر عمل درآمد (operation) کے متعلق مکمل تفصیلات نہیں بتائی جائیں گی کیونکہ یہ عمل دونوں حکومتوں کے لیے شاید ہی کسی حد تک نیک نامی کا باعث بن سکے۔ بالآخر اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان کی رقم اس امداد اور مدد فراہم کرنے والے (donor) کی تشہیر پر خرچ کی جارہی ہے۔

تعلیمی تبادلے (exchange) اور اس سے ملحقہ (allied) پروگرام بھی مدد کا باعث ہیں۔ان پروگراموں کی ضرورت (rationale) کا خلاصہ بریگیڈیئر جنرل سنگلر (Shingler) اور امریکی صدر کی کمیٹی برائے مطالعات فوجی امداد کے اہلکاروں کی طرف سے ایک عمدہ رپورٹ سے لگایا جاسکتا ہے۔رپورٹ کہتی ہے ''پرزہ جات گھس کر ختم ہوجاتے ہیں یا پھر بوسیدہ ہوجاتے ہیں''۔رپورٹ مزید کہتی ہے ''لیکن لوگ اور ان کو فراہم کی جانے والی تربیت اور ان کی صلاحیتوں اور جس طرح وہ سوچتے ہیں وہ ختم نہیں ہوتی''۔اس لیے ضروری ہے کہ بڑی تعداد میں وظیفے دیئے جائیں اور اساتذہ کی ٹریننگ (exchange) کے پروگرام شروع کیے جائیں۔اسی مقصد کے تحت ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۹ء کے عرصے کے دوران ایک لاکھ سے زائد غیر ملکیوں نے امریکہ میں تربیت حاصل کی جو کہ فوجی امداد کے پروگرام کے تحت فراہم کی گئی جبکہ ۴۶۰۰۰ کو ICA اور اس کے پیش روؤں کے تحت جبکہ دیگر ۴۲۰۰۰ کو بین الاقوامی تعلیمی ایکسچینج پروگرام کے تحت۔ان پروگراموں کے تحت فوجی اور سویلین افراد کو صرف ان کے متعلقہ میدانوں میں یعنی فوجی ہنرمندی (skill) اور سویلین اقدار (values) کی تربیت سے بہت زیادہ فراہم کیا گیا۔رپورٹ بتاتی ہے کہ ان میں سے اکثریت کو امریکہ کی قومی پالیسی کے اغراض و مقاصد کے متعلق آگاہی (oreintation) دی گئی ہے اور وہ اس سے بخوبی آگاہ ہوچکے ہیں''۔ایسی کاوشوں (activities) کے امداد وصول کرنے والے ممالک کے پالیسی سازوں کے ذہنوں پر پڑنے والے اثرات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔خاص طور پر پاکستان جیسے ممالک جہاں پریس کو آزادی سے اپنا کام سرانجام دینے کی اجازت نہیں۔

یہ تمام اقدامات درحقیقت کنٹرول اور دباؤ کا ایک ایسا انتظام ترتیب دینے کے لیے ہے جس کے تحت امداد حاصل کرنے والے یہ تمام ممالک دباؤ میں آکر امریکی پالیسیوں کے تابع ہوجائیں گے۔جو پیسہ دے وہی ناچ نچوائے۔(He who pays the piper calls the tune.)

امدادی اور ترقیاتی پالیسی:

اس پالیسی میں جو کہ انڈیا نے دوسرے پنج سالہ منصوبے کے لیے اپنائی ہے جس کی بنیاد ملک میں موثر صنعتی عمل کا متعارف کرایا جانا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو کہ پاکستان نے نام نہاد امریکی ماہرین کی دی گئی تجاویز کی بنیاد پر مرتب کی ہے۔ پاکستان کی یہ پالیسی صنعت مخالف ہے اور یہ ایک ایسا دباؤ بنائے رکھنے کے تحت ترتیب دی گئی ہے جس کے تحت پاکستان کو مستقل بنیادوں پر امریکہ کا دست نگر بنے رہنے پر مجبور کیا جائے۔

امریکہ میں دنیا کی کل آبادی کا ۱۰ فیصد رہتا ہے جبکہ وہ پوری دنیا کے خام مال کا ۵۰ فیصد سے کچھ زیادہ ہی حصہ خرچ کرتا ہے۔ یہ وہ نتیجہ ہے جس پر صدر ٹورمین کا مقرر کردہ Paley Comission on Resources for Freedom ۱۹۵۱ء میں پہنچا۔ پیلے کمیشن وہ وجوہات (basis) فراہم کرتا ہے جس پر کہ امریکہ کی خارجہ اقتصادی پالیسی کی بنیاد تھی۔ پیلے کمیشن نے یہ تخمینہ لگایا کہ ۱۹۷۵ء تک امریکہ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ۳۵ فیصد خام لوہا (iron ore) اور اپنی ضروریات کے لیے ۴۰ تا ۲۵ فیصد تک کاپر (copper) درآمد کرے گا۔ جبکہ دیگر اسی طرح کی اجناس کی ضروریات مزید بڑھ جائیں گی۔ اس لیے کمیشن اس بات پر زور دیتا ہے کہ امریکہ کو مزید ایسے اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے جس کے تحت اس کو اپنی ضروریات پورا کرنے کے لیے مزید خام مال آسانی دستیاب ہو سکے۔ یہی ضروریات امریکہ کی خارجہ پالیسی کا سب سے بڑا محور بنا ہوا ہے۔ ایک اور کمیٹی برائے اقتصادی ترقی (Committee for Economic Development) کی ایک تیار کردہ رپورٹ بعنوان 'بیرون ملک اقتصادی ترقی اور امریکہ کی بیرونی سرمایہ کاری کا کردار' کہتی ہے کہ وہ امریکی کارپوریشن جنہوں نے بیرون ممالک سرمایہ کاری کر رکھی ہیں ان کے سامنے دو مخصوص مقاصد ہیں۔ اول خام مال کے حصول کے لیے نئے ماخذ (source) تلاش کرنا (مثلاً تیل، دھات (copper)، خام لوہا iron ore وغیرہ) جن کو کہ امریکہ درآمد کیا جا سکے، جبکہ دوئم یہ کہ بیرونی ممالک میں وہ جگہیں تلاش کرنا جہاں کہ تیار مال کو جوڑنے اور ان کو پیکنگ کرنے کے کارخانے قائم کرنا تا کہ بیرون ممالک کی منڈیوں میں فائدہ (advantage) پہنچایا جا سکے۔ ان

دونوں مقاصد میں سے کوئی بھی مقصد صنعت کاری کے عمل کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔

پاکستان میں بڑی آہستگی سے صنعتی عمل سے دور ہونے کی پالیسی اپنائی جارہی ہے۔ پہلے پنج سالہ منصوبے میں یہ بہانہ بناتے ہوئے صنعتی عمل میں سرمایہ کاری کے لیے وسائل کم مختص کیے گئے کہ قبل ازیں اب تک ہونے والی ترقی کو مجتمع (Consolidate) کیا جائے۔ مزید سرمایہ کاری اس کے بعد کی جائے۔ جبکہ دوسرے پنج سالہ منصوبہ نے صنعت دشمن پالیسیوں کو مزید مضبوط و مستحکم کیا۔ صنعتی عمل کے فروغ کے لیے پہلے سے مہیا وسائل کو اور مزید کم کر دیا گیا۔ اس صورتحال کے پس پشت مقامی جاگیرداروں کے مفادات اور ساتھ ہی ساتھ چند بڑے کاروباری افراد کے monopoly کے مفادات شامل ہیں۔ لیکن اس میں سب سے مرکزی اور بنیادی کردار اور اثر ورسوخ ان امریکی ماہرین کا ہے جو کہ ICA مشن کے تحت بیٹھ کر پاکستان کے منصوبہ بندی کمیشن کو ہدایات جاری کررہے ہیں۔ غلام فاروق جو کہ ایک وقت میں پاکستانی کی صنعتی ترقیاتی کارپوریشن (PIDC) کے سربراہ رہے وہ یہ بات خود کہتے ہیں کہ ہمارے بیرونی ماہرین ہمیں جوٹ کی صنعتی ترقی کے خلاف دلائل دیتے رہے۔ لیکن جب تک ہم نے امریکہ سے امداد وصول کرتے ہوئے اپنا پورا ملک امریکہ کے زیر کنٹرول نہ لے آئے، اس وقت صنعت نے ترقی کی، اور بڑی اچھی ترقی کی۔

اس بات کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے کہ مرکزی نکتہ یعنی متوازن اقتصادیات کی ترقی، اس وقت تباہی کا شکار ہو جاتی ہے۔ جب بیرون منصوبہ بندوں کے دباؤ میں آ کر ان میں تبدیلیاں لائی جائیں۔ پاکستان میں زرعی اور صنعتی ترقی کے لیے وسائل کے مختص کیے جانے کا عمل آزادانہ اور مکمل طور پر پاکستانیوں کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ اب اس کا فیصلہ امداد دینے والے donors کی خواہشات پر ہوتا ہے۔

ان اغراض و مقاصد کے ساتھ ساتھ امداد وصول کرنے والے ممالک پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ یا تو امریکی سرمائے کے کچھ privileges بھی فراہم کریں۔ امریکی حکومت کے لیے یہ بات اس تناظر میں بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ امریکی کارپوریشنوں کو ان ممالک میں نئے پلانٹ لگانے اور سہولیات قائم کرنی چاہیے جہاں کہ وہاں کے مینوفیکچرا پنی صنعتیں قائم کر چکے ہیں اور امریکہ کی براہ راست برآمدات میں نسبتاً کمی آئی ہے۔ یہاں زیادہ سرمایہ کاری جوڑنے (assembly) اور پیکنگ پلانٹ قائم کرنے پر ہے جو کہ درآمدات پر کسی پابندی کو جھٹلانے (evade) اور امریکی

درآمداتی مینوفیکچر کے لیے 'خام مال' کے لیے فروخت کے مراکز (outlets) قائم کرنے کے خواہش مند ہیں۔ تمام بڑی (gaint) بیرونی کارپوریشنوں کی زیادہ تر سرمایہ کاری ان میدانوں میں ہے جہاں منافع کی شرح نسبتاً زیادہ ہے۔ اور وہاں سے پاکستانی enterprise کو نکال باہر کر دیا گیا ہے۔ اس طرح ہماری اپنی ترقی کو ہمارے ہی ہاتھوں سے روک دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود اگر اس بڑی کارپوریشنوں کے مقابلے میں مقامی enterprise مقابلے سے باز نہیں آتے تو یہ بیرون کمپنیاں اپنی امداد دینے والی حکومتوں سے پاکستانی حکومت پر دباؤ ڈالواتی ہیں کہ بیرون کمپنیوں کو پاکستان میں مزید اضافی مراعات دی جائیں تاکہ انہیں کاروبار کرنے میں اضافی سہولیات پہلے سے ہی حاصل ہو جائیں۔ اختلافی نصاب نظریے اور بیرونی سرمایہ کاری نے پاکستان کی ترقی کے لیے تیز رفتاری پیدا کرنے کے بجائے ان پالیسیوں کے ہمارے کاروباری enterprise کو زیادہ منافع بخش سرمایہ کاری کے میدانوں سے جدا کر کے اس کو لاغر (paralise) کر دیا گیا ہے۔

لیکن بیرونی سرمایہ کاری صرف اسی صورت میں جائز (justify) قرار دی جا سکتی ہے اگر وہ ہماری ترقی کو مزید تیز اور مدد فراہم کرے۔ لیکن اگر ہم موجودہ صورتحال دیکھیں تو یہ صرف ہمارے پیداور کے ممکنہ ذرائع کو خشک (Drain) کر کے تمام منافع جات کو باہر منتقل کر رہے ہیں۔ اقتصادی ترقی کے عمل میں منافع سرمایہ اکٹھا کرنے کا سب سے بڑا ماخذ (source) ہوتا ہے۔ اگر اس ڈگر پر چلتے ہوئے ہمارے ملک میں تمام سرمایہ کاری بیرونی enterprise نے کرنی ہے اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے تمام منافع کے باہر اپنے ملک میں منتقل کر لینا ہے تو سوچ لیجیے ہماری نمو کے امکانات کم ہو کر صفر تک پہنچ جائیں گے، اور درحقیقت ان منافعوں کی بڑی ہی قلیل رقم واپس پاکستان میں رہ جاتی ہے۔ مزید یہ کہ بہت سے cases میں بیرونی سرمایہ کا سرمایہ بھی مقامی قرضوں سے ہی حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ان بیرونی کمپنیوں کا کمایا ہوا یہ سرمایہ پاکستانی وسائل کو استعمال کرنے کے نتیجے میں حاصل ہوا ہے جس کو کمانے کے بعد وہ اسے باہر منتقل کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بیرونی امداد کا ایک کثیر حصہ ان امریکی کمپنیوں کو قرض فراہم کرنے کے لیے مختص ہوتا ہے جو کہ پاکستان میں کاروبار کرتی ہیں اور یا پھر ان پاکستانی فرموں کے لیے بھی جو کہ ان امریکی کمپنیوں کے تیار کردہ مال کو پاکستان کے اندر مارکیٹ کرنے کے کام پر مامور ہوتی ہیں۔ صرف ایک ماخذ یعنی PL۴۸۰ کے

ہم منصبی فنڈز سے امریکہ نے جون ۱۹۵۹ء تک ۲۸ء۷ ملین ڈالر تک کی مساوی رقم پاکستانی روپوں میں فراہم کی۔ پاکستان کو فراہم کی جانے والی امریکی امداد کے متعلق ہمارے اس تجزیے کو کہیں بیرونی امداد کے تصور کے خلاف نہ سمجھ لیا جائے۔ پاکستان جیسے ممالک جو کہ گذشتہ دو صدیوں سے جمود اور اقتصادی انتشار (disintegration) کا شکار رہے اور اب انتہائی غربت زدہ جیسے دشمن سے نبرد آزما ہیں۔ یہ ممالک یقیناً غیر ملکی سرمائے کو خوش آمدید کہیں گے اور کسی بھی قسم کی مدد (assistance) فراہم کرنے پر ان ممالک کے شکر گزار رہوں گے۔ لیکن مختصراً مسئلہ یہ ہے کہ ہم امریکہ سے اس قسم کی امداد حاصل نہیں کر رہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہم منافقت اور لالچ (cynicism) کے رویے کو جو کہ اس وقت اس امداد کے عمل کو چلانے (administered) میں اپنایا جا رہا ہے اس کو بے نقاب کر کے ہم اپنے پاکستانیوں اور امریکہ میں موجود اپنے دوستوں کی بھی مدد کریں گے تا کہ وہ ہمارے لیے انصاف پر مبنی نظام نافذ کرنے میں مدد دیں تا کہ تعلقات کو مزید دیرپا بنیادوں پر استوار کیا جا سکے۔ اس سمت میں ہمیں پہلا قدم ان اقدامات کے خاتمے کے ساتھ اٹھانا ہوگا جو کہ اس وقت اس تعلقات سے منسلک ہے اور ہمیں اپنی قومی آزادی کو دوبارہ بحال کروانا ہوگا۔ صرف ایک آزاد (free) اور جمہوری پاکستان کے ذریعے ہی بیرونی امداد کے ارفع (egalitarian) مقاصد اور ہماری قومی ترقی کے اہداف کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

A brief bibliography

Lieuwen, Edwin. Arms and politics in Latin America. New York, 1960. (A pioneering study of the social and political role of the armed forces.)

Munkman, C.A. American aid to Greece. London, 1958. (A first-rate, first-hand account by a member of the U.S. Mission staff.)

President's Materials Policy (Paley) Commission. Resources for Freedom. Washington, 1952. (The original basis of U.S. foreign aid policy. See especially volume 1, chapter 11.)

U.S. Senate. Special Committee to Study the Foreign Aid Program, 1956-57. Report and hearings of the Special Committee. Washington, 1951. (See also the large number of studies commissioned by the special committee.)

Wolf, C. Foreign aid: theory and practice in South Asia. Princeton, 1960. (A very useful survey overlaid with bad theory.)

حوالہ جات

1. "Technical assistance." Final report of the Committee on Foreign Relations, March 12, 1957.
2. This is not the place to examine fully all the complex political developments (in which foreign intrigue played its part) leading to the downfall of the Nazimuddin government. To achieve such ends political pressures are built up at many levels. Among these were the anti-Ahmadiya riots organized to secure the removal of pro-British Foreign Minister Zafarullah Khan. But the food crisis and the possibility of securing American help were the overwhelming and immediate issues over which the government fell. Writers on Pakistan's political developments have tended to underestimate the significance of this.

تاریخ کے بنیادی ماخذ

شاہ عالم ثانی کے عہد کا دہلی دربار

مصنّفین: انتھنی پولیر، لوئی لوراں دولیسی

ترجمہ: نصیب اختر

مارچ 1967ء کو کراچی سے شائع ہوئی!

پیش لفظ

مغلیہ خاندان کے سوا تین سو سالہ دور حکومت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جنگ پانی پت (1526ء) سے عالمگیر کی وفات (1707ء) تک چھ عظیم المرتبت حکمراں یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے دوسرے دور میں دس بادشاہ ہوئے، یہ سب کے سب کمزور، آرام طلب اور کاہل تھے ان کی پست کرداری کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اقتدار شہنشاہ کے ہاتھ سے نکل کر وزراء اور امراء کے ہاتھ میں آ گیا یہ لوگ بہت جلد گروہوں میں تقسیم ہو گئے اور باہمی رقابتوں اور حصولِ اقتدار کے لئے کشمکش کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا خودغرض اور ناعاقبت اندیش امراء نے ذاتی مفاد کی خاطر بیرونی امداد حاصل کرنا شروع کر دی چنانچہ ان باجگذار والیان ریاست اور سرداروں کو جو ایک زمانہ میں شاہی دربار تک رسائی بھی حاصل نہ کر سکتے تھے اب یہ موقع مل گیا کہ شہنشاہ اور اُس کے دربار میں اپنا اثر قائم کر لیں رفتہ رفتہ یہ اثر بھی بڑھتا گیا اور ساتھ ہی یہ لوگ شاہی علاقوں پر بھی قبضہ جماتے گئے شاہ عالم ثانی کا طویل دورِ حکومت اس لحاظ سے اہم ہے کہ اسی زمانہ میں برطانوی اقتدار کی جڑیں مضبوط ہوئیں اور اس کے آخر عہد میں خود دہلی پر بھی کمپنی کا تسلط قائم ہو گیا۔ اس سے پہلے شاہ عالم نے اپنی حکومت کی لگام مرہٹہ سردار سندھیا کے ہاتھ میں دے رکھی تھی۔

سیاسی انحطاط اور طوائف الملوکی کے اس دور میں بہت سے قسمت آزما بھی یہاں آ گئے تھے یہ لوگ مختلف ریاستوں میں اپنے فوجی دستوں کے ساتھ ملازم ہو جاتے تھے ___ ان میں سے بعض نے تاریخی اہمیت حاصل کر لی ہے اس دور کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ کمپنی کے بعض ملازمین نے چشم دید حالات لکھے ہیں جو اکثر ہمارے مطالعہ کے سلسلہ میں مفید ماخذ ثابت ہوئے ہیں۔ انتونی لوئی پولیر کے بیان کو اسی سلسلہ کی کڑی کہا جا سکتا ہے اس سے 1771ء سے

1779ء تک کے واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔

مسٹر پی۔سی۔گپتا نے ایڈٹ کر کے ایک مناسب ابتدائیہ کے ساتھ اس کو کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے اب نصیب اختر صاحب نے اُردو کا لباس پہنا کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے اور اس کے ساتھ لوئی لوران دولیسی کے سفرنامہ (1774ء-1776ء) کے وہ اجزاء بھی اردو میں منتقل کر کے شامل کر دیئے ہیں جن کو جادوناتھ سرکار نے جولائی 1937ء کے ''اسلامک کلچر'' میں پیش کئے تھے اگرچہ مئورّخوں نے سیّاحوں اور تماشائیوں کے بیانات کو تسلیم کرتے وقت ہمیشہ احتیاط سے کام لیا ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اکثر دلچسپ اور مفید ثابت ہوئے ہیں۔کتاب زیرِنظر بھی اسی حیثیت سے اہم اور کارآمد ہے۔

ترجمہ نہایت صاف اور شگفتہ ہے اگر یہ نہ بتایا جائے کہ یہ ترجمہ ہے تو مشکل ہی سے قاری کو اس کا شک ہوگا۔اس کامیاب کوشش پر مترجم مبارکباد کے مستحق ہیں۔

سیّد معین الحق

8-مارچ 1967ء

حرفے چند

پولیر کی ''دہلی دربار کی روداد'' (1771ء تا 1779ء) اور دولیسی کا سفرنامہ ''بنگال تا دہلی'' (1774ء تا 1776ء) اٹھارہویں صدی کے ہندو پاکستان کی تاریخ اور خصوصاً شاہ عالم ثانی کے دور کی دو اہم کڑیاں ہیں۔ نوسالہ روداد کے راوی پولیر کے متعلق گپتا نے کتاب ہذا کے دیباچہ میں سب کچھ لکھ دیا ہے۔ دولیسی کا تعارف بھی جولائی 1937ء کے ''اسلامک کلچر'' میں جادوناتھ سرکار نے تفصیل سے کرا دیا ہے۔ مگر اس ترجمہ کے ساتھ اس کے تعارف کی تجدید کچھ ضروری ہوگئی ہے اس لئے مجملاً درج ذیل ہے۔

لوئی، لوراں، دولیسی، کامتَ دَ ماداؤ ایک تعلیم یافتہ اور مہذب فرانسیسی امیر پہلی بار فرانس کی ایک فوج کے ہمراہ ہندو پاکستان آیا تھا۔ بار دگر ایک مفرور مقروض کی حیثیت سے وارد ہوا۔ یہاں بھی 6- ستمبر 1774ء کو قرض خواہوں کی نگاہوں سے بچ کر چندرنگر سے فرار ہوا، اور فیض آباد پہنچا تا کہ شجاع الدولہ کے دربار سے قسمت وابستہ کر کے بہتری کی کوئی تدبیر نکالے مگر تقدیر نے اس قسمت آزما کا یہاں بھی ساتھ نہ دیا۔ 25- جنوری 1775ء کو شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا اور اس کے جانشین آصف الدولہ کو کلکتہ کی انگریزی کونسل نے مجبور کیا کہ وہ فرانسیسی فوجی افسروں کو ملازمت سے علیحدہ کر دے۔

مایوس ہو کر وہ چند بدنصیب ہم وطنوں کے ساتھ آگرہ ہوتا ہوا 17- اپریل کو دہلی پہنچا پانچ روز کے بعد شاہ عالم ثانی کے دربار میں رسائی ہوئی لیکن سلطنتِ دہلی کے دیوالیہ ہو جانے اور امراء کی باہمی رقابتوں کی وجہ سے فرانسیسی فوجی دستہ قائم کرنے کا منصوبہ ناکام رہا۔ اس کے ہم وطن مدک نے جس کے پاس ایک فرانسیسی دستہ پہلے سے موجود تھا اور امراء کی باہمی جنگوں میں کرایہ پر چلتا تھا۔ اپنے یہاں ملازمت دینے کا وعدہ کیا مگر 29- جولائی 1775ء کو اس کے دستہ

نے روہیلوں کے ہاتھوں بُری طرح شکست کھائی اور یہ وعدہ بھی وفا نہ ہو سکا۔ غرضکہ شمالی ہند کی فضاء جب راس نہ آئی تو اسے اس علاقہ کو جولائی 1776ء میں ناامیدانہ خیر باد کہنا پڑا۔ اس کی آخری امید گاہ صوبیدار دکن میر نظام علی کا دربار تھا۔ مگر ہم اسے یکم مئی 1777ء تک حیدر آباد میں اور اس کے بعد 28- جون 1777ء کو سانگلی کے مقام پر بڑی بیچارگی اور کس مپرسی کے عالم میں زندگی کے دن کاٹتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ آخر کار اس نے دکن ہی کی سرزمین پر 24- دسمبر 1777ء کو 'قیدِ حیات و بندِ غم' دونوں سے نجات پائی اور مسولی پٹم میں اس کی آخری آرام گاہ بنی۔

اس کے سفرنامہ کا ایک نسخہ پیرس کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ شاہ عالم ثانی اور سلطنت دہلی سے متعلق اہم حالات و واقعات کا انگریزی ترجمہ جادوناتھ سرکار نے کیا تھا اسی کا اردو ترجمہ پولیر کی تحریر کردہ روداد سے منسلک کر دیا ہے۔

آخر میں مشفق و مکرم ڈاکٹر سیّد معین الحق صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے گوناگوں مصروفیات کے باوجود پیش لفظ تحریر فرمایا۔ نیز مولوی ثناء الحق صدیقی، محمد ایوب قادری اور مفتی انتظام الدین شہابی کا شکر گذار ہوں کہ بہر طور اور بہر گام میری ہمت افزائی کی۔

ابتدائیہ

سلطنت دہلی اور دہلی دربار پر ''رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال'' کے کتب خانہ میں ایک مسودہ زبان انگریزی موجود ہے جس پر بطور عنوان ''دہلی دربار'' کی روئیداد تحریر ہے۔ یہ شاہ عالم ثانی، کی نو (9) سالہ زندگی کا یعنی 1771ء میں الہ آباد چھوڑنے سے 1779ء میں اس کے نائب وزیر عبدالاحد خاں کی سکھوں کے خلاف فوج کشی کے وقت تک کا مرقع ہے، جس جلد میں یہ مسودہ ہے اس میں مختلف قسم کے اور مسودے بھی ہیں اس پر نمبر 4387 درج ہے اس نمبر سے کیا مراد ہے اس کے متعلق اس وقت کچھ کہنا تقریباً ناممکن ہے۔

بظاہر یہ نقل معلوم ہوتی ہے لیکن دوسرے مسودوں پر پڑی ہوئی تاریخوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا مسودہ بہت پرانا نہیں ہے۔ قریب ترین دور کا جو مسودہ اس میں شامل ہے اس پر 1791ء لکھا ہوا ہے۔ شاہ عالم ثانی کے دربار کے متعلق یہ مسودہ کب تحریر کیا گیا اس کا تعین کوئی دشوار کام نہیں ہے۔

''دہلی، 15-اگست 1779ء'' جو اس مسودہ کے سرِورق پر تحریر ہے اس امر کی واضح شہادت ہے کہ یہ کب مکمل ہوا، مزید داخلی شہادت یہ ہے کہ جو واقعہ اس میں درج ہے وہ عبدالاحد خاں کی وہ مہم ہے جو سکھوں کے خلاف تھی اور جولائی 1779ء میں شروع ہوئی تھی۔ مسودہ پر مصنف کا نام نہیں ہے تاہم بعض اشارات اس کی نشاندہی کرتے ہیں۔ نفس مضمون کے اعتبار سے یہ کوئی محکمہ جاتی روئیداد معلوم نہیں ہوتی بلکہ مصنف اپنی رائے اور اظہارِ خیال میں قطعی آزاد نظر آتا ہے یہ بھی واضح ہے کہ یہ کسی ایسے شخص کا نوشتہ ہے جو تمام افراد و امور سے ذاتی طور پر واقفیت رکھتا تھا اور اس کا بھی امکان ہے کہ وہ بذاتِ خود اس داستان میں ایک کردار کی حیثیت رکھتا تھا۔

جب یہ مسودہ پہلی مرتبہ میری نظر سے گذرا تو مجھے اس میں غیر معمولی طور پر دلچسپی محسوس ہوئی۔ میں نے جادو ناتھ سرکار کو دکھایا اور اس کی ایک نقل حکومت ہند کے قدیم تاریخی دستاویزات کے محافظ خانہ کے ڈائریکٹر، ایس، این، سین، کو ارسال کر دی۔ سر جادو ناتھ سرکار نے ایشیاٹک سوسائٹی کو جواباً تحریر کیا کہ یہ مسودہ انتونی، لوئی، پولیر کا ہے۔ جو ایک سوئز انجینئر اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم تھا۔ مسودہ کے متعلق ان کی رائے یہ تھی، ''واقعات نہایت صحت سے بیان کئے گئے ہیں اور دربار کی سیاست کو جس شرح وبسط سے اس میں بیان کیا گیا ہے کسی فارسی اور مرہٹی نسخے میں جو میری نظر سے ___ گذرا ہے، شاید ہی مل سکے۔'' ڈاکٹر سین نے مجھے مطلع کیا کہ یہ محکمہ جاتی مسودہ نہیں ہے کیونکہ اس کی اصل امپیریل ریکارڈ ڈاکومنٹ میں موجود نہیں ہے اور جو ریکارڈ ان کے پاس ہے اس سے بھی اس کے مصنف پر کوئی روشنی نہیں پڑتی ___ لیکن انہوں نے ''دکن'' مئولفہ اسکاٹ کی پانچویں جلد کی طرف توجہ دلائی۔ یہ 1794ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی، اس پانچویں جلد کے مقدمہ میں مئولف لکھتا ہے ___ کہ موجودہ بادشاہ شاہ عالم کے 1771ء سے 1779ء تک کے حالات کے لئے میں اپنے دوست لیفٹیننٹ کرنل پولیر کا ممنون ہوں جنہوں نے دہلی دربار میں اپنے طویل زمانہ قیام اور تعلقات کی وجہ سے عام اور نجی معلومات پر مشتمل اہم مواد فراہم کیا۔

اسکاٹ کے اس باب کا جو اس نے شاہ عالم ثانی پر لکھا ہے ایشیاٹک سوسائٹی کے مسودہ سے موازنہ کرنے پر دونوں میں زبان و بیان کی غیر معمولی یکسانیت پائی جاتی ہے، بہت سے فقرے دونوں جگہ یکساں ہیں، اکثر فقروں کا اسکاٹ نے خلاصہ بیان کر دیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایشیاٹک سوسائٹی کا مسودہ پولیر کا فراہم کردہ وہ مواد تھا جس کو سامنے رکھ کر اسکاٹ نے شاہ عالم ثانی پر اپنی کتاب کے ایک باب کی تکمیل کی۔

تاریخ ہند کے طالب علم پولیر کے نام سے زیادہ واقف نہیں، لیکن اس کی بعض تحریریں کافی مشہور ہیں اس کے خطوط ایشیاٹک اینول رجسٹر (1800ء) میں چھپ چکے ہیں۔ اس کے بعد بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ (بنگال ___ سابق اور موجودہ) میں دوسری بار شائع ہوئے۔ انڈیا آفس لائبریری میں اورم کے فراہم کردہ مجموعہ میں اس کے

چند مسودات بھی شامل ہیں۔

ہل نے اورم کے فراہم کردہ مجموعہ کی جو فہرست تیار کی ہے (جلد دوم حصہ اول، ص39-138) اس میں جن مسودات کا ذکر ہے وہ درج ذیل ہیں۔

1- ایک مشہور قسمت آزما سومبر یا سومرو کے حالات۔

2- بادشاہ، شاہ عالم کی موجودہ صورتِ حال اور دہلی کے قرب و جوار میں اس کے مقبوضات کی کیفیت۔

3- صوبہ اودھ کے حالات۔ یکم اپریل تا آخر جون 1776ء۔

4- عزت مآب ایسٹ انڈیا کمپنی اور مرہٹہ اسٹیٹ پورندر کے مابین ایک معاہدہ۔

ہل کا خیال ہے کہ یہ پولیر کے تحریر کردہ ہیں متذکرہ پہلے دو ان خطوط کے اقتباسات سے جو پولیر نے بتاریخ 2- مئی 1776ء آئرن سائڈ کو بھیجے۔ (مطبوعہ ایشیاٹک اینول رجسٹر 1800ء)

کافی مماثلت رکھتے ہیں ہل نے ایک مسودہ (19، 10) کی نقل کا بھی حوالہ دیا ہے جس پر وہی نام اور تاریخ پڑی ہوئی ہے اور جو غالباً کرنل پولیر کا ہے۔ اور یہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا کلکتہ میں موجود ہے۔ دونوں کا موازنہ کیا گیا اور دونوں میں اس کے علاوہ کوئی فرق نہیں جو کاتب کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے____ کوئی نہیں جانتا کہ اصل نسخہ موجود ہے یا نہیں۔ ایک تعجب خیز بات یہ ہے کہ ''دہلی کی روئیداد'' میں جو بڑی تفصیل سے لکھی گئی ہے نجف خاں کے آگرہ کے محاصرہ اور قبضہ کا ذکر برائے نام ہے۔ دراصل یہی اس کی زندگی کا وہ موڑ تھا جس کی وجہ سے اسے اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ متعدد موقعوں پر اس نے گورنر جنرل کے سامنے اپنے اس اقدام کی صفائی پیش کی اور آگرہ کے محاصرہ میں اس نے جو کردار ادا کیا تھا اس کی وضاحت کی مگر یہاں سرسری طور پر یہ جملہ لکھ کر کہ_____ ''اس دوران میں آگرہ نجف خاں کے قبضہ میں چلا گیا۔'' دست کش کیوں ہو گیا؟ غالباً اس کی وجوہ وہی سمجھ سکتا ہے یا جیسا کہ اس نے زیرِ نظر مسودہ میں کئی بار ''نجف خاں کے بیان'' کا حوالہ دیا ہے۔ اس میں اس کا تذکرہ ہو۔ آئرن سائڈ کو ارسال کردہ خطوط کے اقتباسات ایشیاٹک اینول رجسٹر 1800ء میں شائع ہوئے ہیں جس کا ایک

حصہ نجف خاں کے متعلق ہے لیکن یہ بھی واضح نہیں کہ اس کی مراد اس حصہ سے ہے کیونکہ پولیر نے کسی خط کی طرف اشارہ نہیں کیا بلکہ اس کی مراد ایک علیحدہ مسودہ سے ہے۔ خط میں آگرہ کے محاصرہ کا کوئی ذکر بھی نہیں ہے۔ بہرحال یہ ایک اقتباس ہے۔ نہیں کہا جاسکتا کہ کون سے حصے محذوف کر دیئے گئے ہیں۔

پراتل۔سی۔گپتا
ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی
لندن

پولیر کے حالاتِ زندگی

انتھنی لوئی پولیر ایک فرانسیسی پروٹسٹنٹ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ جو سوئزرلینڈ میں متوطن ہو گیا تھا۔ 1757ء میں لندن میں اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کر لی اور دوسرے سال ہندوستان بھیج دیا گیا۔1 اس کا چچا پال فلپ پولیر بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں تھا اور فورٹ سینٹ جارج کا کمانڈر اینٹ مقرر ہو گیا تھا۔ 1758ء کے آخر میں سوئز فوج کے ایک حصہ کی کمان اس کے سپرد ہوئی اور مدراس کے قریب فرانسیسیوں کے خلاف ایک حملہ میں مارا گیا۔2 پولیر نے مسولی پٹم میں فورڈ کے ماتحت اور بہار3 میں کارنک کی سرکردگی میں خدمات انجام دیں۔ 1761ء کے اواخر میں اس کا تبادلہ بنگال کر دیا گیا۔

مئی 1757ء میں کلکتہ میں ایک قلعہ کی تعمیر کا انتظام کیا گیا۔ کیپٹن جون بروہیر نے جو مدراس میں چیف انجینئر تھا نقشہ تیار کیا اور کام شروع ہوا لیکن کام کی رفتار بہت سست اور طریقہء کار میں کافی بے قاعدگیاں تھیں۔ 1760ء میں اس پر غبن کا الزام لگایا گیا اور تحقیقات کے دوران اسے اس کے مکان ہی میں نظر بند کر دیا گیا۔ لیکن وہ فرار ہو کر سیلون پہنچ گیا جو ان دنوں ڈچ آبادی تھی۔ شاید وہیں سکونت اختیار کر لی۔4 اس کی جگہ تھامس ایمفلٹ کو مقرر کیا گیا اور اس کا نائب کیپٹن پولیر متعین ہوا، اکتوبر 1762ء میں ایمفلٹ نے خرابی صحت کی بناء پر استعفیٰ دیدیا۔ پولیر کو انچارج بنا دیا گیا اور یہ ہدایات دیدی گئیں کہ وہ نقشہ کے مطابق کام کرے اور کسی کام کو شروع کرنے سے پہلے ایمفلٹ سے مشورہ کر لیا کرے۔''5

پولیر کو بحیثیت انجینئر فوج میں کمیشن دیدیا گیا اور کیپٹن لیفٹیننٹ کے عہدہ پر فائز کر دیا گیا دو سال تک پولیر نے چیف انجینئر کی حیثیت سے کام کیا اور قلعہ کی تعمیر کی نگرانی کی۔ لیکن اسے بھی اپنے پیش روؤں کی طرح مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اکثر اس کا کام آدمیوں اور تعمیری سامان کی

کمی کے سبب رکا رہا۔کونسل کے نام خطوط میں متعدد جگہ ان دشواریوں کا ذکر ملتا ہے۔6 جو سامان کی فراہمی اور آدمیوں کی کمی کے سبب پیدا ہوتی تھیں اور جو ضرورت کے مقابلہ میں ہمیشہ کم ملتے تھے، پولیر کو اصل نقشہ کے مطابق کام کرنے کا حکم ملا تھا، لیکن اس نے بہت سی مناسب ترمیمات کیں۔اکتوبر 1763ء میں اس نے کونسل کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ ''سمندر کی جانب ایک گیٹ تعمیر کیا جائے تا کہ نئے قلعہ سے سامان کی درآمد و برآمد باآسانی اور تیز رفتاری سے کی جاسکے۔''7 سمندر کی جانب کا گیٹ حقیقتاً ایک بڑی کامیاب تجویز تھی۔1780ء میں جب ہاجیز ہندوستان آیا تو اس نے فورٹ ولیم سے کلکتہ کے منظر کی تصویر لی۔جس میں سمندر کی جانب کا یہ گیٹ سامنے ہی نظر آتا ہے ہاجیز کی رائے کے مطابق یہ قلعہ ''مضبوطی اور فن تعمیر کے لحاظ سے ہندوستان کے ہر قلعہ سے بہتر اور برتر ہے۔'' گیٹ کا خاص طور سے ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس سے ''اختراع پسند کرنل پولیر کی اعلیٰ صلاحیتوں کا علم ہوتا ہے۔''8

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پولیر کا تقرر بحیثیت انجینئر، بورڈ آف ڈائریکٹرز کی جانب سے ایک عارضی انتظام تھا، غالباً انگریزوں اور فرانسیسیوں کی جنگ کے دوران یہ مصلحت کے خلاف سمجھا گیا کہ ایک نیم فرانسیسی کو ایک ایسے عہدہ پر برقرار رکھا جائے 1764ء میں 9 کیپٹن فلیمنگ مارٹن کو بنگال میں چیف انجینئر مقرر کر دیا گیا اور پولیر فوج کے چیف انجینئر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔نومبر 1764ء میں اس نے چنار کے محاصرہ میں حصہ لیا۔1766ء میں اسے میجر بنا دیا گیا اور اس نے مونگیر 10 میں مقیم سر رابرٹ فلیچر کے بریگیڈ کے گوروں کی بغاوت دبانے میں مدد دی۔1767ء کے آخر میں اسے کلکتہ طلب کیا گیا تا کہ وہ محافظ فوج کا چارج سنبھالے۔قلعہ کی نگرانی کرے اور حفاظتی اقدامات کے سلسلہ میں تجاویز پیش کرے۔11

پولیر کو یہ امید ہوگئی تھی کہ اسے ترقی دے کر لیفٹیننٹ کرنل کے عہدہ پر فائز کر دیا جائے گا لیکن 1766ء میں کورٹ آف ڈائریکٹرز نے یہ قانون پاس کر دیا کہ ___ ''کسی غیر ملکی کو میجر سے بڑا عہدہ نہیں دیا جائے گا۔اب پولیر یہ سمجھ گیا کہ اس کی ترقی کی راہ میں روڑا اٹکایا گیا ہے اور مزید ترقی ناممکن ہے اس نے اپنے معاملہ کو کورٹ آف ڈائریکٹرز کے سامنے پیش کیا۔گورنمنٹ نے اس کی پُرزور سفارش کی۔لیکن لیڈن ہال اسٹریٹ کی مقتدر ہستیوں نے اپنے فیصلے کو بدلنے کے لئے اس میں کوئی معقول وجہ نہ دیکھی اور اس کی درخواست ایک سعیٔ لاحاصل رہی۔12

اس زمانہ میں شجاع الدولہ نواب اودھ نے حکومت بنگال کو بار بار یہ لکھا کہ اسے ایک انجینئر کی ضرورت ہے۔ پولیر کا نام تجویز کیا گیا اور اس نے نواب وزیر کی ملازمت اختیار کر لی۔ نواب کی مجوزہ عمارتوں اور قلعوں 13؎ کی تعمیر کی نگرانی اس کے سپرد کر دی گئی۔ پولیر لکھتا ہے کہ اس نے یہ پیش کش شکریہ کے ساتھ قبول کر لی، اور وہ محسوس کرنے لگا کہ اسے پُرسکون زندگی گذارنے اور کسی بڑے اعزاز اور دولتمندی کے ساتھ نہ سہی جس کی اسے اپنی سابقہ ملازمت سے توقع تھی اوسط درجہ کی مرفہ الحالی کے ساتھ یورپ جانے کا موقع مل جائے گا۔ 14؎

پولیر کی پہلے سے نواب سے شناسائی تھی، اس لئے شاہی نظر توجہ کی وجہ سے جلد ہی ترقی پا گیا۔ اسی زمانہ میں کلاڈ مارٹن، ایک فرانسیسی قسمت آزما نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دیدیا اور لکھنو میں مقیم ہو گیا۔ یہ مشہور تھا کہ اس نے اپنے نجی کاروبار خصوصاً نیل کی تجارت کے ذریعہ کافی دولت جمع کر لی ہے۔ پولیر لکھتا ہے کہ اس نے بھی ''اپنے چند دوستوں کی مدد سے'' تجارت میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ''اس کے لئے یہی وہ واحد طریقہ تھا جو محتاط روی کے ساتھ ذاتی آمدنی کا ذریعہ بن سکتا تھا۔'' 15؎

لیکن توقع کے مطابق اودھ میں پولیر کو پُرسکون زندگی نصیب نہیں ہوئی۔ دسمبر 1773ء میں جیسے وہ نواب کے دربار سے متعلق ہوا اسے نواب کے ساتھ اٹاوا جانا پڑا۔ اس وقت نجف خاں آگرہ کے قلعہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا جو جاٹوں کے قبضہ میں چلا گیا تھا شجاع الدولہ نے جوان دنوں نجف خاں کا دوست تھا۔ سپاہیوں کی دو بٹالینیں اور نو توپیں اس کی مدد کے لئے بھیجیں۔ محاصرہ نے توقع سے زیادہ طول کھینچا نواب کی فوجوں نے کوئی نمایاں کام انجام نہیں دیا، اس لئے نواب نے پولیر کو لکھا کہ وہ آگرہ آئے اور حملہ میں رہنمائی کرے۔ پولیر نے اپنی پوزیشن کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ ''میرے لئے اس کے اس حکم سے انکار اس لئے مناسب نہیں تھا کہ میں بحیثیت انجینئر اس کے یہاں ملازم تھا اور پھر محاصرہ میں وہ ایک فریق کی حیثیت رکھتا تھا۔ اگر میں اس موضوع پر کلکتہ سے خط و کتابت کرتا تو پورا ایک ماہ صرف ہو جاتا اور یہ تاخیر اس کے معاملات کے لئے نقصان دہ ہوتی۔ میں نے اس یقین کلی کی وجہ سے بھی اس کے حکم کی تعمیل میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی کہ اس کے لئے ہماری حکومت کی منظوری موجود تھی۔ اس کے بموجب میں بلا تاخیر آگرہ روانہ ہو گیا۔'' ان حالات سے وارن ہیسٹنگز کو مطلع کر دیا گیا تھا وہ اس وقت

بنگال کا گورنر تھا، آگرہ سے واپس آنے پر اسے گورنر کے ایڈی کانگ کی جانب سے یہ اطلاع موصول ہوئی کہ اس کا یہ اقدام پسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا ہے۔16

یہ خیال رہے کہ اس وقت تک ریگولیٹنگ ایکٹ پاس ہو چکا تھا، اور یہ گورنر جنرل اور کونسل کے درمیان متنازعہ فیہ امر بن گیا تھا۔ وارن ہیسٹنگز کے مخالفین نے پولیر کے اس اقدام میں اعتراض کی ایک صورت دیکھی اور 30- نومبر 1774ء کو، کلیورنگ، مانسن، اور فرانسس نے کورٹ آفیسر ڈائریکٹرز کو یہ شکایت بھیجی کہ ___ ''ہیسٹنگز کی جانب سے ہمیں یہ بتایا گیا تھا کہ میجر پولیر نواب کے علاقے میں سروے کے لئے مقرر کیا گیا ہے اس نے نجف خاں کے ماتحت فوج میں شامل ہو کر آگرہ کے محاصرہ میں نمایاں طور پر نہ سہی پھر بھی کافی مدد دی۔''17 انہوں نے گورنر جنرل سے یہ جواب بھی طلب کیا کہ ''موجودہ حکومت کی جانب سے پولیر کو کیا اختیار حاصل تھا جس کی رو سے اس نے آگرہ کے محاصرہ میں مدد دی۔ نیز اس نے اپنے ان جنگی اقدامات کی کوئی اطلاع بھیجی تھی؟ ہیسٹنگز سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ بورڈ کے سامنے وہ تمام ہدایات جو پولیر کو بھیجی گئی تھیں اور وہ جملہ اطلاعات جو پولیر کی جانب سے موصول ہوئیں پیش کرے۔''18 ہیسٹنگز نے جواب دیا کہ ممبران کا یہ خیال غلط ہے کہ نواب پولیر کو صرف سروے کے کام کے لئے ملازم رکھا تھا نواب کے انجینئر کے عہدہ کے لئے اس کے نام کی تجویز وزیر کی ایک عرصہ کی بار بار کی اس درخواست پر کی گئی تھی کہ اسے ایک مناسب آرٹیکٹ اور انجینئر کی ضرورت ہے۔ اس تقرر کی وجہ سے جنٹل یا کسی دوسرے فرانسیسی کے اس جگہ پر رکھ لئے جانے کے امکانات بھی ختم ہو گئے تھے، مزید برآں ایک ایسے افسر کو جس نے طویل عرصہ تک خدمات انجام دیں اور امتیازی لیاقت و قابلیت رکھتا تھا مگر غیر ملکی ہونے کے سبب کمپنی کے موجودہ قانون کی رو سے ترقی مراتب سے محروم کر دیا گیا تھا۔ ایک معقول ملازمت مل گئی تھی۔ گورنر جنرل اس سے آگاہ تھا کہ پولیر نے آگرہ کے محاصرہ میں نجف خاں کو مدد دی ہے اور یہ بھی یقین ہے کہ پولیر کی جانب سے اس سلسلہ میں خطوط بھی موصول ہوئے لیکن پولیر کے اس اقدام سے کمپنی کی یا فت یا مفاد کو کوئی نقصان پہنچ سکتا تھا۔'' وہ اسے سمجھنے سے قاصر ہے۔''19

گورنر جنرل کی اس وضاحت سے کونسل کی اکثریت مطمئن نہ ہو سکی اس نے پولیر کے اقدام کو اصولاً قابلِ اعتراض قرار دیا اور ''وزیر کے مقبوضات میں اس کے مزید قیام'' کو نامناسب قرار

دیا۔اس کی طلبی کے احکام جاری کر دیئے ۔20؎وارن ہیسٹنگز نے اس پر اعتراض کیا۔21؎ مگر ایکٹ کی رو سے گورنر جنرل کو اکثریت کے فیصلہ کو کالعدم قرار دینے کا حق حاصل نہیں تھا۔اس دوران میں شجاع الدولہ اپنے بیٹے آصف الدولہ کو انگریزوں کے سایہء عاطفت میں چھوڑ کر کچھ عرصہ کی علالت کے بعد فوت ہو گیا۔آصف الدولہ نے تخت نشینی کے فوراً بعد پولیر کو ہدایت دی کہ وہ اس کی سلطنت کی سرحدوں پر قلعوں کا ایک سلسلہ قائم کر دے لیکن قبل اس کے کہ وہ حکومت بنگال سے اس کام کے آغاز کی اجازت حاصل کرتا اس کی طلبی کا پروانہ پہنچ گیا۔22؎ 9-فروری1775ءکو اس نے گورنر جنرل اور کونسل کو ایک طویل مراسلہ لکھا جس میں اس نے کمپنی کو اپنی سابقہ خدمات یاد دلائیں اور درخواست کی کہ اسے اتنی مہلت دیدی جائے کہ وہ اپنے معاملات طے کر لے اس نے بتایا کہ ''میں آپ سے یہ پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا کہ اگر مجھے اپنے معاملات کے طے کرنے کے لئے وقت نہ دیا گیا تو یہ فوری روانگی میری تباہی کا باعث ہوگی۔ان انتظامات کے لئے کم سے کم 9 ماہ یا ایک سال کی مدت درکار ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس حد تک میرا ضرور خیال فرمائیں گے۔ جب آپ میری ان خدمات کو جو میں نے 18 سال کے طویل عرصہ میں وفاداری اور مستعدی سے انجام دی ہیں اور خاص طور سے ان اوقات میں جب میرے پاس قلعہ کی تعمیر کا چارج تھا، سامنے رکھیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ میری ترقی عزت و مراتب میں جو رکاوٹ پیدا کی گئی ہے اس سے مقابلہ کریں گے تو مجھے امید ہے کہ آپ اپنے ترحم اور مساویانہ سلوک سے مجھے وہ آسانی بہم پہنچائیں گے جن کا میں طالب ہوں۔''23؎ یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ پولیر اپنی طلبی کا مقصد سمجھ گیا تھا کیونکہ 24-فروری1775ءکے اس خط کے موصول ہونے کے بعد یہ تجویز رکھی گئی کہ پولیر کو بتایا جائے کہ وہ اپنے اس اقدام کی وجہ سے کہ ''اس نے آگرہ کے محاصرہ میں بغیر کسی اختیار کے مدد دی۔'' طلب کیا جا رہا ہے اور اسے اپنے کاروباری معاملات کو طے کرنے کے لئے کوئی مہلت نہیں دی جائے گی۔24؎غالباً پولیر نے آصف الدولہ کی مداخلت کے ذریعہ کچھ مہلت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اور نواب نے وارن ہیسٹنگز کو لکھا بھی تھا۔مگر ہیسٹنگز نے جواب دیا۔چونکہ حکومت پولیر کی واپسی کو ضروری خیال کرتی ہے اس لئے وہ اس حکم سے اختلاف نہیں کر سکتا۔25؎ بہرحال پولیر کو اودھ چھوڑنے پر مجبور کرنے میں کچھ وقت صرف ہوا26؎۔ 26-اپریل1775ءکو گورنر جنرل نے کونسل کے توسط سے کرنل گیلیز کو جس کی کمان میں سیکنڈ بریگیڈ

اودھ روانہ ہورہی تھی یہ حکم دیا کہ اگر پولیر ''اب بھی فیض آباد میں ہوتو اس حکم کے موصول ہونے کے پانچ دن کے اندر اندر اسے یہ مقام چھوڑ دینا چاہئے۔'' اور اگر ''وہ اس پر عمل نہ کرے'' تو اسے گرفتار کرلیا جائے، اور گورنر جنرل اور کونسل کی نافرمانی کے سلسلہ میں جنرل کورٹ مارشل میں مقدمہ چلایا جائے۔ کرنل گیلیز نے کونسل کے حکم سے پولیر کو مطلع کیا لیکن قبل اس کے کہ یہ حکم اس تک پہنچتا وہ فیض آباد چھوڑ چکا تھا اور کلکتہ روانہ ہوگیا تھا۔ 27

20- اگست 1775ء کو جب اس نے ایک دوسرا خط گورنر جنرل اور کونسل کے نام بھیجا تو یہ معاملہ پھر زیرغور آیا۔ پولیر نے اس میں شکایت کی تھی کہ اس کے فروری کے خط کا کوئی جواب نہیں دیا گیا اور اسے نواب کا علاقہ چھوڑنا پڑا کیونکہ وہ یہ جانتا تھا کہ ذرا سی تاخیر بھی حکم عدولی تصور کی جائے گی۔ اسے اپنی نجی تجارت میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جو نامناسب خیال کی جائے۔ آپ کے طریقہء کار میں فوج کے ''ایک ایسے افسر جس کے لئے ملازمت میں روز افزوں ترقی مراتب کی خوش آئندہ توقعات ہوں'' اور ایک اس ملازم میں جس کی ہر امید منقطع کردی گئی ہو اور جسے نہ صرف ایک ایک باعزت منصب اور مشاہرہ بلکہ اس تھوڑی سی سہولت سے بھی محروم کردیا گیا ہو جس کے ذریعہ وہ قرضہ کی لعنت سے محفوظ رہتے ہوئے زندگی گذار سکے۔'' ایک امتیاز و تخصیص نظر آتی ہے ___ ''اپنے حقیقی منصب اور فوج میں آئندہ ترقی سے محروم ہوکر اس نے صورت حال کو بہتر بنانے کے لئے وہ طریقہ اختیار کیا تھا ''جو باوقار بھی تھا اور حق پر مبنی بھی۔'' آپ یہ تصور نہ کریں کہ ''وہ کسی خوردہ فروش کی طرح دوکان لگائے بیٹھا تھا یا اس طرح پھیری لگاتا پھر رہا تھا جو ایک شریف آدمی کے لئے باعث شرم ہو۔'' اس نے حد سے زیادہ یہ احتیاط برتی کہ وہ کسی طرح تجارتی معاملات میں بذات خود سامنے نہ آئے، کاروبار اس کے ماتحت افراد چلاتے تھے اور وہ ''اپنے نام یا اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ کاروبار کرتے تھے۔ اس نے ان لوگوں سے زیادہ کچھ نہیں کیا جو بڑے سے بڑے عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود روزانہ یہی کرتے رہتے ہیں اور اپنا روپیہ مالکان جہاز کو جہاز کی ضمانت پر قرض دیتے ہیں۔'' ان وجوہ کی بنا پر وہ اپنے معاملات قطعی طور پر طے نہ کرسکا نہ کسی کا کچھ دے سکا اور نہ اپنا بقایا وصول کرسکا۔ اس دنیا میں وہ جو کچھ رکھتا تھا وہ سب وہیں چھوڑ آیا۔ اس میں دوسروں کی وہ چیزیں بھی تھیں جو انہوں نے اس کے سپرد کی تھیں غرضکہ سب کچھ ''سیاہ فام ملازموں'' کے اختیار میں چھوڑنا پڑا۔ اس لئے اس نے فیض آباد واپس جانے کی

اجازت طلب کی تھی تا کہ وہ کاروباری معاملات کو طے کر آئے اگر حکومت نواب کے یہاں بحیثیت انجینئر اور آرکیٹیکٹ اس کے رہنے پر معترض ہے تو اس کی التجا صرف اتنی ہے کہ اسے اتنی مہلت دیدی جائے (تقریباً آٹھ یا 9 ماہ کی) تا کہ تمام معاملات سے فراغت حاصل کی جا سکے۔ اور اگر کمپنی اس کی واپسی کو اس وجہ سے قابلِ اعتراض قرار دیتی ہے کہ کمپنی کے کسی ملازم کو تجارتی شغل نہیں رکھنا چاہئے تو وہ بہ رضا ورغبت نہیں بلکہ مجبوراً استعفےٰ پیش کرنے کو تیار ہے۔28؎

پولیر کا یہ خط بھی بے اثر رہا۔ 14- ستمبر 1775ء کو اسے اطلاع دی گئی کہ اس نے اپنے اختیارات سے متجاوز ہو کر نجف خاں کو مدد دی اور ایک افسر کے لئے یہ ''قطعی ناموزوں'' ہے کہ وہ ''تجارتی مشاغل اختیار کرے'' نیز یہ کوئی جواز نہیں کہ اس نے دوسروں کے نام سے کاروبار کیا بلکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی وہاں موجودگی غیر ضروری تھی اس لئے اسے بورڈ سے شکایات کرنے کے بجائے اس کے احکام کی فوراً تعمیل کرنا چاہئے۔ پولیر استعفےٰ پیش کرنے کے لئے آزاد تھا مگر اسے اودھ واپس جانے کی اجازت نہیں تھی۔29؎ 5- اکتوبر 1775ء کو پولیر نے گورنر جنرل اور کونسل کو لکھا کہ وہ اپنے معاملہ کو کورٹ آف ڈائرکٹرز میں پیش کرنا چاہتا ہے اور مناسب طور پر پیروی کرنے کے لئے استعفیٰ دینا اور انگلینڈ جانا چاہتا ہے۔30؎

غالباً اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے چچا فلپ فرانسس اور دوستوں نے اس کے ساتھ کچھ ایسا ناروا سلوک کیا اور وہ ھیسٹنگز کے دشمنوں کی مخالفت کا نشانہ بن گیا کونسل کی اکثریت اس انکشاف پر کہ پولیر کے تجارتی مشاغل بھی تھے، حیرت میں رہ گئی۔ لیکن پولیر کی یہ دلیل حق پر مبنی تھی کہ ''وہ لوگ جو بڑے سے بڑے عہدہ پر فائز ہیں یہ ان کا روزانہ کا مشغلہ ہے۔ نجی کاروبار جو کمپنی کے ملازمین کرتے تھے عام طور پر نقصان میں رہا اور اس سے اکثر چشم پوشی کی گئی۔ 1774ء میں جب مڈلٹن کو نواب اودھ کے یہاں ریذیڈنٹ مقرر کیا گیا تو خاص طور سے یہ ہدایت دی گئی کہ وہ تجارت میں حصہ نہ لے لیکن اسے اس مال پر جو شجاع الدولہ کلکتہ سے منگواتا تھا، نجی طور پر کمیشن لینے سے نہیں روکا جا سکا۔31؎

پولیر نے اکتوبر 1775ء میں استعفیٰ دیدیا۔ کچھ عرصہ کے لئے وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا، اس کے متعلق کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ تاہم استعفیٰ دینے کے بعد کچھ عرصہ بادشاہ کی ملازمت میں رہا، لیکن ہندوستان سے روانہ نہ ہو سکا۔ بعد کے ایک خط میں اس نے لکھا ہے کہ ''حالات نے اسے

یورپ واپس نہیں جانے دیا32۔ 1776ء کے آخر میں مانسن کا انتقال ہو گیا اور وارن ہیسٹنگز کو ایک مرتبہ پھر اکثریت کا تعاون حاصل ہو گیا۔ پولیر کی قسمت اب کچھ سنبھلتی ہوئی نظر آتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے سابقہ عہدہ پر لے لیا جائے۔ 1778ء میں اس نے دوبارہ ملازمت میں لے لئے جانے کی درخواست کی۔33 لیکن دو سال بعد اسے نواب وزیر کے انجینئر اور آرکیٹیکٹ کا عہدہ ملا۔ اسے لکھنؤ 34 میں قیام کی اجازت بھی مل گئی مگر کچھ عرصہ بعد ہی یہ عہدہ ختم کر دیا گیا غالباً اس کی وجہ نواب کو مالی پریشانیوں سے نجات دلانا تھی۔ 31- دسمبر 1781ء کو بنارس سے اس نے گورنر جنرل اور کونسل کو لکھا کہ یہ عہدہ ختم کر دیا گیا ہے اور یہ درخواست کی کہ اسے کمپنی کی ملازمت میں لے لیا جائے۔ اس نے لکھا کہ میں نے اعزازی لیفٹیننٹ کرنل بنائے جانے کی جو درخواست دی ہے آپ اسے نامناسب اور مہمل خیال نہ فرمائیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ بالائی علاقوں کے سروے کے لئے بھی جو میرے ہی سپرد تھی آپ بکمال مہربانی میرا تقرر فرمائیں گے اس طرح آپ مجھے جونیئر افراد کی ماتحتی میں کام کرنے کی اذیت سے بھی بچا لیں گے۔''35 اسی طرح کا ایک اور خط وارن ہیسٹنگز کے نام بنارس بھیجا جس میں اس نے اپنے بقایا جات کی وصولی میں ناکامی اور اپنی مالی دشواریوں کے متعلق لکھا تھا۔ ''یہ صحیح ہے کہ تمام قرضہ ادا کرنے کے بعد میرے پاس تھوڑا سا روپیہ بچ رہتا ہے، اگر میرے بس میں ہوتا تو ایک لمحہ ضائع کئے بغیر یورپ روانہ ہو جاتا۔ لیکن بدقسمتی سے بقایا جات جو دوسروں کے ذمہ ہیں اور وہ مطالبات جو مجھ پر واجب ہیں دونوں نواب کے ہاتھ میں ہیں اور ادائیگی کی جو توقعات ہیں ان کا آپ کو علم ہے۔ اگر آپ کی مہربانی سے آئندہ سال کے دوران یہ معاملہ طے ہو جاتا ہے تو جولائی یا اگست 1783ء تک اس بات کا امکان ہے کہ رقوم کی ادائیگی ہو جائے گی اور 1784ء کے اوائل تک میں یورپ روانہ ہو سکوں گا۔

''میں اس دوران میں ذریعہء معاش سے قطعی محروم ہوں۔'' ان حالات کے تحت اس نے یہ درخواست کی تھی کہ اسے دوبارہ ملازمت میں لے لیا جائے۔ ''میں اس عہدے سے جس پر میرا حق ہے دست بردار ہو جاؤں گا..... لیکن مجھے امید ہے کہ لیفٹیننٹ کرنل کا اعزاز ایک ایسے افسر کے لئے جس نے عزت مآب کمپنی کی خدمات 18 سال تک عزت و وقعت کے ساتھ کی ہے، کوئی بڑی بات نہیں ہے..... اس اعزاز کے علاوہ میرے لئے کوئی ایسا عہدہ بھی

تجویز کیا جائے جس کے تحت مجھے اس صوبہ سے باہر رہنا پڑے مزید برآں کسی بریگیڈ سے قریبی طور پر متعلق نہ ہوتا کہ میں اطمینان وسکون سے کام کرسکوں اور مجھے اپنے جونیئر افراد کے ماتحت کام کرنے میں ذلّت محسوس نہ ہو۔ ایسا عہدہ اگر اجازت ہوتو عرض کروں کہ وہ ''کرمناسا''..... کے اس طرف سروے کی نگرانی کے لئے تجویز کیا جاسکتا ہے۔ یہ کام اس سے قبل میرے ہی سپرد تھا.....36

پولیر کا معاملہ 18- مارچ 1782ء کو بورڈ میں پیش کیا گیا، وارن ہیسٹنگز نے اس کی اس قابلیت واہلیت کا حوالہ دیتے ہوئے جس کا اظہار اس کی ملازمت کے دوران ہو چکا تھا یہ تجویز پیش کی کہ میجر پولیر کو ہمارے عملہ میں لیفٹیننٹ کرنل کا اعزازی کمیشن دے کر دوبارہ ملازم رکھ لیا جائے اور اسے اس عہدہ کی تنخواہ اور الاؤنس حاصل کرنے کا حق دیدیا جائے۔''37 15- اپریل 1782ء کو یہ ریزولوشن منظور ہوگیا کہ انتونی پولیر کو دوبارہ کمپنی کی ملازمت میں لے لیا جائے۔ اور اعزازی طور پر اس کا تقرر بحیثیت لیفٹیننٹ کرنل کرلیا جائے لیکن کسی مخصوص فوج کے ساتھ اس وقت تک نہیں رکھا جائے گا جب تک کورٹ آف ڈائریکٹر کی مرضی کا علم نہ ہو جائے۔38 یہ بھی منظور ہوگیا کہ ''فی الحال اسے صوبہ اودھ میں رہنے کی اجازت دیدی جائے۔''39

پولیر کے دوبارہ ملازمت میں آنے کے بعد اس کے متعلق بہت کم معلومات ملتی ہیں لکھنو میں اس کے پاس ایک بہت ''بڑا بنگلہ تھا'' اور 1783ء میں جب ہاجیز نے بالائی صوبوں کا دورہ کیا تھا تو وہ اسی کے یہاں ٹھہرا تھا، اس نے اس کی ''حسب معمول خاطر مدارات'' کا ذکر کیا ہے۔40 پولیر کو ہندوستان کی تاریخ وادب سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور اس نے مشرقی زبانوں کے مخطوطات جمع کرنا شروع کردیئے تھے۔ 1784ء میں جب کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کا قیام عمل میں آیا تو وہ اس کے ابتدائی اراکین میں سے تھا۔ 22- جنوری 1784ء کے ایک اجلاس میں فرانسس گلیڈ وِن نے اس کا نام تجویز کیا اور دوسرے اجلاس میں جو 29- جنوری 1784ء میں منعقد ہوا اسے منتخب کرلیا گیا۔41 چونکہ وہ کلکتہ میں نہیں رہتا تھا، اس لئے وہ اجلاسوں میں باقاعدگی سے شریک نہیں ہوسکتا تھا، اکثر سوسائٹی کے اجلاسوں میں مقالات بھی پڑھا کرتا تھا اور دوسروں کے لکھے ہوئے مقالات بھیجتا رہتا تھا 29- فروری 1787ء کو اس نے ایک مقالہ جون ولیم 42 کا تحریر کردہ ارسال کیا تھا۔ 20- دسمبر 1787ء کو اس نے خود ایک مقالہ

''سکھوں کی تاریخ'' 43 پر پڑھا، اس نے ایک اور مقالہ'' گلاب کی کشید کا وہ طریقہ جو انسین 44 میں اختیار کیا جاتا ہے۔'' اور ''فیروز شاہ کوٹلہ کے ستونوں کے کتبات'' کا ترجمہ بھی ارسال کیا تھا۔ دونوں 27- مارچ 1788ء کے اجلاس میں پڑھے گئے۔45 1789ء میں پولیر یورپ چلا گیا۔ دوسال بعد شادی کرلی اور اَوِگنون کے قریب سکونت اختیار کر لی۔46 9- فروری 1795ء کو ڈاکوؤں نے اسے قتل کر دیا۔ اس نے ویدوں کا ایک مجموعہ اپنی حیات ہی میں برٹش میوزیم کو پیش کیا تھا اس کے علاوہ چند فارسی مخطوطات بھی دیئے تھے پیرس کی ببلیوتیک ناسیونال (قومی کتب خانہ) میں اس کے جمع کئے ہوئے عربی، فارسی اور سنسکرت کے مخطوطات موجود ہیں لوزان کی ببلیوتک کانتونال (ڈسٹرکٹ لائبریری) میں مخطوطات کی ایک فہرست ہے جس میں 120 مخطوطات پولیر کے دیئے ہوئے ہیں۔47

شاہ عالم ثانی 1771ء سے قبل

1775ء میں وارن ھیسٹنگز نے وطن جاتے ہوئے شاہ عالم ثانی کے متعلق لکھا تھا کہ اس کی ''انتہائی بے حسی اور کاہلی نے اسے اس قابل نہیں رکھا کہ وہ بڑی سے بڑی طاقت کی امداد سے بھی اپنے حالات کو درست کر سکے یا حالات کا کسی طرف رخ ہی موڑ سکے۔48 زیرِ نظر صفحات کے مطالعہ کے دوران کسی جگہ بھی قارئین کو اس سے اختلاف نہیں ہوگا کہ شاہ عالم ثانی اپنی ابتدائی عمر میں جب علی گوہر کہلاتا تھا کچھ ہونہار نظر آتا تھا۔ وہ 1758ء میں دہلی سے جہاں اس کا باپ فی الواقع اپنے وزیر عماد الملک کی قید میں تھا فرار ہو گیا اور نجیب الدولہ کے یہاں پناہ گزیں ہوا۔ اس کے بعد وہ شجاع الدولہ سے لکھنؤ میں ملا اور بہار کی طرف پیش قدمی کی۔ 18- مارچ 1759ء کو پٹنہ کے قریب پہنچا۔ علی گوہر ''شاہی اقتدار کی بازیابی کے لئے'' کلایو سے امداد کا طالب ہوا، لیکن وزیر نے بادشاہ کو مجبور کیا کہ وہ کلایو اور میر جعفر کو ''باغی بیٹے'' کے خلاف امداد کے لئے لکھے۔ پٹنہ پر حملہ کی کوشش ناکام رہی۔ کلایو کے ایک چھوٹی سی فوج کے ساتھ وہاں پہنچنے پر علی گوہر نے محاصرہ اٹھالیا اور لوٹ آیا تقریباً 8 ماہ تک شہزادہ بے خانماں و برباد پھرتا رہا۔ اودھ اور بہار میں پناہ گاہیں تلاش کرتا رہا۔ دسمبر 1759ء میں اس نے باپ کے قتل کی خبر سنی فوراً ہی اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا اور شاہ عالم ثانی کا لقب اختیار کیا۔ دوسرے سال فروری میں وہ پھر پٹنہ پہنچا

اور اسے رام نرائن پر ابتدائی فتوحات حاصل ہوئیں مگر کلائڈ نے اسے مکمل طور پر شکست دیدی۔ مرشد آباد پر قبضہ کی کوشش بھی ناکام بنادی گئی۔ پٹنہ پر بددلی کے ساتھ ایک اور حملہ کے بعد شاہ عالم اودھ کی طرف لوٹ گیا۔ 1761ء میں اس نے بہار پر تیسری بار حملہ کیا۔ جنرل کلائڈ نے شکست فاش دی اور ''بہار جانے والی سڑک پر دشمن کا تین کوس تک تعاقب کیا، بعض اوقات تعاقب میں وہ اس قدر قریب پہنچ گیا کہ اس کے خیموں کی آگ بھی سرد نہیں ہوسکی تھی۔'' آخر کار شاہ عالم کو ہتھیار ڈال دینا پڑے۔ کلائڈ اپنی حفاظت میں اسے پٹنہ لے گیا جہاں 1800 روپیہ ماہوار الاؤنس مقرر کر دیا گیا۔ 1761ء کی پانی پت کی جنگ کے بعد وہ دہلی واپس جانے کا بیحد خواہش مند تھا۔ شجاع الدولہ کی یقین دہانی پر وہ بہار سے روانہ ہوا لیکن دلّی ابھی دور تھی۔ آنے والے دس سالوں میں بھی اسے آوارہ وطن رہنا پڑا 1764ء میں وہ شجاع الدولہ اور میر قاسم سے جو معزول کر دیا گیا تھا مل گیا اور بہار پر حملہ کا منصوبہ بنایا۔ 22-اکتوبر 1764ء کو وہ بکسر کے مقام پر شکست کھا گئے۔ 3- مئی 1765ء کو کڑہ کے مقام پر انہیں دوبارہ شکست ہوئی۔ شاہ عالم انگریزوں سے مصالحت پر راضی ہوگیا۔ الہ آباد میں کلایو نے شجاع الدولہ سے ایک معاہدہ پر دستخط کرا لئے جس کی رو سے انگریزوں نے کڑہ اور الہ آباد کا کچھ حصہ شاہ عالم کو دیا اور الہ آباد میں اس کی حفاظت کے لئے ایک انگریزی فوج کا قیام منظور کرلیا۔ بادشاہ نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی 26 لاکھ روپیہ کے عوض ایسٹ انڈیا کمپنی کو عطا کر دی۔

1765ء تا 1771ء شاہ عالم الہ آباد میں رہا اور انگریزوں کی سنگینوں کے سایہ میں دہلی کا سفر کرنے کی اُمید پر زندگی کے دن گذارتا رہا، وہ دہلی جانے کا خواہش مند تھا اس کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ ''الہ آباد میں قیام کے دوران'' وہ دارالسلطنت کے مزوں کو چپکے چپکے یاد کر کے سرد آہیں بھرتا اور اپنے اسلاف کے تخت پر بیٹھنے کا آرزومند رہتا۔ 49

اس سلسلہ میں مرہٹوں نے جو پانی پت کی جنگ کے بعد دوبارہ طاقت حاصل کر چکے تھے، اس کے مشیر حسام الدولہ نے جو اپنے حریف منیر الدولہ پر برتری حاصل کرنا چاہتا تھا اور شجاع الدولہ نے جو الہ آباد میں اس کی موجودگی کو اپنے لئے ''سنگ راہ اور آشوب چشم'' سمجھ رہا تھا اس کی ہمت افزائی کی۔ پرانے وزیر نجیب الدولہ کے انتقال نے بھی اسے متفکر کر دیا تھا کیونکہ دہلی کا محافظ باقی نہیں رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں سکھ اس موقع سے فائدہ نہ اٹھالیں اور کسی اپنے آوردہ کو دہلی کے

تخت پر نہ بٹھادیں۔50اس لئے اس نے مرہٹوں سے معاہدہ کرلیا چالیس لاکھ روپیہ اور کڑہ اور الٰہ آباد دینے کا دینے کیا۔مرہٹوں نے اس کے نام سے دہلی کے تخت پر قبضہ کرلیا انگریزوں نے اس کے اس اقدام پر ناراضگی کا اظہار کیا لیکن کوئی مداخلت نہیں کی۔شاہ عالم 13-اپریل 1771ء کو الٰہ آباد سے روانہ ہوا سر رابرٹ بارکر اور شجاع الدولہ سرحد تک اس کے ساتھ آئے۔

مصنف اسی مقام سے اپنی داستان کا آغاز کرتا ہے اور 1779ء میں عبدالاحد خاں کی سکھوں پر فوج کشی کے واقعہ پر اسے ختم کرتا ہے۔اس نے بادشاہ اور ضابطہ خاں کی باہمی لڑائیاں، حسام الدولہ اور نجف خاں کی ایک دوسرے کے خلاف دشمنانہ سرگرمیاں اور شجاع الدولہ کی روہیلوں کے خلاف فوجی کارروائیاں بیان کی ہیں نجف خاں کے آگرہ کے محاصرہ کا تذکرہ سرسری طور پر کیا ہے لیکن آصف الدولہ کی نواب وزیر بننے کی کوششیں 1776ء میں ضابطہ خاں کی شاہ عالم پر فتح اور رحیم داد خاں روہیلہ کے کارناموں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔مصنف نے نجف خاں کے الور اور جے پور پر حملے اور ان اثرات کو بیان کیا ہے جو انگریزوں کی مرہٹوں سے جنگ میں ناکامی کی خبر سے مرتب ہوئے تھے، یہ تصور کیا جاتا تھا کہ مرہٹے پہلے ہی دہلی کے دروازوں پر پہنچ چکے ہیں'' خلعتیں تیار کی گئیں، فوجیں جمع کی گئیں اور یہ خبر عام ہوئی کہ بادشاہ مرہٹوں کو لے کر ''آصف الدولہ کے علاقہ پر حملہ کرے گا'' لیکن جب یہ پتہ چلا کہ انگریزوں کی جانب سے واڈگام کے کنونیشن کی تصدیق وتوثیق نہیں کی جائے گی اور بادشاہ کی مدد کے لئے مرہٹوں کی آمد کا کوئی امکان نہیں تو وزیر عبدالاحد خاں نے خود کو اتنی کثیر التعداد فوج میں گھرا ہوا پایا جس کو رکھنے کے ذرائع اس کے پاس نہیں تھے۔ان کو منتشر کرنا بھی دشوار تھا اس لئے مجبوراً انہیں کام پر لگانا پڑا اور سکھوں کے خلاف فوج کشی کرنا پڑی۔مصنف نے بادشاہ کے ''مقبوضات اور محاصل'' اور دربار کا بھی ذکر کیا ہے۔بادشاہ کی نجی زندگی اس کے کردار اور شاہی خاندان کے بیان کے بعد اس کو ختم کردیا ہے۔

شاہ عالم خوش قسمت تھا کہ اسے ایک ہمعصر سوانح نگار مل گیا جو 1782ء میں ہندوستان آیا۔اسی سال نجف خاں کا انتقال ہوا اور شاہ عالم کی زندگی کے آخری دور کا آغاز ہوا۔موجودہ زمانے میں اس دور پر جامع تصانیف نظر آتی ہیں سلطنت مغلیہ کے زوال کی داستان تمام ممکنہ مآخذ سے لکھی جاچکی ہے لیکن پھر بھی پولیر نے دہلی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے دلچسپی سے خالی

نہیں۔مورخین نے ماخذ کی حیثیت سے اسے کبھی مناسب طور پر استعمال نہیں کیا، اس بات کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ کچھ تاریخوں اور مالیات سے متعلق معاملات کی تفصیلات کی جو اس مسودہ میں دی گئی ہیں بعد کے مورخین سے.....تصدیق و توثیق نہیں ہوتی۔مثال کے طور پر، پولیر لکھتا ہے کہ ''شاہ عالم اواخر دسمبر 1771ء سے قبل دہلی میں داخل نہیں ہوا۔سر جادوناتھ سرکار نے فارسی ماخذ کی بنیاد پر اس کا داخلہ بعد کی تاریخوں میں بتایا ہے۔51 ایسے اختلافات کی باآسانی وضاحت کی جاسکتی ہے۔یہ نہیں سمجھا جاتا کہ ہمعصر مورخ ایک بڑے خسارہ میں رہتا ہے وہ مسودات و کاغذات جو آنے والی نسل کے سامنے ہوتے ہیں اکثر اس کی تکذیب کرتے ہیں وہ تاریخ کو ذاتی مشاہدات اور ان اطلاعات کی بنیاد پر لکھتا ہے جو دوسروں سے حاصل ہوتی ہیں وہ حکومت کے کاغذات تک رسائی اور سربستہ رازوں کی گرہ کشائی کے ذرائع نہیں رکھتا، تاہم یہ معمولی اختلافات کسی طرح بھی اس کی تصنیف کی افادیت پر اثر انداز نہیں ہوتے اس کی قدر و قیمت خاص طور سے اس وجہ سے ہے کہ یہ ایک ہمعصر کی تصنیف ہے جو اس وقت تک کے حالات کا براہ راست علم رکھتا تھا۔وہ واقعات جو سلطنت مغلیہ کے زوال کا پیش خیمہ ہیں یکے بعد دیگرے تیزی سے رونما ہوتے چلے گئے مصنف نے انہیں اس حسن و خوبی کے ساتھ قلم بند کیا ہے کہ نہ صرف مخصوصین ہی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں بلکہ عام لوگ بھی محظوظ ہو سکتے ہیں۔

حوالہ جات

1- سیکریٹ پروسیڈنگز (خفیہ کارروائیاں) 24-فروری 1775ء (10) بعض تاریخوں کا تعین مشکل ہے۔یوگین اور ایمل ہیگ کی لافرانس پروٹسٹنٹ میں لکھا ہے کہ وہ 1741ء میں پیدا ہوا، اور 1756ء میں ہندوستان پہنچا۔اس کی اپنی زندگی کے بعض خود نوشتہ حالات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ 1753ء میں ہندوستان پہنچا_____ اور 1736ء میں پیدا ہوا۔میں نے اس خط پر اعتماد کیا ہے جو اس نے گورنر جنرل کو لکھا ہے اور اس میں اپنے زندگی کے واقعات کو دوہرایا ہے اس کے مطابق وہ 1758ء میں ہندوستان پہنچا لیکن اس میں اس کی پیدائش کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔ملاحظہ کیجئے بنگال سابق اور موجودہ

1910ء،صفحہ 176

2- بنگال سابق اور موجودہ 1910ء،ص176 نیز ایسٹ انڈیا ملٹری کلینڈر۔دوم۔ص42

3- سیکرٹ پروسیڈنگز۔24-فروری1775ء(10)

4- سلیکشن فرام ریکارڈز۔''ریکارڈ سے انتخاب از لانگ ص215-159 نیز بنگال فوج کے افسراز ہڈسن جلداول،ص212

5- سیکریٹ پروسیڈنگز۔24-فروری1775ء(10)

6- پبلک پروسیڈنگز(عام کارروائیاں)20-جون1763ء۔ص96-498

7- پبلک پروسیڈنگز(عام کارروائیاں)31-اکتوبر1763ء۔ص1306

8- ٹریولزان انڈیا(ہندوستان میں سفر)از ہاجیز۔ص14

9- سیکریٹ کارسپونڈینس(خفیہ خط وکتابت)24-فروری1775ء(10)

10- سیکریٹ کارسپونڈینس۔لائف آف لارڈ کلایواز فاسٹ جلددوم،ص22،221،271 اور''ہسٹری آف بنگال آرمی''از بروم۔حاشیہ ص581

11- سیکریٹ کارسپونڈینس۔24-فروری1775ء(10)

12- سیکریٹ کارسپونڈینس(خفیہ خط وکتابت)24-فروری1775ء(10) نیز میجر جنرل کلاڈ مارٹن از ہل۔ص61-65

13- " " " کلینڈآف پرشین کارسپونڈینس۔ص1086،184

14- " " " " " " " " " " " " " " "

15- سیکریٹ کارسپونڈینس(خفیہ خط وکتابت)معلوم ہوتا ہے کہ پولیر کوکلکتہ میں کاروبار کا تجربہ پہلے ہی حاصل ہو چکا تھا ڈاکٹر این کے سنہا نے مجھے بتایا۔

16- پبلک کارسپونڈینس(عام خط وکتابت)14-دسمبر1775ء۔(6)

17- سیکریٹ کارسپونڈینس(خفیہ خط وکتابت)19-دسمبر1774ء(1)

18- سیکریٹ کارسپونڈینس(خفیہ خط وکتابت)19-دسمبر1774ء(1)

19- سیکریٹ کارسپونڈینس(خفیہ خط وکتابت)19-دسمبر1774ء(1)

20- سیکریٹ کارسپونڈینس(خفیہ خط وکتابت)19-دسمبر1774ء(2)

21- سیکریٹ کارسپونڈینس (خفیہ خط وکتابت) 23- جنوری 1775ء (6)

22- سیکریٹ کارسپونڈینس (خفیہ خط وکتابت) 24- فروری 1775ء (10)

23- سیکریٹ کارسپونڈینس (خفیہ خط وکتابت) 24- فروری 1775ء (10)

24- سیکریٹ کارسپونڈینس (خفیہ خط وکتابت) 24- فروری 1775ء (12)

25- سیکریٹ کارسپونڈینس (خفیہ خط وکتابت) 17- اپریل 1775ء (1)

26- سیکریٹ کارسپونڈینس (خفیہ خط وکتابت) 26- اپریل 1775ء (5)

27- سیکریٹ کارسپونڈینس (خفیہ خط وکتابت) 31- مئی 1775ء (14)

28- پولیٹکل کارسپونڈینس (سیاسی خط وکتابت) 14- ستمبر 1775ء (6)

29- پبلک کارسپونڈینس (عام خط وکتابت) 14- ستمبر 1775ء (7)

30- پبلک کارسپونڈینس (عام خط وکتابت) 30- اکتوبر 1775ء (7)

31- ''وارن ہیسٹنگز اوراودھ'' از ڈیویز۔ص 64

32- پبلک کارسپونڈینس (عام خط وکتابت) 15- اپریل 1782ء (14)

33- پبلک کارسپونڈینس (عام خط وکتابت) 15- اپریل 1782ء (14) اس خط میں پولیر نے ہیسٹنگز کو اپنی مالی پریشانیوں کے متعلق لکھا تھا لیکن یہ خیال رہے کہ دو یا تین سال قبل اس نے نجف خاں کو 80,000 روپیہ قرض دیئے تھے۔ آف دی مین ٹریک (اصل راستہ سے ہٹا کر) از سین۔ص 53

34- پبلک کارسپونڈینس (عام خط وکتابت) 22- جون 1780ء (8)
نیز 15- اپریل 1782ء (14)

35- پبلک کارسپونڈینس (عام خط وکتابت) 15- اپریل 1782ء (14)

36- پبلک کارسپونڈینس (عام خط وکتابت) 18- مارچ 1782ء (19)

37- پبلک کارسپونڈینس (عام خط وکتابت) 18- مارچ 1782ء (18)

38- پبلک کارسپونڈینس (عام خط وکتابت) کونسل کی کارروائیاں مورخہ 15- اپریل 1782ء

39- پبلک کارسپونڈینس (عام خط وکتابت) کونسل کی کارروائیاں مورخہ 15- اپریل 1782ء

40- ''ٹریولزان انڈیا'' از ہاجیز۔ص 143

41- پروسیڈنگز آف دی ایشیاٹک سوسائٹی۔مورخہ 22-و29- جنوری1784ء

42- پروسیڈنگز آف دی ایشیاٹک سوسائٹی۔مورخہ 29-فروری20-دسمبر1787ء

43- پروسیڈنگز آف دی ایشیاٹک سوسائٹی۔مورخہ 29-فروری20-دسمبر1787ء

44- جنوبی برما کا ایک شہر جو رنگون سے جانب شمال 10 میل کے فاصلہ پر دریائے اراوَدی کے ڈیلٹے کی اس شاخ کے کنارے واقع ہے جس پر رنگون آباد ہے۔

45- پروسیڈنگز آف دی ایشیاٹک سوسائٹی۔27-مارچ1788ء

46- ''بنگال سابق و موجودہ'' 1910ء۔ص177 نیز ڈکشنری آف انڈین بائیوگرافی از بک لینڈ۔ص339

47- سلیکشن فرام دی اسٹیٹ پیپرز آف دی گورنر جنرل آف انڈیا(وارن ہیسٹنگز) جلد دوم، ص58

48- مجھے سر جادوناتھ سرکار نے بتایا ہے کہ پٹنہ کی اورینٹل پبلک لائبریری میں ایک مخطوطہ ہے جس پر پولیر کا نام لکھا ہوا ہے۔

49- ''دی ہسٹری آف شاہ عالم'' از فرانکلن۔ص26

50- ''فال آف دی مغل ایمپائر۔'' از سرکار جلد دوم۔ص50-549

51- ''فال آف دی مغل ایمپائر۔'' از سرکار جلد دوم۔ص555۔لیکن فرانکلن پولیر کی دی ہوئی تاریخ سے متفق ہے۔

دہلی۔
15-اگست1779ء

دہلی دربار کی روداد

1771ء تا1779ء

میں بادشاہ کے 1771ء میں الہ آباد چھوڑنے سے قبل کے واقعات بیان نہیں کروں گا کیونکہ بادشاہ سے متعلق اس سے پہلے کی ہر بات عام طور پر معلوم ہے۔صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اسے الہ آباد میں مقیم رکھنے کے لئے سر رابرٹ بارکر کی جانب سے ہر طرح کی کوشش کی گئی مگر وہ یہاں سے جانے کا ایسا پختہ ارادہ کر چکا تھا کہ اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی جا سکی اگر چہ الہ آباد کے قیام میں بادشاہ کے لئے ترغیب وتحریص کے متعدد پہلو تھے مگر وہ یہاں کے قیام کو اپنے لئے قید و بند سمجھتا تھا۔بعض اعلیٰ عہدیداران کا رویہ اس کے ساتھ انتہائی شریفانہ تھا۔تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض اوقات اس کے ساتھ اس کے برعکس بھی سلوک روا رکھا گیا،اور اس کی کافی تحقیر کی گئی۔علاوہ ازیں ایک اور وجہ بھی تھی جو قوی ترین محرک کی حیثیت رکھتی تھی۔

الہ آباد سے روانگی اور اس کے اسباب

اس وقت حسام الدولہ1 کا ستارہ عروج پر تھا لیکن منیر الدولہ2 کے بڑھے ہوئے اثر ورسوخ کی وجہ سے اسے عام انتظامی امور سے علیحدہ رکھا گیا تھا پھر بھی اسے انتظامیہ کا تعاون اور بادشاہ کا پورا پورا اعتماد حاصل تھا۔تمام امور کی سربراہی کے لئے اسے صرف ایک سازگار موقع

درکار تھا۔ اوراس مقصد کے حصول کے لئے الٰہ آباد چھوڑنا ضروری تھا۔ منیرالدولہ بوجہ ضعیفی بادشاہ کی مشایعت نہیں کرسکتا تھا۔ اور مجھے یقین بھی نہیں کہ وہ ایسا کرتا۔ اسے یہ احساس تھا کہ اس کے اقتدار کو کافی گھن لگ چکا ہے اس لئے اس کے دل میں اس کا شائبہ بھی نہ ہوگا۔ درباریوں نے بھی بادشاہ کو دہلی چلنے اور دوآبہ کے بالائی علاقوں میں اپنی حکومت دوبارہ قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ اس درخواست میں وہ سب لوگ شریک تھے جو منیرالدولہ کے اقتدار سے غیر مطمئن تھے اور نئے وزیر کے دامن سے وابستہ ہوکر بہتری کی توقعات رکھتے تھے۔ مرہٹوں کو دعوت دینے اور الٰہ آباد چھوڑنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس میں درپردہ شجاع الدولہ کا بھی ہاتھ تھا کیونکہ وہ بادشاہ کے الٰہ آباد میں قیام سے خوش نہ تھا۔ بادشاہ کا قیام، اس کی راہ کا کانٹا بلکہ آنکھ کا وہ تنکا تھا جس کو وہ ایک عرصہ سے دور کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ جب اسے اس قسم کی سرگوشیوں کا علم ہوا تو اس نے حسام الدولہ کو اُکسایا کہ وہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دے اور مخالفتوں کے باوجود اسی بات پر اڑا رہے چونکہ اس مقصد کے حصول میں خود شجاع الدولہ کا مفاد بھی تھا اس لئے اس نے معقول رقم بھی پیش کی۔3 بعض کا قول ہے کہ بہت سے وعدوں اور ان چھوٹی چھوٹی رقموں کے علاوہ جو اس نے بادشاہ کے دوسرے ملازمین کو دیں ایک لاکھ پچاس ہزار روپے کی رقم حسام الدولہ کو دی۔ ان تمام اسباب کی بنا پر بادشاہ کا جانا ایک قطعی امر تھا۔ منیرالدولہ کو الٰہ آباد میں چھوڑ دیا گیا تاکہ وہ بادشاہ کی جانب سے اس صوبہ کا انتظام سنبھالے اور محصولات وصول کرے شجاع الدولہ اور سر رابرٹ بارکر تھوڑی سی فوج کے ساتھ بادشاہ کے ہمراہ سرحد تک آئے یہاں سے بادشاہ 1771ء کے موسم برشگال کے اوائل میں فرخ آباد پہنچ گیا۔

فرخ آباد میں ورود

اس سے کچھ عرصہ قبل احمد خاں بنگش کا انتقال ہو چکا تھا۔ عالمگیر ثانی کے دور میں وہ امیرالامراء کے عہدہ پر فائز تھا حال ہی میں سبک دوش ہوکر اپنی اس وسیع جاگیر میں مقیم ہوگیا تھا جو دوآبہ میں اٹاوہ سے انوپ شہر تک پھیلی ہوئی تھی۔ بادشاہ اس تعلق کی بنا پر اور نذرانہ وغیرہ کے فیصلہ کے لئے احمد خاں کے علاقہ کے صدر مقام فرخ آباد میں کچھ عرصہ ٹھہرا۔ احمد خاں کا بیٹا مظفر جنگ اپنے باپ کے علاقوں پر فرمانروائی کے لئے شاہی سند حاصل کرنے اور ضبطی سے محفوظ رہنے کے

لئے جو اعلیٰ عہدیداران وملازمین کے مرنے کے بعد عام طور پر ہو جایا کرتی ہے نذرانہ پیش کرنے پر آمادہ تھا۔ کچھ عرصہ کی گفت وشنید کے بعد معاملہ 5 لاکھ روپیہ پر طے ہو گیا۔4 جس میں سے کچھ نقد اور باقی سامان کی صورت میں پیش کر دیا گیا۔ بادشاہ کو شجاع الدولہ کی جانب سے دس لاکھ روپیہ اور منیر الدولہ کی طرف سے بارہ لاکھ روپیہ بابت خراج بنگال برائے سال 1772ء وصول ہو چکے تھے اس لئے اس کے پاس نہ صرف کافی نقدی تھی بلکہ جاں نثاروں کا ایک مختصر ومنتخب دستہ شاہی محافظ فوج کی صورت میں ہمرکاب تھا۔

نبی گنج میں قیام اور مرہٹے

فرخ آباد میں تقریباً دو ماہ گذرنے کے بعد بادشاہ نبی گنج5 پہنچا جو راستہ میں دہلی سے 25 کوس کے فاصلہ پر تھا یہاں کچھ دنوں کے بعد ایک مرہٹہ سردار سندھیا بادشاہ سے آ کر ملا۔ بادشاہ سے معاملہ طے کرنے اور دہلی کے نواح میں مقیم مرہٹوں کی ایک کثیر التعداد فوج تک جو بساجی6 کی سرکردگی میں تھی مشایعت کے لئے آیا تھا کئی بار کی گفت وشنید کے بعد مرہٹوں اور حسام الدولہ کے درمیان جواب عہدۂ وزارت پر فائز ہو چکا تھا معاملہ طے ہو گیا۔ دس لاکھ روپیہ اس شرط پر دینا طے پایا کہ مرہٹے دہلی پر بادشاہ کو قبضہ دلا دیں گے اور ضابطہ خاں کو اس کے علاقوں سے بیدخل کرانے میں امداد دیں گے اس کے بموجب بادشاہ اور مرہٹوں نے فوری طور پر حملہ کا ارادہ کیا۔ روپیہ پیشگی ادا کر دیا گیا پہلے شاہی افسر کو چند خطوط اور کچھ فوج کے ساتھ مرہٹہ سپہ سالار کے پاس روانہ کیا تا کہ شہر اور دہلی کا قلعہ اس کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کے پہنچتے ہی شہر پر قبضہ ہو گیا۔ مگر ضابطہ خاں کی جانب سے متعین کی ہوئی فوج کے کماندار سے ہتھیار ڈلوانے میں ذرا دقت پیش آئی تاہم جب اس کے آدمیوں کے واجبات ادا کرنے کا انتظام کر دیا گیا تو وہ بہت جلد رام ہو گیا۔

دارالسلطنت میں پہلی بار

شاہ عالم تخت نشینی کے بعد پہلی مرتبہ دارالسلطنت کا حقیقی مالک بنا، تاہم یہاں وہ دسمبر 1771ء کے اواخر سے پہلے داخل نہ ہو سکا7 کیونکہ اس کا بیشتر وقت راستہ میں اور مرہٹہ سرداروں

سے گفت وشنید میں صرف ہوا۔ دہلی میں بادشاہ کا قیام بہت کم عرصہ رہا۔

ضابطہ خاں سے بنائے مخاصمت

ایسا معلوم ہوتا ہے اس کو ضابطہ خاں کی سرکوبی کے لئے بہت زیادہ اُکسایا گیا۔ اس کو مختلف وجوہ بیان کی گئیں۔ اس کو بتایا گیا کہ ضابطہ خاں نے شاہی آداب اور بادشاہ کے احترام کو ملحوظ نہیں رکھا ہے اس نے بادشاہ کے قیام کے دوران اس کی حد سے زیادہ تحقیر وتذلیل کی ہے اس قسم کی افواہیں بھی سنی گئی تھیں کہ نجیب الدولہ کے بعد جب ضابطہ خاں دہلی اور قلعہء دہلی پر کامل اقتدار رکھتا تھا وہ اکثر وبیشتر محل میں آتا جاتا رہتا تھا اور محل میں مقید بہت سی بیگمات سے ان کی مرضی یا خلاف مرضی اس کے تعلقات وابستہ تھے۔ خیال ہے کہ بادشاہ کی حقیقی بہن خیر النساء بھی اس میں ملوث تھی ضابطہ خاں کا اس قسم کا رویہ نہ صرف شاہ عالم کے لئے اشتعال انگیز تھا بلکہ اس ملک کے نہایت نرم مزاج شخص کے لئے بھی ناقابل برداشت تھا۔ بہرحال اس کا جرم کچھ بھی ہو بادشاہ نے ضابطہ خاں کے باپ نجیب الدولہ کے ان احسانات کو بھی فراموش کر دیا جو اس نے اس پر اور اس کے خاندان پر کئے تھے۔ ایک عرصہ تک شہر کی حفاظت کے فرائض انجام دیئے تھے اور شہر اور اس کے اردگرد کے علاقہ پر انتہائی عدل ونیک نامی کے ساتھ حکومت تھی۔

ضابطہ خاں پر لشکر کشی

جہاں تک مرہٹوں کا تعلق ہے وہ ضابطہ خاں پر حملہ کے خواہاں تھے لیکن محض اس خیال سے نہیں کہ وہ اس باپ کے بیٹے سے جس کی شجاعت اور عمدہ تدابیر کی وجہ سے احمد شاہ ابدالی نے ان پر بڑی فتوحات حاصل کی تھیں بلکہ تین مرہٹہ سرداروں میں سے بساجی اور سندھیا خاص طور سے انتظامی جذبہ رکھتے تھے۔ سندھیا پر اب تک سابقہ شکستوں کے اثرات باقی تھے وہ اپنی ایک ٹانگ گنوا کر زندگی بھر کے لئے لنگڑا بن چکا تھا۔ صرف تکوجی کسی حد تک جنگ کا مخالف تھا وہ بھی غالباً کسی اور وجہ سے نہیں بلکہ وہ سندھیا سے حسد ورقابت رکھتا تھا۔ جنوری 1772ء کے اوائل میں دہلی پہنچنے کے 20 دن بعد بادشاہ نے میدان جنگ کا رخ کیا اور پوری مرہٹہ فوج لے کر جو تقریباً نوّے (90) ہزار بہادروں پر مشتمل تھی ضابطہ خاں پر لشکر کشی کی بادشاہ کے قریب پہنچنے پر ضابطہ خاں

نے غوث گڑھ کو جو سہارن پور کے علاقہ کا صدر مقام تھا خالی کر دیا اور فرار ہو کر گنگا پار کے علاقہ میں پہنچ گیا جو روہیلہ علاقہ کے قریب واقع تھا اس نے دریائے گنگا کے کنارے واقع قصبہ سکھرتال[9] کے چاروں طرف خندقیں کھود کر خود کو محفوظ کر لیا اور بادشاہ کے پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ اپنی تمام افواج کو ایک مقام پر جمع کرتا اور اپنے دشمن کا ایک جگہ ڈٹ کر مقابلہ کرتا، فوج کو جا بجا متعین کر کے دریا کے کنارے کے مختلف قلعوں کی حفاظت کی کوشش کی کنارے پر دور دور چوکیاں قائم کیں۔ اس طریقہ کار کی وجہ سے اس کی طاقت کمزور پڑ گئی اور وہ اس قابل نہ رہا کہ اگر دشمن چابکدستی سے کسی محاذ پر حملہ کرے تو وہ اپنی فوج کے مختلف بازوؤں کو مناسب امداد پہنچا سکے۔ ایسا ہی ہوا کہ جب اس کے محاذ کا چند دن جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ ایک قلعہ ضابطہ خاں کی نظروں سے بچ گیا ہے۔ نجف خاں نے ایک منتخب دستے کے ساتھ دریائے گنگا کو عبور کیا اور مقابل کی ایک چوکی پر زور دار حملہ کر کے اس کا صفایا کر دیا پیچھے پیچھے مرہٹہ فوج کا ایک بڑا حصہ وہاں پہنچ گیا۔

ضابطہ خاں کی شکست

ضابطہ خاں اپنے بہترین سرداروں کو کھو کر اور بری طرح شکست کھا کر بھاگا اور پھر مشکل ہی سے کہیں جم کر مقابلہ کر سکا اس نے پتھر گڑھ میں پناہ لی جو یہاں سے کچھ زیادہ فاصلہ پر نہیں تھا اور جہاں اس کے خاندان کے مرد و زن پہلے ہی پہنچا دیئے گئے تھے۔ لیکن وہ اس کے تعاقب میں اس قدر قریب پہنچ گئے تھے کہ اسے اپنے اہل خاندان کو بھی وہاں سے نکالنے کا موقع نہ مل سکا اور وہاں سے آگے کی جانب راہ فرار ڈھونڈنا پڑی ہر ایک شے کو دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ کچھ ہی دن بعد پتھر گڑھ[10] فتح ہو گیا اور تمام مال و اسباب مرہٹوں کے ہاتھ آیا۔

ضابطہ خاں شجاع الدولہ کی پناہ میں

ضابطہ خاں کو شجاع الدولہ کے دامن میں سر چھپانا پڑا۔ اس نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس دوران میں شجاع الدولہ اپنی تمام فوج لے کر اپنے ایک سرحدی مقام (شاہ آباد)[11] پہنچ گیا تھا تا کہ مرہٹہ فوج کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھے جن کی قربت اور فوجی کارروائیاں اس کے لئے

خطرناک تھیں بہرحال شاہی فوج کو ضابطہ خاں کے تمام مقبوضات پر قبضہ کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ دوسرے روہیلہ سرداروں پر بھی حملے کئے گئے جن میں سے بہت سے اپنے علاقے چھوڑ کر شجاع الدولہ کے صوبوں میں پہنچ گئے یا قریب کی پہاڑیوں میں روپوش ہو گئے تاہم شجاع الدولہ کو کوئی زک نہیں پہنچائی گئی مگر دھمکیاں اسے بھی دی گئیں۔

شجاع الدولہ اور انگریزوں پر حملہ کی مخالفت

برسات کا زمانہ قریب تھا مرہٹہ سرداروں نے بادشاہ پر زور ڈالا کہ وہ بریلی یا اس ضلع کے کسی دوسرے مقام پر قیام کرے اور وعدہ کیا کہ کچھ عرصہ ستانے کے فوراً بعد وہ تمام روہیلہ علاقہ پر بادشاہ کو مکمل طور پر قبضہ دلا دیں گے نیز شجاع الدولہ اور بریگیڈ پر حملہ کریں گے۔ اگرچہ بادشاہ کو کافی اُکسایا گیا مگر وہ رضامند نہ ہوا، اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے حلیفوں، بریگیڈ کے دستوں 12 یا شجاع الدولہ میں سے کسی پر بھی حملہ کے لئے تیار نہیں ہے اس کے برخلاف وہ دہلی واپس جانے کے لئے بضد ہوا، لہٰذا چند ہی روز بعد واپسی کی تیاریاں ہونے لگیں اس طرح اس مہم کا خاتمہ ہوا۔

مرہٹوں کا کردار

مجھے یقین نہیں کہ اس کا اختتام بادشاہ کے خواہش کے مطابق ہوا۔ کیونکہ کرایہ بھاڑے کی مرہٹہ امدادی فوجوں نے اس کی خواہشات کے مطابق عمل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی نہ اپنے وعدوں ہی کو پورا کیا بلکہ وہ ہمیشہ معمولی معمولی رقموں کی خاطر اس کے مفادات کو نظرانداز کرنے پر تیار ہیں ضابطہ خاں کے خاندان اور حرم کو شجاع الدولہ کی ذاتی دلچسپی اور مرہٹہ سرداروں پر اس کے اثر و رسوخ کی وجہ سے ڈیڑھ لاکھ روپیہ کی رقم کے عوض واپس بھیج دیا گیا۔ یہ رقم بھی شجاع الدولہ ہی نے ضابطہ خاں کو از راہ عنایت عطا کی تھی۔

بادشاہ کی واپسی

اسی دوران میں بادشاہ جون 1772ء کو دہلی واپس پہنچ گیا۔ ہانسی اور حصار کے صوبے

جنہیں ضابطہ خاں نے خالی کر دیا تھا۔ نجف خاں کو بطور انعام مرحمت کئے گئے۔ دوسرے امیروں کو سہارن پور اور دوآبہ کے دوسرے پرگنے عطا کئے گئے۔ مرہٹوں نے یہ زمانہ کول اور خورجہ میں گذارا تاکہ جاٹوں کے بعض قلعوں کو فتح کر کے انہیں چوتھ دینے پر آمادہ کریں۔

ضابطہ خاں مرہٹوں کے دامن میں

جیسے ہی موسم برشگال اختتام کو پہنچا، حالات ایک دوسرا رخ اختیار کرنے لگے۔ اس عرصے میں ضابطہ خاں نے شجاع الدولہ کے مشورہ پر خود کو مرہٹوں کی پناہ میں دیدیا۔ اس غرض کے لئے اس نے تکو کو منتخب کیا۔ شجاع الدولہ ہی نے اپنے پُرزور سفارش کے ساتھ اس کے پاس بھیجا تھا وہ اس وقفہ میں اس سے خط و کتابت کرتا رہا تھا۔

مرہٹوں کے کردار پر مزید روشنی

مرہٹہ لٹیروں اور ضابطہ خاں کے درمیان مفاہمت ہوگئی۔ اس سے ان کا کردار واضح طور پر سامنے آجاتا ہے وہ آٹھ لاکھ روپیہ کے عوض اس کے سابقہ مقبوضات پر چند پرگنوں کو چھوڑ کر جنہیں انہوں نے اپنے لئے مخصوص کرلیا تھا، دوبارہ قابض کرانے کے لئے تیار ہوگئے اور یقین دلایا کہ اگر وہ اس طرح واپس نہ کئے گئے تو اس پر طاقت سے عملدرآمد کرائیں گے۔ بادشاہ کے پہلی مرتبہ دہلی پہنچنے پر جاٹوں کو دہلی کے آس پاس کے ان پرگنوں سے ہاتھ دھونا پڑا تھا جن پر وہ قابض تھے اس لئے انہوں نے بھی بالکل اسی طرح مرہٹوں سے درخواست کی۔ معقول معاوضہ پر ان سے بھی یہ وعدہ کرلیا گیا کہ ان کے علاقے واپس دلائے جائیں گے۔ انجام کار مرہٹہ سرداروں کی جانب سے مذکورہ پرگنوں کے حکام کے نام ان تمام پرگنوں کو حوالے کر دینے کے احکام جاری کر دیئے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی افواج بھی حرکت میں آگئیں اس لئے بادشاہ کے مامور کردہ حکام نے ان سے دست بردار ہونا ہی مناسب سمجھا۔ چند ہفتوں میں شاہ عالم کے قبضہ میں دہلی کے سوا اور کچھ نہ رہا باقی تمام علاقے ان ہی لوگوں کے قبضہ میں پہنچ گئے جن کے پاس بادشاہ کی آمد اور اس کے مرہٹوں سے اتحاد سے قبل تھے۔

بادشاہ کی مالی پریشانیاں

اس وقت بادشاہ کے لئے حالات نہایت سنگین تھے اس کی فوجیں جو محصولات کی وصولیابی کے لئے اِدھر اُدھر روانہ کردی گئی تھیں، اب پایہءتخت میں جمع تھیں اور اپنی تنخواہوں کے لئے شور مچا رہی تھیں وہ روپیہ جو بادشاہ الہ آباد سے اپنے ساتھ لایا تھا مرہٹوں پر خرچ ہو چکا تھا اور مزید روپیہ کی آمد کے ذرائع مفقود ہو چکے تھے ایسے نازک موقع پر غیر معمولی تدبیر و تدبر درکار تھا۔ مگر بجائے اس کے کہ حسام الدولہ باہمی گفت وشنید کے ذریعہ یا مدافعانہ تدابیر اختیار کر کے اس طوفان کو روکنے کی کوشش کرتا۔ اس نے ان حالات سے وقتی مفاد حاصل کرنا چاہا۔ اس کا مقصد صرف نجف خاں کی تباہی و بربادی تھا دراصل بادشاہ کے دامن سے نجف خاں کی انتہائی وابستگی، آخری مہم کے سلسلے میں اس کا بہترین رویہ اور فوج میں اثر ورسوخ، ایسی باتیں تھیں جن کی وجہ سے حسام الدولہ اسے رشک وحسد کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔

بادشاہ پر وزیر کا اثر

خود بادشاہ کے دل میں نجف خاں کی کافی قدر ومنزلت تھی وہ اپنے وزیر کے ان مقاصد اور منصوبوں کی جن کی گہرائی پر اس نے کبھی غور نہیں کیا بے چون و چرا تکمیل کے لئے اس قدر آمادہ تھا کہ نجف خاں کے اعتراضات اور سمجھانا بجھانا بھی اس کو حسام الدولہ کی مخالفت پر کمر بستہ نہ کر سکا۔ بہر حال شاہی فوجوں کو اس عذر کے ساتھ واپس کر دیا گیا کہ ان کی تنخواہیں ادا نہیں کی جاسکتیں۔

مرہٹوں کو دہلی آنے کی دعوت

مرہٹہ فوج کو حسام الدولہ کی جانب سے دہلی آنے کی دعوت دی گئی اور ان الزامات کو جو مرہٹہ سرداروں نے نجف خاں پر عائد کئے تھے صحیح قرار دے دیا گیا۔

نجف خاں کی تیاری اور مشورہ

نجف خاں آنے والے طوفان سے باخبر تھا اس کا رسالہ بھی خدمات سے سبکدوش کر دیا گیا

تھا۔مگر اس نے اپنے طور پر اسے باقی رکھا بلکہ اس میں ان امراء کی شمولیت کی وجہ سے اضافہ ہوا جنہوں نے اپنی قسمتوں کا سرشتہ اس کے ساتھ ملا دیا اور اس کے الطاف وعنایات اور اس شہرت کے سبب جو اس نے حاصل کی تھی اس کے شریک حال ہو گئے۔اس طرح اس کے پاس 5000 سوار جمع ہو گئے تھے۔وہ بادشاہ کو فوجیں جمع کرنے اور اگر ممکن ہو تو مرہٹہ افواج کو دہلی آنے سے روکنے پر زور دیتا رہا لیکن سب کچھ بے سود ثابت ہوا۔

روہیلے اور مرہٹے دہلی کے قریب

اس درمیان میں مرہٹہ فوج، جاٹوں اور ضابطہ خاں کی سرکردگی میں روہیلوں کو لے کر انتہائی قریب پہنچ چکی تھی ان کے خطرناک منصوبے صاف طور پر ظاہر ہونے لگے تھے اس وقت تک حسام الدولہ بادشاہ کو یہ کہہ کر مطمئن کرتا رہا کہ ان کا مقصد اس کی مخالفت نہیں ہے لیکن دربار میں خوف وہراس کے آثار نظر آنے لگے تھے نجف خاں کو بلایا گیا اور اس سے درخواست کی گئی کہ جس طرح بھی ہو اس بلا کو دور کرے لیکن اب اتنی تاخیر ہو چکی تھی کسی قسم کی گفت وشنید کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا علاوہ ازیں نجف خاں اس قسم کا ارادہ بھی نہیں رکھتا تھا۔وہ تکو کی بدنیتی سے خوب واقف تھا نیز اس کی شرائط ایسی تھیں کہ ان کو تسلیم کرنے پر بادشاہ کے پاس کچھ بھی نہیں رہ سکتا تھا اس لئے مقابلہ کا عزم کیا گیا۔

شاہی افواج مقابلہ پر

شاہی افواج میں صرف دو انگریز بٹالینیں دوسرے دستے، نجف خاں کے رسالے کے سوار اور مدک 13 کا وہ گروہ تھا جو حال ہی میں جاٹوں سے علیحدگی اختیار کر کے دہلی آ گیا تھا اور جس کو نجف خاں نے روک لیا تھا۔اس فوج کو لے کر جس کے پاس جنگی سامان بھی جو حسام الدولہ فراہم نہ کر سکا تھا یا نہیں کرنا چاہتا تھا بہت ناکافی تھا۔نجف خاں نے دہلی سے کوچ کیا اور ایک کوس کے فاصلہ پر جمنا کو بائیں جانب اور پرانے قلعہ کو دائیں طرف رکھ کر پڑاؤ ڈالا جنگ کے لحاظ سے یہ مقام بہتر تھا اور اگر شہر کی دیواروں پر متعینہ سپاہی چشم پوشی سے کام نہ لیتے تو پسپائی کی راہوں کو بھی مسدود نہیں کیا جا سکتا تھا۔

سندھیا کا مشورہ

کہا جاتا ہے کہ ایک مرہٹہ سردار سندھیا دوسرے مرہٹہ سرداروں کے اس طرز عمل سے اتفاق نہیں رکھتا تھا اور اس نے نجف خاں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اس مقام سے نہ ہٹے، بلکہ حالات کا انتظار کرے۔ سندھیا معمولی صلاحیتوں اور معمولی دل و دماغ کا آدمی نہیں ہے بلکہ اس کے کردار میں اپنے وقار کا پاس اور اپنے اصولوں کی پابندی دونوں باتیں نمایاں طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس نے بادشاہ سے کئے ہوئے معاہدے توڑ کر ضابطہ خاں سے عہد و پیمان باندھنے کی سخت مخالفت کی تھی اگر چہ وہ اس پر عمل درآمد ہونے کو نہ روک سکا تاہم اس نے ان کی رائے سے بھی کبھی اتفاق نہیں کیا وہ دوسرے سرداروں کے ہمراہ ضرور آیا تھا مگر اس نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اس جنگ میں اس کی حیثیت ایک تماشائی سے زیادہ نہ ہوگی اور آئندہ کے معاملات میں بھی وہ کوئی حصہ نہیں لے گا اگر چہ اس کے اور تکو کے مابین ایک گونہ کشیدگی تھی، پھر بھی اس کے درمیان میں پڑنے سے شاید معاملات سلجھ جاتے لیکن حالات بالکل بدل چکے تھے۔

پرانے قلعہ کی جنگ

مرہٹے اور ان کے اتحادیوں نے جو نجف خاں کی مختصر سی فوج سے جنوب کی سمت دو کوس کے فاصلے پر ٹھہرے ہوئے تھے، جوں ہی اس کو محاذ قائم کرتے ہوئے دیکھا حملہ کا آغاز کر دیا، شاہی افواج نے جو بہتر مورچہ سنبھالے ہوئے تھیں، انہیں آسانی سے پسپا کر دیا اور وہ اس کامیابی کے نشہ میں چور ہو کر دشمن کا تعاقب کرتی ہوئی اپنے محاذ سے بہت آگے بڑھ گئیں۔ مگر دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ نجف خاں بھی جوش میں آکر بہت آگے تک بڑھتا چلا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے خود کو دشمن کے اعلیٰ قسم کے سواروں میں گھرا ہوا پایا۔ آخر کار اپنے بہت سے ساتھیوں اور اپنے ایک محبوب بھتیجے کو کھو کر بڑی مشکل سے ان کے حصار سے نکلا۔ مدک اور اس کا گروہ بھی جوش میں آکر ان کے تعاقب میں بہت آگے بڑھ گیا تھا اور دشمنوں میں گھر گیا تھا۔ اگر وہ بروقت پرانے قلعے میں جہاں پہنچ کر وہ اس امر پر خوش تھا کہ اپنے گروہ کے کچھ حصے کو صحیح سلامت بچا کر لے آیا ہے، پناہ گزیں نہ ہوتا تو اس کا خاتمہ ہو گیا ہوتا مزید برآں اگر

دوانگریز بٹالین تین شاہی دستوں کو لے کر ثابت قدم نہ رہتیں اور رات کے اوقات میں ہوشیاری اور نظم وضبط سے پسپا نہ ہوتیں تو شکست مکمل طور پر ہوگئی ہوتی۔ انہوں نے ہی نجف خاں کو بچایا جو اپنے بھتیجہ کی موت سے بددل اور اپنی زندگی سے بیزار تھا اسے دشمن پر تنِ تنہا حملہ کرنے سے بہ مشکل تمام روکا گیا۔

وزیر حسام الدولہ کی غداری

آمدِ شب نے پسپائی کو روک دیا اور اس سعی ءناکام کو حسام الدولہ کی غداری پر محمول کیا گیا، کیونکہ اس نے دشمن کو جو سامنے کی جانب پسپا کر دیا گیا تھا بغیر کسی مقابلہ کے شہر کی دیواروں تک پہنچنے کا موقع فراہم کیا وہ نجف خاں کے محاذ تک بہ آسانی پہنچ گئے انہوں نے نجف خاں کے دستے کو گھیرے میں لینے کی کوشش کی، اس واقعہ سے حسام الدولہ ناخوش نہیں تھا اگر اس کا نتیجہ نجف خاں کی موافقت میں ظاہر ہوتا تو نجف خاں کی عظمت وشہرت میں چار چاند لگ جاتے۔

مرہٹوں کی مصالحت کی کوشش

اس کے بعد شاہی فوجوں نے شہر سے نکلنے کی جرأت نہیں کی بلکہ مرہٹوں کو رام کرنے اور معاملات طے کرنے کے لئے گفت وشنید شروع ہوئی سندھیا اس دوران میں خاموش تماشائی کی حیثیت سے دور کھڑا رہا جب یہ تماشا ختم ہوا تو وہ اپنی تمام فوج لے کر اجمیر واپس چلا گیا جو دہلی کے جنوب مغرب میں 140 کوس کے فاصلہ پر اس کا ایک چھوٹا سا صوبہ تھا۔

اب تکو بغیر کسی روک ٹوک کے معاملات کا پورا اختیار رکھتا تھا۔ اس نے اور بساجی نے فاتحین کی طرح شرائط صلح مرتب کرائیں چند دن بات چیت میں صرف ہوئے۔

مرہٹوں کا دہلی میں فاتحانہ داخلہ

مرہٹے اپنے خیمہ وخرگاہ شہر کے قریب لے آئے اور ضابطہ خاں کے ساتھ ایک بڑی فوج کو لے کر نقارے پیٹتے اور پھریرے اڑاتے ہوئے شہر میں داخل ہوگئے۔

مرہٹوں کی گستاخیاں

وہ معہ ہاتھیوں کے اس عظیم دیوان سے گذرے جہاں سے اس طرح گذرنا مروجہ دستور کے خلاف تھا اس قسم کا عز وشرف صرف شاہی خاندان کو حاصل تھا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ دستور کے مطابق کورنش بجالائے لیکن انہوں نے بادشاہ کو مجبور کیا کہ وہ ان کے استقبال کے لئے تخت سے اتر کر فرش پر بیٹھے تاہم اس کے بعد تکواور بساجی نے اسے تخت پر بٹھادیا لیکن تمام گفت وشنید بادشاہ کے لئے تحقیر آمیز تھی۔ مرہٹوں کی جانب سے یہ بہت بڑی گستاخی تھی۔ تمام قلعہ ان کی افواج سے بھرا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے ان کو زنان خانے میں داخل ہونے سے روکا گیا۔

نجف خاں کے خلاف اُبھارنا

مرہٹوں کی مرضی کے خلاف اس دوران میں جو کچھ ہوا اس کا الزام حسام الدولہ نے نجف خاں پر رکھ دیا۔ اس سلسلہ میں اسے مرہٹہ سردار کو ہم خیال بنانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ اس نے مرہٹہ سردار کو خوش کرنے اپنے مقاصد کی تکمیل اور اس کی موافقت حاصل کرنے کے لئے اسے اور بساجی دونوں کو ایک لاکھ روپے فراہم کئے اس کے عوض مرہٹے نجف خاں کو دہلی سے نکالنے اور تمام مال واملاک چھین لینے پر مامور کئے گئے۔ آخر کار یہ مقصد حاصل کرلیا گیا۔

بادشاہ کا فرمان

بادشاہ کی جانب سے ایک فرمان نجف خاں کے نام بھیجا گیا کہ وہ ایک سال قبل امروہہ کو لوٹ کھسوٹ سے بچانے کے سلسلے میں جس رقم کا وعدہ کر چکا تھا ادا کرے۔ نجف خاں سے اس کے باقی ماندہ علاقے پہلے ہی چھینے جا چکے تھے وہ اپنی تمام آمدنی بھی خرچ کر چکا تھا۔ اس لئے اس کے پاس اس مطلوبہ رقم کو ادا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اس نے یہ عذر پیش کیا کہ وہ اپنی فوجوں پر تمام رقم خرچ کر چکا ہے، اس لئے معافی کا خواستگار ہے لیکن اس عذر کو معقول نہیں سمجھا گیا اور ایک بھاری دستک بھیج دی گئی اس سے گلوخلاصی کی سوائے اس کے کوئی صورت نہیں تھی کہ وہ مطلوبہ رقم جو تقریباً 80,000 روپیہ تھی کہیں سے حاصل کرے۔ کچھ رقم احباب کی

جیبوں سے حاصل کی کچھ جواہرات ان کی جھولی میں ڈالے اور کچھ پلیٹیں فروخت کر کے مطلوبہ رقم کو پورا کرنے کی کوشش کی اگرچہ اس میں اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم اس کی گردش اب بھی ختم نہیں ہوئی۔

نجف خاں کو شہر چھوڑنے کا حکم

اسے شہر چھوڑنے کا حکم ملا اور یہ دھمکی دی گئی کہ اگر اس نے بہ رضا و رغبت اس پر عمل نہیں کیا تو اسے طاقت کے ذریعہ مجبور کیا جائے گا۔ اس وقت نجف خاں انتہائی مایوس کن حالات میں گھرا ہوا تھا۔ اس پر یہ واضح ہو چکا تھا کہ صرف اس کی تباہی مقصود ہے اور اس کے علاوہ کوئی چیز حسام الدولہ کو مطمئن نہیں کر سکتی وہ نہایت مایوس و حرماں نصیب تھا۔ اس کا بھتیجہ موت کا شکار ہو چکا تھا۔ وہ خود افلاس کے پنجہ میں پھنسا ہوا تھا۔ اس کے ذرائع آمدنی مفقود تھے اس تباہ حالی میں ایک شجاعت تھی جو اس کا ساتھ نہ چھوڑ سکی تھی۔ اس کے دوست یہ عزم کر چکے تھے کہ اس کے دوش بدوش رہ کر خون کا آخری قطرہ بہا دیں گے۔ انہوں نے بچوں اور عورتوں کو نجف خاں کے مکان کے ایک حصہ میں جمع کر دیا اور ان کے تحفظ کا تہیہ کر لیا انہوں نے یہاں تک سوچ لیا تھا کہ اگر وقت پڑا تو وہ ان کے سینوں میں خنجر اُتار کر دشمن پر ٹوٹ پڑیں گے۔ 1200 آدمیوں کی فوج تیار ہو گئی فوراً مورچے بنانے شروع کر دیئے گئے۔ چھوٹی میدانی توپیں اور رَہکلے راستوں پر نصب کر دیئے گئے۔ اس عرصہ میں حسام الدولہ کی روانہ کردہ فوج نے اس کو چاروں طرف سے گھیر لیا تاہم وہ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے اور اپنی مدد کے لئے مرہٹوں کا سہارا تلاش کرنے لگے۔ پہلے تو مرہٹوں نے اس مقصد کے تحت شہر میں فوج بھیجنے پر اعتراض کیا کیونکہ خطرہ تھا کہ کہیں فوج کو شہر میں لوٹ مار کا موقع ہاتھ نہ آ جائے۔ لیکن اس پر بادشاہ کی ناقابل معافی کمزوری اور حسام الدولہ کی تجویز کے سبب ایک شاہی فرمان پہنچا جس میں نجف خاں کو نکال دینے پر زور دیا گیا تھا۔

مرہٹوں کی مداخلت

مرہٹوں نے مداخلت کی ادھر نجف خاں ضروریات زندگی کی کمیابی کی وجہ سے اس قدر تنگ آ چکا تھا کہ اس نے اور اس کے ہواخواہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو ختم کر کے

شمشیر بکف دشمن کا مقابلہ کریں گے لیکن خوش قسمتی سے اس کو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

نجف خاں پر مرہٹوں کا رحم وکرم

چند مرہٹہ سردار بھی اس کی اس حالت پر رحم کھانے لگے اور اس کی بقاء وسلامتی میں ذاتی طور پر دلچسپی لینے لگے۔ تکو نے اپنی تجاویز اس کے سامنے رکھیں اور اس کے ایک بھتیجے کے ذریعہ اسے تحفظ کا یقین دلایا۔ اس نے مرہٹوں کی تقدس مآب قسموں کا ذکر کر کے جو انہوں نے اس کے سامنے کھائی تھیں نجف خاں کو حویلی چھوڑنے اور دہلی سے نکلنے پر آمادہ کرلیا۔

نجف خاں کی دہلی سے روانگی

یہ کارروائی نہایت سنجیدگی سے کی گئی۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے مغل سپاہیوں کے قلب میں اس کے لئے تعظیم وتکریم کے کیسے جذبات موجزن ہیں۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے تمام احباب وخیر خواہ جن کی تعداد چند ہزار تھی پاپیادہ ہمراہ تھے، انہوں نے اسے چاروں طرف سے گھیرے میں لے رکھا تھا، اس دوران میں وہ وہی نعرہ (یا حسینؓ) لگاتے جاتے تھے، جو شہادت حسینؓ کا سوگ مناتے وقت ایرانی کہا کرتے ہیں اور راستہ میں حسام الدولہ کو بُرا بھلا کہتے جاتے تھے۔ اس طرح نجف خاں قلعہ کے دروازہ تک پہنچا۔ یہاں سے اس نے بادشاہ کے پاس ایک پیغام بھیجا۔ جس میں شرف باریابی کی درخواست کی تھی اور یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ خادم حضور والا کی زبان مبارک سے اپنی برطرفی کا فرمان سننا چاہتا ہے لیکن اس کی یہ درخواست بھی منظور نہیں کی گئی۔14

تکو سے ملاقات

اس کے بعد وہ اسی طرح تکو کے خیمہ پر پہنچا جہاں اس کا نہایت کشادہ دلی اور عزت واحترام کے ساتھ استقبال کیا گیا وہاں یہ طے پایا کہ وہ شہر جائے اور اپنی حویلی میں قیام کرے۔ تین دن بعد اپنے تمام آدمیوں کے ہمراہ پھر واپس آئے۔ تکو نے نجف خاں کے کہلوانے پر کہ اس نے اور اس کے ہمراہیوں نے چند دن سے کچھ نہیں کھایا ہے کچھ رقم اس کے پاس بھیجی اور اپنی ملازمت میں لے لیا۔ پہلے کچھ دن 300 روپیہ اور اس کے بعد 600 روپیہ یومیہ بھیجے۔ مرہٹے اب کلی طور پر دہلی

دربار کے مالک ومختار تھے انہوں نے بادشاہ کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔

ضابطہ خاں کا دوبارہ امیر الامراء ہونا

ضابطہ خاں کو دوبارہ بخشی اول، یعنی امیر الامراء بنا دیا گیا یہ عہدہ اسی سے چند ماہ پیشتر اس سے چھین لیا گیا تھا۔

بادشاہ کے املاک کی لوٹ کھسوٹ

نیز اس کو ان صوبوں کے بڑے حصہ کا قبضہ دیدیا گیا جس پر وہ اس سے پیشتر قابض تھا۔ جاٹ بھی ان پرگنوں پر قابض ہو گئے تھے جو ان سے لے لئے گئے تھے۔ مرہٹے بھی اپنا مفاد نہیں بھولے تھے انہوں نے میرٹھ اور اس سے متصل وہ گیارہ پرگنے لے لئے تھے جو اپنے محل وقوع کے لحاظ سے تمام دوآبہ میں بہترین تھے۔ یہ ان کو شاہی عطیہ کی صورت میں ملے تھے۔ اب مشکل ہی سے بادشاہ کے پاس کچھ باقی رہ گیا تھا۔ اس پر بھی وہ ان مددگاروں بدمعاشوں کو زر و جواہر کی صورت میں عطیات دینے پر مجبور تھا۔ انہوں نے اسے مجبور کر کے الہ آباد اور کڑہ کے اضلاع بھی بطور عطیات لے لئے تھے جو کچھ شاہی تصرف میں رہ گیا تھا وہ منیر الدولہ کے انتظام وانصرام میں تھا۔ موخر الذکر اضلاع کے لئے اگر چہ انہوں نے اسناد حاصل کر لی تھیں لیکن انہیں اتنا وقت نہیں مل سکا کہ وہ ان اسناد کے تحت عملدرآمد کرا سکیں۔

مرہٹوں کی روہیلوں کے خلاف ناکام مہم

کچھ عرصہ بعد مرہٹوں نے دہلی سے کوچ کیا۔ نجف خاں ان کے ہمراہ تھا۔ ان کی مہم روہیلوں کے خلاف تھی۔ مگر روہیلوں کو شجاع الدولہ کی افواج اور ایک بریگیڈ 15؎ کی امداد حاصل تھی۔ مرہٹے کچھ نہ کر سکے گنگا کو دوبارہ عبور کرنے اور بھاگنے پر مجبور ہوئے۔

نجف خاں کی شجاع الدولہ سے خفیہ ملاقات

اس سے قبل جیسے ہی دونوں افواج قریب پہنچیں نجف خاں نے موقع پر کر 16؎ غالباً

شجاع الدولہ اور سر رابرٹ بارکر سے تنہا ملاقات کی اور اپنی خدمات پیش کیں۔ اس نے اپنی اس صورت حال کی پُر اثر انداز میں وضاحت کی ان مصائب کا ذکر کیا جو اس پر گذرے تھے اور اپنے ان نئے آقاؤں سے بیزاری کا اظہار کیا جن کا وہ حکم بحالت مجبوری اور تقاضہء وقت کے تحت ماننے پر مجبور تھا۔

شجاع الدولہ نے اسے فراخدلی سے خوش آمدید کہا اور میرے خیال سے اس نے سر رابرٹ بارکر کی درخواست پر نجف خاں سے اپنی انتہائی دلچسپی کا اظہار کیا۔

مرہٹوں کی دکن کی طرف واپسی

اس کے فوراً بعد مرہٹے دکن کی طرف روانہ ہو گئے کیونکہ انہیں واپس بلا لیا گیا تھا۔ شاید اس کا سبب مرہٹوں میں خلفشار وانتشار تھا جو چھ برس سے زور شور پر تھا۔

نجف خاں شجاع الدولہ کا نائب

شجاع الدولہ حسام الدولہ کے سابقہ رویہ سے بددل تھا، اس نے نجف خاں کو اعزاز بخش کر اپنا نائب بنا لیا۔ اس کے بعد اسے دہلی واپس بھیج دیا، سر رابرٹ بارکر اور اپنی جانب سے بادشاہ کے حضور میں اس کی پُر زور سفارش کی۔ شجاع الدولہ نے اس کے اخراجات کے لئے نقدی بھی دی۔ مختصراً یہ کہ اس کے ساتھ بہتر سلوک کیا۔

نائب کی حیثیت سے دہلی میں ورود

نجف خاں دہلی واپس آ گیا یہاں اسے خوش آمدید کہا گیا۔ بادشاہ نے گلے لگایا اور گذشتہ باتوں کو فراموش کر دیا۔

بادشاہ کی وزیر سے ناراضگی

اس وقت بادشاہ اپنے وزیر حسام الدولہ سے ناخوش تھا اس نے کچھ عرصہ پہلے تین لاکھ روپئے کے جواہرات رہن رکھنے کے لئے دیئے تھے تا کہ مرہٹوں کو وعدہ کے مطابق رقم ادا کر دی

جائے تھوڑے دنوں بعد حسام الدولہ سے ان کی واپسی کے لئے کہا گیا۔ بادشاہ کے کہنے کے باوجود اس نے بہانہ تراشی کی اور کہا کہ وہ انہیں رہن سے کس طرح چھڑائے۔ بادشاہ کو یہ گراں گذرا اور اس نے جلد ہی اپنی ناخوشی کا اظہار کیا بیشتر ملازمین اگر چہ سب نہیں، اعلانیہ اور پس پردہ حسام الدولہ کے دشمن ہو گئے ان میں سے ہر ایک نے اپنی بساط کے مطابق اس کی ٹانگ گھسیٹنے کی کوشش کی۔ اسی دوران میں نجف خاں آ گیا۔ اس کے ساتھ پُر زور سفارشیں تھیں اور کچھ فوجی طاقت بھی ہمرکاب تھی۔ اس نے بادشاہ سے عرض کیا کہ اگر حسام الدولہ کو اس کے قبضہ میں دیدیا جائے تو وہ نہ صرف اس کے جواہرات اس سے واپس دلا دے گا بلکہ کچھ دستوں کے جو شوریدہ سری پر آمادہ ہیں واجبات بھی ادا کر دے گا۔ بادشاہ نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

وزیر حسام الدولہ کی گرفتاری املاک کی ضبطی

حسام الدولہ جب دربار سے باہر آیا تو کسی مزاحمت کے بغیر گرفتار کر لیا گیا۔ نجف خاں کے بیان کے مطابق اس کے مال واملاک کی ضبطی کا اندازہ دس لاکھ روپیہ تھا اور نجف خاں کا یہی بیان اس کے ان تمام کارناموں کی اساس ہے جو اس نے اس وقت سے انجام دیئے ہیں۔

نجف خاں دربار کا طاقت ور امیر

اس وقت نجف خاں دربار کا طاقت ور امیر تھا اور دیوان خالصہ اور بخشی دوم عبدالاحد خاں 17 مقرر ہوا جو اس کا معتمد تھا۔ عبدالاحد نے جو کچھ مانگا اسے ملا۔

وزیر حسام الدولہ کا کردار

اس طرح حسام الدولہ جو ادنیٰ ترین مقام سے اپنی ذاتی صلاحیتوں اور صفات کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے آقا کی اخلاقی کمزوریوں اور دکھتی رگوں کی گرفت کے سہارے بلند مرتبہ پر پہنچا تھا زوال کے گڑھے میں گر پڑا۔ اس نے بادشاہ کے عشرت کدہ کے لئے ملک کے تمام حصوں سے دوشیزاؤں کو فراہم کیا۔ اس میں کوئی قابلیت نہیں تھی۔ کسی قسم کی تعلیم نہیں تھی۔ لکھ سکتا تھا نہ پڑھ سکتا تھا۔ اس پر اس کا رویہ اقتدار حاصل کر لینے کے بعد اس قدر پُر غرور اور گستاخانہ تھا کہ تمام عہدیدار

اور شاہی ملازمین اس سے نالاں تھے اس نے بیشتر ملازمین کو برخاست کیا اور ان کی جگہیں اپنے جیسے آدمیوں سے پُر کیں۔ مختصر یہ کہ جب تک بادشاہ کی نظر کرم اس پر رہی لوگ اس سے ڈرتے اور نفرت کرتے رہے مگر جب بادشاہ کی نگاہیں بدلیں تو کوئی اس کے تغیر حال پر رونے والا نہ تھا۔ تقریباً دو سال وہ قید و بند میں رہا لیکن اس کے ساتھ زیادہ سختی نہیں کی گئی۔ اس کے بعد نجف خاں نے اسے آزاد کر دیا اور کچھ دن بعد امیرانہ طور پر گذر اوقات کے لئے کچھ مقرر کر دیا۔ اس وقت سے وہ نجف خاں کے ساتھ ہے مرہٹے رخصت ہو چکے ہیں۔

جاٹوں کے خلاف مہم

نجف خاں نے شاہی دستوں کو لے کر جاٹوں کے خلاف مہم شروع کی تو قرب و جوار کے بہت سے پرگنوں کو بادشاہ کے قبضہ اور تصرف میں لے آیا۔ شاہی دربار کے حالات پہلے سے بہتر ہونے لگے تاہم میرٹھ اور قریب کے بہت سے بہترین پرگنے ابھی تک مرہٹوں کے قبضہ میں تھے بادشاہ ان کو مرہٹوں کے قبضہ سے نکالنے کی جرأت نہ کر سکا تھا حالانکہ ان کی افواج وہاں موجود نہیں تھیں اور جو آدمی محصولات جمع کرنے کے لئے وہ یہاں چھوڑ گئے تھے ان میں بھی اتنی طاقت نہیں تھی کہ کسی قسم کی مزاحمت کرتے۔

اٹاوہ سے مرہٹوں کا اخراج

1774ء کا آغاز تھا۔ شجاع الدولہ نے اٹاوہ کی طرف پیش قدمی کی اور یہاں سے مرہٹہ فوج کو نکالا۔ یہاں وہ اس بریگیڈ کا انتظار کرنے لگا جس کو ہمراہ لے کر وہ روہیلوں پر حملہ کرنے والا تھا۔

آگرہ پر نجف خاں کا قبضہ

اس دوران میں آگرہ نجف خاں کے قبضہ میں آ گیا تھا۔18؎

ایلچی خاں کی آمد اور اس کی اغراض

اس کے بعد شجاع الدولہ نے اپنے معتمد وزیر ایلچی خاں19؎ کو کافی خدم و حشم کے ساتھ دہلی

دربار روانہ کیا تا کہ وہ بادشاہ کو بہ نفس نفیس میدان میں چلنے اور روہیلوں پر حملہ کرنے کے لئے مجبور کر سکے اگر ایسا نہ ہو سکے تو وہ ان عطیات کے لئے اسناد حاصل کرے جو شجاع الدولہ نے روہیلوں پر حملہ کرنے سے پیشتر خود مہیا کی تھیں۔

ایلچ خاں فروری کے ابتدائی ایام میں دہلی پہنچا۔اس کے ساتھ فوجیں اور رقوم دونوں تھیں۔ اول الذکر کے ذریعہ اس نے دربار میں خوف و ہراس پیدا کیا۔اور موخر الذکر سے بیشتر کو رام کیا۔ اس نے پہلے بادشاہ کے سامنے میدان میں چلنے اور شاہی افواج کی شجاع الدولہ کے ساتھ پیش قدمی کی تجویز پیش کی تا کہ سب ایک ساتھ روہیلوں پر حملہ آور ہوں، اس کے عوض بادشاہ نصف مفتوحہ علاقہ کا مالک ہوگا اور دو لاکھ روپئے اخراجات کے لئے پہلے ادا کر دیئے جائیں گے نیز 10,000 روپیہ یومیہ پیش قدمی کے دوران اور 5000 روپیہ دوران قیام ملتے رہیں گے۔ مال غنیمت کا نصف حصہ بھی بادشاہ کو دیا جائے گا لیکن اس وقت تک اسے روکا جائے گا جب تک کہ بریگیڈ کے واجبات کی کلی طور پر ادائیگی نہ ہو جائے اور وہ مطمئن نہ ہو جائے۔

بادشاہ کا دہلی سے نکلنا اور اچانک واپسی

بظاہر بادشاہ نے ان تمام باتوں کو منظور کر لیا۔مگر بباطن اس کا ارادہ جانے کا نہیں تھا۔اس نے حافظ رحمت خاں 20 سے خط و کتابت جاری رکھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے ان ہنگامہ خیز تجاویز سے اسے باخبر رکھا، تاہم بادشاہ جمنا عبور کرنے اور اس کے مشرقی گھاٹ پر بمقام شاہدرہ قیام کرنے پر مجبور ہو گیا تا کہ یہ معلوم ہو کہ بادشاہ کا ارادہ شجاع الدولہ سے اشتراک و اتحاد کا ہے جو کاس گنج تک بڑھ آیا ہے اور دہلی سے 55 کوس کے فاصلہ پر ہے۔اس کے عوض اسے دو لاکھ روپیہ اور قیام کے دوران 75000 روپیہ وصول ہوئے مگر اس کے بعد اپنی طبیعت کی ناسازی کے خوف سے اچانک قلعہ میں چلا گیا۔

ایلچ خاں کی کامیابیاں

ایلچ خاں نے کچھ دم دلاسہ دے کر اور ڈرا دھمکا کر نیز مال و دولت اور وعدے وعید کے ذریعہ بادشاہ سے روہیلوں کے پورے علاقہ یعنی قنوج اور اٹاوہ کے اضلاع کی اسناد حاصل کر لیں۔

بادشاہ سے ایک دستی تحریر اس امر کی حاصل کی کہ شجاع الدولہ بحیثیت وزیر تمام شاہی معاملات و مفادات کا بلاشرکتِ غیرے مختارکل ہے یہ اہم نکتہ تھا جو شجاع الدولہ کے ذہن میں آیا تھا اگر میرا خیال غلط نہیں ہے تو اس اختیار کے تحت اس نے بنگال کا خراج کمپنی کو اپلیچ خاں کے اثر ورسوخ کی وجہ سے روانہ کیا اور بعد کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا۔ کیونکہ اس کے لئے شاہی سند کا جواز موجود تھا۔ مگر یہ سودا بہت معمولی اور نامناسب قیمت پر کیا گیا۔

شجاع الدولہ کے وعدے اور ان کی حیثیت

لیکن اس معاملہ سے قطع نظر ساڑھے تین لاکھ کے خرچہ، اور بادشاہ کو روہیلوں کے مفتوحہ علاقہ کے نصف دوآبہ میں سے یا اسی کے مساوی بادشاہ کے مقبوضات سے متصل علاقہ پیش کرنے کے پُرخلوص وعدے اور قسموں کے عوض شجاع الدولہ نے دربار سے وہ سب کچھ حاصل کرلیا جس کی اسے ضرورت تھی۔ بعد کو یہ واقعہ بھی منظرِ عام پر آ گیا کہ شجاع الدولہ اس وعدے کے ایفاء کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا محض بادشاہ کو خوش کرنا مقصود تھا۔

ضابطہ خاں پر شجاع الدولہ کا ایک اور کرم

اپلیچ خاں نے دہلی دربار میں قیام کے دوران بادشاہ کو اس امر پر بھی مجبور کیا کہ وہ میرٹھ اور یہاں کے دوسرے پرگنوں کی اسناد جن پر اس کا قبضہ تھا ضابطہ خاں کو عطا کردے۔ ضابطہ خاں ان کو مزارعہ کے طور پر رکھے گا اور بادشاہ کو لگان ادا کرے گا۔ ضابطہ خاں پر شجاع الدولہ کا کرم اس لئے تھا کہ وہ روہیلوں پر اپنے مجوزہ حملہ میں شریک کرنا چاہتا تھا اور ضابطہ خاں نے اس کا وعدہ بھی کرلیا تھا حالانکہ وہ اس کے ہموطن تھے۔ آخر کار مرہٹے اجمیر کے علاوہ ہندوستان کے تمام بالائی علاقوں سے کلی طور پر نکال دیئے گئے۔

نجف خاں کو دہلی بھیجنا

اس عرصہ میں نجف خاں اٹاوہ میں، شجاع الدولہ سے مل کر دہلی آ چکا تھا یہاں اس کا سرد مہری سے استقبال کیا گیا تاہم عبدالاحد خاں کو چالبازیوں کے باوجود بادشاہ کی زیادہ سے زیادہ قربت

حاصل ہوتی جا رہی تھی بادشاہ اور نجف خاں کے درمیان ایلچی خاں کے اثر و رسوخ کی وجہ سے مفاہمت ہوگئی اور اس نے ایلچی خاں کو اس کے مقاصد کے حصول میں مدد دی۔ شجاع الدولہ نے اسی مقصد کے تحت نجف خاں کو بھیجا تھا مفاہمت کرانے کی درخواست کے دوران ایلچی خاں نے عبدالاحد خاں کو بڑی حقارت سے دھمکیاں دیں۔ ان باتوں کا لب لباب یہ تھا کہ اس کا تعلق کسی ذی عزت و ذی وجاہت خاندان سے نہیں ہے۔ بہرطور انہوں نے اپنے گوہرِ مقصود کو پالیا۔ عبدالاحد خاں نے بھی اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے بادشاہ سے کہا کہ وہ ان تمام باتوں کے لئے جو وہ چاہتے ہیں رضامندی ظاہر کردے۔

ایلچی خاں کا دہلی سے رخصت ہونا

اس کے بعد ایلچی خاں دہلی سے رخصت ہوا، اور اس کے کچھ عرصہ بعد ہی یعنی اپریل 1774ء کے اواخر میں نجف خاں بھی دہلی سے چلا گیا۔

روہیلوں کے خلاف مہم

جیسا کہ اس سے پہلے نجف خاں کے بارے میں کہا جا چکا ہے کہ وہ روہیلوں کو زیر کرنے اور فوجیں لے کر شجاع الدولہ کی مدد کے لئے بسولی 21ے کی طرف گیا تھا ضابطہ خاں بھی چند دستوں کو لے کر شجاع الدولہ سے آ ملا۔ کیونکہ اس نے میرٹھ وغیرہ کے محصولات طے شدہ شرائط کے تحت ادا نہیں کئے تھے۔ شاہی آدمیوں نے ان پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ بغیر کسی مزاحمت کے شاہی محصلین کے سپرد کر دیئے گئے تھے۔

بادشاہ کی ایک غلطی

اس وقت شاہی معاملات کسی تابناک مستقبل کا پتہ نہیں دیتے تھے تاہم پہلے کی طرح ناگفتہ بہ بھی نہیں تھے اور اگر وہ غور وخوض سے کام لیتا اور شجاع الدولہ کی اس مہم میں شریک ہو جاتا تو اس میں شک نہیں کہ وہ شجاع الدولہ کے لیت ولعل کے باوجود اپنے لئے بہت کچھ حاصل کر لیتا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے وزیر عبدالاحد خاں نے ایسا کرنے سے اسے باز رکھا اور اس کا یہ

اقدام دانش مندی پر مبنی تھا کیونکہ شجاع الدولہ کی اعلیٰ و برتر صلاحیت وطاقت کی وجہ سے اس کا تمام اثر ورسوخ ختم ہو جاتا۔ پھر یہ کہ بادشاہ کی نگاہ میں اس کی کافی قدر ومنزلت تھی۔ اس لئے اس نے بادشاہ کو ایسا کرنے سے روکا اور اعلیٰ حضرت نے جو ہمیشہ وزیر کی خواہشات کو نہایت اطاعت کیشی سے سنتے تھے، مضحکہ خیز بہانے بنا کر اس سے پہلو تہی کی۔

جب نجف خاں بسولی سے واپس ہوا تو اس نے دہلی کی راہ اختیار کی۔ اس کے ساتھ اپنی فوج کے علاوہ وہ دستے بھی تھے جو شجاع الدولہ نے اس کے ساتھ کر دیئے تھے۔ شجاع الدولہ کی جانب سے اسے خفیہ طور پر یہ ہدایات تھیں کہ وہ اس کے معاملات کی راہ سے عبدالاحد خاں کو ہٹا دے یہ دونوں ہی اس کی بہت سی باتوں سے جن سے صاف طور پر یہ ظاہر تھا کہ وہ ان کے مفادات سے دلچسپی نہیں رکھتا، غیر مطمئن تھے۔ عبدالاحد خاں نے بھی ان سازشوں کو بھانپ لیا تھا جو اس کے خلاف کی جارہی تھیں اس لئے وہ شاہی قلعہ کے قریب سلیم گڑھ 22 میں محصور ہو گیا نیز اس نے نجف خاں اور شجاع الدولہ کی شاہی دربار کی طرف اٹھتی ہوئی حریصانہ نگاہ کو بادشاہ کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ بادشاہ عبدالاحد خاں کو اس کے منصب سے ہٹانے کی ہر کوشش سے اس قدر ناراض معلوم ہوتا تھا کہ نجف خاں کو اس ارادہ سے باز رہنا پڑا کیونکہ یہ بغیر جبر وتشدد کے عمل میں نہیں لایا جا سکتا تھا اور اس جبر وتشدد کا جہاں تک میرا خیال ہے اس کے ارادہ میں شائبہ تک بھی نہ تھا ___ اسی اثناء میں نجف خاں یرقان کے مرض میں مبتلا ہو گیا لیکن جوں ہی صحت یاب ہوا اس نے یہ ہی مناسب سمجھا کہ وہ دربار سے اپنے تعلقات خوش گوار بنا لے اور اپنے اس قیمتی وقت کو جو دہلی میں گذر رہا تھا زیادہ خراب نہ کرے ایک تازہ ملاقات میں جانبین سے احتجاجات اور رقموں کے بعد جس کو مقدس بنانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ دونوں میں صلح صفائی ہو گئی مگر دونوں ہی کے دل میں انتہائی ریاکاری تھی۔ بظاہر بہتر تعلقات قائم کر کے نجف خاں دہلی سے روانہ ہوا۔

تقریباً اسی زمانہ میں دربار میں ایک واقعہ رونما ہوا، جس کو میں اس لئے نظر انداز کر جاتا کہ وہ بادشاہ کے وقار میں اضافہ کا موجب نہیں ہے لیکن یہ ضروری ہو گیا ہے کہ میں ہر وہ بات جو میرے علم میں ہے بیان کر دوں تا کہ اس سے اس کی سیرت وکردار صحیح خدوخال کے ساتھ ظاہر ہو جائے اس سبب سے میرے لئے ان واقعات کا دہرانا ناگزیر ہے۔ اس وقت قاسم علی 23 بالائی صوبوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پھر رہا تھا وہ جے پور سے روانہ ہوا اور دہلی سے تقریباً

20 کوس کے فاصلہ پر پہنچا اور اپنے کسی دوست کے ذریعہ جو دربار میں تھا بادشاہ سے خفیہ گفت وشنید کی۔اس نے بادشاہ کے حضور میں 7 لاکھ روپیہ کی پیش کش کی تاکہ وہ عبدالاحد خاں کی جگہ پر اسے فائز کر دے اور عبدالاحد خاں کو اس کے حوالے کر دے۔کہا جاتا ہے کہ بادشاہ نے اسے منظور کرلیا۔لیکن روپیہ کی وصولی کے سلسلہ میں معقول ضمانت طلب کی جب یہ بات چیت ہو رہی تھی اور ضمانت کا انتظام کیا جا رہا تھا عبدالاحد خاں کو ان معاملات کا علم ہو گیا اور اس نے فوراً ہی اس سے بچنے کی تدابیر بھی اختیار کرلیں۔اگرچہ اس وقت اس کا نہ کوئی زیادہ اعتماد تھا نہ اثر ورسوخ تاہم اس نے قاسم خاں کے لئے جو اس وقت اپنی گفت وشنید کے سلسلہ میں شہر کے قریب آ چکا تھا یہ احکام لے لئے کہ وہ شاہی علاقہ سے نکل جائے۔

بادشاہ نے اس سے انکار کر دیا کہ وہ اس کی پیش کش اور تجویز سے کسی قسم کا اتفاق رائے رکھتا ہے اس نے سارا الزام اپنے دو ملازموں پر رکھ دیا اور وہ فوراً ہی معتوب قرار پائے۔اس طرح یہ واقعہ اختتام کو پہنچا۔

سومبر اسی دوران میں جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے جاٹوں سے علیحدہ ہو چکا تھا اسے عبدالاحد خاں نے دہلی بلایا تھا۔بادشاہ سے خلعت حاصل ہونے پر پانی پت اور دیگر پرگنوں میں بھیج دیا گیا، تاکہ وہ ان کا انتظام سنبھالے۔لیکن وہ وہاں زیادہ عرصہ نہ ٹھہر سکا، سومبر کے شاہی ملازمت میں رکھنے پر عبدالاحد خاں کو اس امر پر متنبہ کیا گیا کہ قوم کے جذبات کو اس سے ٹھیس پہنچی ہے۔اس کے تحت چوتھے مہینہ کے اختتام پر اسے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔اس کے بعد نجف خاں نے بڑے لطف وکرم کے ساتھ اسے بلا لیا۔یہ ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے سب سے پہلے اس کی ملازمت پر دہلی دربار کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی۔

جب شجاع الدولہ نے روہیلوں کے خلاف ضابطہ خاں کو اپنا شریک بنایا تھا تو اس نے پختہ وعدہ کیا تھا کہ روہیل کھنڈ میں جتنے علاقہ پر وہ قابض ہے یعنی پتھر گڑھ، نجیب آباد 24، امروہہ 25 وغیرہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا اور وہ اس کے قبضہ میں رہنے دیا جائے گا لیکن جوں ہی روہیلوں کو شکست ہوئی شجاع الدولہ نے اپنے تمام وعدوں کو فراموش کر دیا اور ضابطہ خاں کے ان تمام علاقوں پر قبضہ کرلیا جو دریائے گنگا کے مشرقی کنارے پر روہیل کھنڈ سے ملے ہوئے تھے۔اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اس نے دہلی دربار میں اس امر کی پُرزور سفارش کی کہ میرٹھ کی اراضی

اور اس سے متصل پر گنے اسے دیدیئے جائیں، 9 لاکھ روپے سالانہ پروہ واگذار کر دیئے گئے یہ 1774ء کے اواخر کا واقعہ ہے۔26

شجاع الدولہ جنوری 1775ء میں فوت ہوا۔ اس کا بڑا بیٹا آصف الدولہ صوبہ اودھ میں جس کو بادشاہ نے کلایو کی مداخلت سے شجاع الدولہ اور اس کے ورثاء کے نام ہمیشہ کے لئے عطا کر دیا تھا۔ حقیقتاً باپ کا جانشین تھا، مگر روہیل کھنڈ کے نئے مقبوضات، دوآبہ اور الہ آباد اور کڑہ کے ضلعے اور منصب وزارت سلطنت کے قدیم دستور کے مطابق سب بادشاہ کو واپس ملنا چاہئے تھا۔ اسی کے تحت شجاع الدولہ کا مال واسباب بھی ضبط ہونا چاہئے تھا۔

لیکن دہلی دربار کی نااہلی اور کمزوری کی وجہ سے آج کل اس قسم کی ضبطی نہیں ہوتی تاہم تیمور کے پُرشکوہ خانوادہ میں بادشاہ کا یہ حق محفوظ تھا۔ شہزادے اور امراء اس کے حضور میں اپنے حقوق کی منظوری اور اپنے مختلف علاقوں پر اپنے اختیارات کو جائز بنانے اور مخصوص خطابات حاصل کرنے کے لئے بادشاہ کے حضور میں درخواستیں پیش کرتے اور اس کا سربمہر فرمان حاصل کرنے میں ہمیشہ فخر محسوس کرتے تھے حالانکہ ہندوستان میں ان میں سے کوئی بھی موروثی حقدار نہیں۔ ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے یہ عام دستور ہے کہ بادشاہ کے حضور میں کچھ رقم جس کو نذرانہ کہتے ہیں پیش کی جاتی ہے یہ رقم دارالسلطنت سے فاصلہ فریق کی طاقت اور اس کے مطلوبہ منصب واعزاز پر منحصر ہوتی ہے۔

آصف الدولہ اپنے باپ کے تمام مقبوضات پر قابض ہونے کے لئے شاہی اسناد اور وزارت کا فرمان حاصل کرنے کا خواہشمند تھا۔ اسے اس بات کا بھی کافی ڈر تھا کہ اس کا دوسرا بھائی سعادت علی خاں 27 اپنے حصہ کا کہیں دعویٰ نہ کر بیٹھے اور روہیل کھنڈ کے ان صوبوں پر قابض نہ ہو جائے، جن کو شجاع الدولہ نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے سے اس کے قبضے میں دے رکھے تھے۔ آصف الدولہ نے ایلیچ خاں کو کچھ رقم کے ساتھ دہلی بھیجا اور دربار سے معاملات طے کرنے کے کلی اختیارات دیدیئے تاکہ وہ مختلف اسناد حاصل کرے اور قلمدان وزارت اس کے لئے تفویض کرائے۔

آصف الدولہ کا نیا مقرب خاص مرتضیٰ خاں 28 ایلیچ خاں کے چلے جانے پر خوش تھا کیونکہ وہ اس کے راستہ میں حائل تھا۔ وہ اور اس کا آقا دونوں اس سے بہت زیادہ خوف زدہ تھے۔

حالانکہ اس خوف کی معقول وجوہ نہیں تھیں۔

ایلچی خاں دہلی پہنچا اور جس مقصد کے لئے آیا تھا اس کے حصول کے لئے فکر مند تھا کیونکہ اس کارگذاری سے اسے اپنے آقا کی نگاہِ لطف وکرم کی توقع تھی لیکن وہ ابھی وہاں پہنچا ہی تھا کہ اس کے مقاصد کے خلاف مرتضٰی خاں کے خطوط و پیغامات عبدالاحد خاں کے نام آنے لگے۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ اس کا یہ معاملہ اس کے اور اس کے ایجنٹوں کے ہاتھوں انجام کو پہنچنا چاہئے۔ اس طرح یہ دونوں ایک دوسرے کے مدمقابل آ گئے لیکن ایلچی خاں کو مرتضٰی خاں پر یہ فوقیت حاصل تھی کہ اس کے پاس نقد رقم تھی جو اس نے شجاع الدولہ کے معتمد علیہ ہونے کی وجہ سے جمع کی تھی اس نے نائب کے سامنے وزارت اور اسناد کے لئے دس لاکھ روپیہ پیش کئے۔ لیکن عبدالاحد خاں فریقین کی التجائیں سُن سُن کر اس قدر اندھا ہو گیا تھا کہ اس نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ ٹال مٹول کے ذریعہ زیادہ رقم وصول کر سکے گا۔ اس نے اس رقم کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور قطعی جواب دینے میں بہت زیادہ لیت ولعل کیا اور غلط طریقے پر بہت تاخیر سے کام لیا۔

ایلچی خاں کے لئے یہ دردسر بن گیا۔ خود اس کے آقا کے دربار میں جو کچھ ہو رہا تھا اس سے اس کا دماغ اور بھی چکرا گیا، اس نے دہلی کو خیر باد کہا اور نجف خاں کے پاس پہنچا، نجف خاں نے اسے خوش آمدید کہا اور بغلگیر ہوا، اس کی وجہ وہ روپیہ تھا جو اس نے نجف خاں کو پیش کیا تھا، اور جو خوش قسمتی سے عین موقع پر اسے ملا تھا۔ 1776ء کا آغاز تھا۔ مرتضٰی خاں کی بدانتظامیوں اور دوسری وجوہ سے آصف الدولہ کی تجوریاں اس حد تک خالی ہو گئی تھیں کہ اس کے پاس وزارت کے حصول کے لئے بادشاہ کی خدمت میں نذرانہ کی لازمی رقم پیش کرنے کو بھی کچھ نہ رہا اور مجھے یقین ہے کہ اس وقت عبدالاحد خاں ضرور پچھتایا ہوگا کہ اس نے ایلچی خاں کے دس لاکھ روپئے کیوں نہ قبول کر لئے۔ وعدوں اور اقرار ناموں کے علاوہ مرتضٰی خاں کے نمائندوں سے کچھ وصول نہ ہو سکا۔ بادشاہ بھی کبھی ایسا ضرورت مند نہیں ہوا تھا جتنا اب تھا۔ ضابطہ خاں نے جیسا کہ گذشتہ سطور میں تحریر ہے میرٹھ اور دیگر پرگنوں میں کاشت کرائی تھی۔ ابتداء میں وہ تقریباً باقاعدگی سے طے شدہ واجبات ادا کرتا رہا لیکن اس کے بعد اس نے پھر وہی بے توجہی برتی اور ایسا بھی کیا کہ کل مقررہ واجبات کے ایک تہائی سے کچھ زیادہ رقم ادا کی۔ اس وجہ سے بادشاہ اور اس کا وزیر اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ اس سے وہ پرگنے واپس لے لے اس مقصد کے لئے وزیر کے ایک بھائی

ابوالقاسم 29؍ کو تمام فوج کے ساتھ جو جمع ہو سکی، بھیجا گیا، یہ فوج چار سپاہی بٹالینیوں 200 سواروں اور کچھ بے قاعدہ پیادوں اور تقریباً بیس ہلکی میدانی توپوں پر مشتمل تھی۔

ضابطہ خاں کے ساتھ روہیلوں کے علاوہ جن کی تعداد 10,000 تھی کچھ سکھ امدادی دستے بھی شامل ہو گئے تھے، دہلی کے شمال مشرق میں تقریباً 30 کوس کے فاصلہ پر 15- مارچ 1776ء کو 30؍ جنگ ہوئی جس میں پہلے شاہی بٹالینوں اور خصوصاً دوانگریز بٹالینیوں نے روہیلہ پیادوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ لیکن جب وہ ایک ٹیلہ کے قریب پہنچیں تو دشمنوں کی کچھ تعداد نے جو اس کے پیچھے چھپی ہوئی تھی یکا یک نکل کر ان بٹالینیوں میں انتشار پیدا کر دیا جو حملہ کے جوش میں آگے بڑھ آئی تھیں، اسی وقت سوار فوج بہت تیزی سے بڑھی اور ان بٹالینیوں کی صفوں کو توڑ کر اندر گھس گئی، شکست مکمل تھی، دو بٹالینیں اپنی توپیں اور 400 آدمی اس میں گنوا بیٹھیں اور بہت مشکل سے ایک چھوٹے سے قلعہ بند شہر میں جو قریب ہی واقع تھا جان بچا سکیں، یہاں انہیں دوسری دو بٹالینیں بھی مل گئیں جو قریب ہونے کے باوجود شکست سے محفوظ تھیں کیونکہ وہ ان کی طرح جوش اور بے قاعدگی سے نہیں بڑھی تھیں۔ تاہم وہ جلد ہی ضابطہ خاں کی فوجوں میں گھر گئیں اور ان کی ناکہ بندی اس طرح کر دی گئی کہ ان کے بچ نکلنے کی کوئی توقع نہ رہی۔ کچھ ہی عرصہ میں غذائی قلت نے ان دستوں کو صلح کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیا۔ انہیں اسلحہ اور توپوں کے ساتھ مگر مال و اسباب چھوڑ کر باہر نکلنے کی اجازت کر گئی۔

شاہی سواروں میں سے بیشتر جنگ کے آغاز ہی میں بھاگ نکلے تھے اور غریب کمانڈر انچیف جو مختلف حیثیتوں سے ایک بہت اچھا اور نہایت فرض شناس شخص تھا، مگر لنگڑا تھا، اس کی پالکی بغیر آدمیوں کے امداد کے حرکت نہیں کر سکتی تھی۔ میدان جنگ میں تنِ تنہا رہ گیا۔ وہ دیگر بٹالینوں سے اتنے زیادہ فاصلہ پر تھا کہ اسے کوئی امداد نہیں پہنچائی جا سکتی تھی۔ اس کس مپرسی کے عالم میں اسے دشمن کے سواروں سے دوچار ہونا پڑا، مگر جب اس نے معافی مانگنے سے انکار کر دیا تو اس کا سر قلم کر دیا گیا، اس طرح یہ مہم جو غلط تجاویز کے تحت اور غلط طریقہ پر لڑی گئی تھی، ختم ہو گئی ضابطہ خاں فتح حاصل کرنے کے بعد اپنی تمام طاقت کے ساتھ آگے بڑھا اس نے نہ صرف ان پرگنوں پر قبضہ کر لیا جن سے وہ شاہی فوج کے ہاتھوں نکالا گیا تھا بلکہ ان پر بھی قابض ہو گیا جو شاہی مقبوضات تھے اور دہلی کے دیواروں کے قریب واقع تھے، اگر قسمت اس موقع پر بادشاہ کا ساتھ نہ دیتی تو

نہ جانے یہ نفرت سے بھرپور پیش قدمی کہاں تک جاری رہتی۔

دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ دہلی دربار نے آصف الدولہ سے وزارت وغیرہ کے عوض یہ بھی طے کیا تھا کہ وہ کچھ دستے بادشاہ کی خدمت پر مامور کرے جو بادشاہ کے حکم کے تابع ہوں اور ان کے اخراجات وہ ہی برداشت کرے۔ آصف الدولہ چونکہ نقد رقم نہیں پیش کر سکتا تھا۔ مگر اس کے پاس فوج کی کثرت تھی، اس لئے اس نے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ بادشاہ کے معاملات میں کتنا مستعد ہے 500 نجیب ایک خواجہ سرا31؎ لطافت کی سرکردگی میں روانہ کئے جو دہلی میں ٹھیک اس وقت پہنچے جب ضابطہ خاں کے مقابلہ پر جنگ ہاری جا چکی تھی۔

لیکن اس وقت اس سے بہتر اور کیا چیز متوقع ہو سکتی تھی اگر چہ لطافت کے پاس ضابطہ خاں کے خلاف لڑنے کا کوئی حکم نہ تھا نہ اس کا کوئی ارادہ تھا تاہم اتنی تعداد پر مشتمل فوج کی موجودگی نے ضابطہ خاں کو پیش قدمی سے باز رکھا اور اسے مصالحت کے لئے سوچنا پڑا، اس کا یہ خیال دانشمندانہ تھا کہ اگر وہ مقابلہ جاری رکھے گا تو ایک کے علاوہ اور بہت سے اس کے دشمن ہو جائیں گے۔ آخر کار معاملات لطافت کے ذریعہ جس کو ضابطہ خاں نے معقول رقم دیدی تھی طے پا گئے جنگ سے پہلے جو صورتِ حال تھی اسے تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن مزارع کی شرائط ضابطہ خاں کے حق میں اور زیادہ نرم کر دی گئیں اس کے علاوہ دو پرگنے اس کے بیٹے کی جاگیر میں دے دیئے گئے اس عرصہ تعطل میں ضابطہ خاں نے ان تمام پرگنوں کے محصولات وصول کر لئے جن پر اس کا قبضہ ہو چکا تھا اور مزارعہ کی بقایا جات کے ساتھ بادشاہ کو روانہ کر دیئے۔ اس طرح یہ معاملہ ختم ہوا32؎ جو دہلی دربار کے لئے بروقت امداد نہ پہنچنے کی صورت میں مہلک ثابت ہو سکتا تھا اس لئے فوج کے علاوہ جو بادشاہ کے پاس مقیم تھی مرتضٰی خاں سے یہ بھی طے کیا گیا تھا کہ وزارت اور اسناد کے عوض پندرہ لاکھ روپیہ نصف بصورت نقدی اور بقیہ ساز و سامان کی شکل میں ادا کرے۔ ان شرائط پر خلعت وغیرہ روانہ کی جائے گی۔ تاہم اب حالات رخ بدل چکے تھے اگر چہ وزیر کی کوئی چال ناکام نہیں ہوئی تھی مگر اب اسے کافی جھکنا پڑا تھا اور بادشاہ کے صرف اتنا گوش گزار کر دینے پر کہ اگر خلعت اور اسناد فوراً روانہ نہ کی گئیں تو لطافت کو واپس بلا لیا جائے گا سب کچھ اس معاوضہ کے بغیر دینا پڑا جو اسے اس سے بہت عرصہ قبل دس لاکھ کی صورت میں مل رہا تھا۔ آخر کار اسی وقت آصف الدولہ وزیر مقرر کر دیا گیا اور اس نے وعدہ کیا کہ جو کچھ پہلے طے ہو چکا ہے اس پر عمل کرے گا۔ مختلف قسم کے

معمولی معمولی تحفے اور چند ہاتھی بادشاہ کو نذر کئے گئے ان کی قیمت دو لاکھ روپئے تھی مگر 4 لاکھ کا اندازہ لگایا گیا، اس وقت سے تا ایندم کوئی بڑی رقم یا نقدی اس ضمن میں موصول نہیں ہوئی، ان معاملات کی تکمیل کے دوران عبدالاحد خاں جو ہمیشہ نجف خاں کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے ذرائع سوچتا رہتا تھا اور جو نجف خاں کا مخالف ہو کر اپنی وعدہ شکنی ذاتی مفاد اور کامیابیوں کے سبب دہلی دربار کے لئے خطرناک ہو گیا تھا ایسا طوفان برپا کیا کہ اگر بخت یاوری نہ کرتا تو یہ واقعی جان لیوا ثابت ہوتا۔

ایک روہیلہ سردار مُلّا رحیم داد خاں 33 نے کچھ کبیدہ خاطری کی بنا پر نجف خاں کی ملازمت چھوڑ دی حالانکہ وہ اس کے ہمراہ اس وقت سے تھا جب وہ پہلی مرتبہ جاٹوں کے خلاف جنگ کے لئے گیا تھا اور اس کی کامیابیوں میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اس کی شجاعت اور مستقل مزاجی نے بعض اوقات دوسروں کے دل میں رشک وحسد پیدا کر دیا تھا دوسرے بہت سے سردار اس کے دشمن ہو گئے تھے، یہی نجف خاں کی ملازمت چھوڑنے اور جاٹوں کے پاس چلے جانے کا سبب ہوا، انہوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اسی زمانہ میں اس نے آگرہ کے جنوب میں دریائے چمبل کے کنارے مدک کے گروہ کو شکست دی۔ مدک کا گروہ اس کے مقابلہ میں اپنی ناعاقبت اندیشیوں کی دیرینہ عادت کی وجہ سے سب کچھ ضائع کر بیٹھا اور مدک بہ مشکل تمام اپنی جان بچا کر لے جا سکا اس کے برخلاف رحیم داد خاں اور اس کے آدمیوں نے اسلحہ اور بہت سی توپوں کے علاوہ کافی مال غنیمت حاصل کیا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد جب رحیم داد خاں نے اپنی توقعات کے مطابق جاٹوں کی جانب سے ہمت افزائی نہیں دیکھی تو اس نے دہلی دربار کی طرف سے موصول ہونے والی تجاویز پر غور کیا اور جلد ہی دارالسلطنت پہنچا۔ جہاں اسے بہت کچھ بنا دیا گیا۔

مُلّا خواہشات کا پتلا تھا۔ اس کے علاوہ نجف خاں سے انتقام کے جوش نے اسے کافی برافروختہ کر رکھا تھا۔ بلکہ اس کا یہ خیال تھا کہ اس کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کیا گیا ہے اس لئے اس نے عبدالاحد خاں کے خیالات سے پورا پورا اتفاق کیا بلکہ وہ اس سے بھی دو قدم آگے بڑھ گیا۔

سونی پت اور پانی پت کے علاوہ اس سے متصل دو پرگنے اس کو اس لئے دیدیئے گئے کہ وہ

ان کی آمدنی سے ان دستوں کے جو اس وقت 7000 پیدل سپاہ اور 3000 ہزار سواروں پر مشتمل تھے، اخراجات برداشت کرے علاوہ ازیں اسے سیاہ وسفید کا اختیار دیدیا گیا۔

اسے کچھ رقم بھی ملی اور اس نے فوراً اپنی مہم کا آغاز کر دیا۔ یہ 1776ء کا واقعہ ہے۔ رحیم داد خاں نے جلد ہی اس کے چاروں پرگنوں پر قبضہ کر لیا اور اختیار کلی کی بنا پر اپنے سپاہیوں کی تعداد کو ان منتشر روہیلوں سے بڑھایا جو اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ اس نے اپنی سرحدوں کی توسیع کی اور جلد ہی قرب وجوار کا بیشتر علاقہ جو نجف خاں کا تھا اپنے تسلط میں لے لیا نجف خاں اس وقت ڈگ کے محاصرہ میں مشغول تھا۔ اس لئے اس کو روکنے کے لئے فوج نہ بھیج سکا۔ اس نے سکھوں کے ان چند گروہوں کو بھی شکست دیدی جنہوں نے مزاحمت کی کوشش کی۔ بے مثال طاقت اور عزم سے اس نے صرف دو ماہ کے عرصہ میں ایک وسیع علاقہ کو پامال کر ڈالا اس نے نجف خاں سے ہانسی اور حصار کے بہترین علاقے بھی لے لئے اور ایک اچانک حملہ کر کے محمد بشیر خاں کو جو اس وقت نجف خاں کی ملازمت میں تھا۔ شکست دی اور اس سے سب کچھ چھین لیا۔ مختصر یہ کہ رحیم داد خاں ہر جگہ کامیاب ہوا، اور اس نے نجف خاں کو بہت تنگ کیا۔

اس نے امر سنگھ پر حملہ کیا جو سکھوں کی سرحد پر واقع ایک علاقہ کا طاقت ور زمیندار تھا اور جس نے خود بھی ان کا مذہب اختیار کر لیا تھا۔ رحیم داد نے اس کے علاقہ کو تاخت وتاراج کیا اور کئی مالدار شہروں پر قبضہ کر کے بہت سا مال غنیمت جمع کیا، اس کی پیش قدمی بڑھتی رہی اور یہ کہنا مشکل تھا کہ اس کے قدم کہاں ٹھہریں گے اگر قسمت ساتھ نہ دیتی اور نجف خاں کے مقابل سے اسے ہٹا نہ لیتی تو نجف خاں کے لئے وہ ایک ایسا دشمن ثابت ہوتا جو اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ حال ہی میں رحیم داد خاں نے ایک معمولی زمیندار گجپت سنگھ کے جو امر سنگھ کا رشتہ دار تھا صدر مقام جیند 34 کا محاصرہ کر لیا تھا اور اس کے محافظ دستے سے شہر حوالہ کر دینے اور کچھ رقم ادا کرنے پر بات چیت کر رہا تھا۔ رحیم داد خاں کے سپاہی مال غنیمت سے لدے پھندے کسی دشمن کی آمد سے بے خوف اور تیاری کے بغیر اِدھر اُدھر منتشر مختلف علاقوں میں تھے۔ علی الصباح 500 سکھوں کے ایک گروہ نے جو اس مقام کو اگر ممکن ہو سکے تو بچانے کے لئے راتوں رات جیند پہنچ کر، اچانک حملہ کیا۔ رحیم داد خاں نے اپنے کچھ آدمیوں کو لے کر جنہیں وہ فی الفور جمع کر سکا تھا، اس گروہ کو پیچھے ہٹا دیا، لیکن ان کا تعاقب کرتے ہوئے جب وہ شہر کی دیواروں تک پہنچ گیا تو تین گولیوں سے جو اس کے سر اور

جسم میں پیوست ہو چکی تھیں سخت زخمی ہو گیا، سردار کی نبضوں کے چھوٹتے ہی سپاہیوں کی ہمت بھی چھوٹ گئی۔ روہیلے آن واحد میں منتشر ہو گئے تمام مال غنیمت جو اس سے قبل جمع کر چکے تھے ان سے چھین لیا گیا اور جو کسی طرح زندگی بچا سکے ان کے جسم سے ان سکھوں اور دیہاتیوں نے کپڑے تک اتار لئے اور برا سلوک کیا جو ایسے موقعوں پر ہمیشہ فاتح کے ساتھ ہو جاتے ہیں وہ روہیلوں سے اپنے مصائب کا انتقام لینے میں مسرت محسوس کر رہے تھے۔ عام طور پر ایسے لوگ بڑے بے رحم ہوتے ہیں غرض کہ اس طرح ایک جواں مرد اور جواں ہمت سردار رحیم داد خاں موت سے ہمکنار ہو گیا، کہا جاتا ہے کہ وہ ایک با اصول، وعدہ کا پابند مذہبی اور متشرع انسان تھا۔

امر سنگھ سکھوں کو لے کر فوراً رحیم داد خاں کے مفتوحہ علاقہ پر قابض ہو گیا اور اس وقت تک مسلط رہا جب تک نجف خاں نے ڈگ فتح کر کے نجف قلی خاں 35 کو ایک معقول فوج کے ساتھ اس علاقہ میں روانہ نہ کر دیا۔ کئی بار کی گفت وشنید کے بعد امر سنگھ نے نجف خاں کو اس کا علاقہ واپس کر دیا۔ شاہی پرگنے بھی وزیر کی جانب سے امر سنگھ اور اس کے رشتہ داروں کو کچھ مراعات دینے پر واپس کر دیئے۔ رحیم داد کو یہ شکست 1776ء میں ہوئی۔ دہلی دربار کو اس وقت دو زبردست حادثات سے دوچار ہونا پڑا۔

وزیر کے متعدد مخالفانہ اقدامات سے نجف خاں انتہائی دل برداشتہ ہو چکا تھا۔ اگرچہ وزیر نے بظاہر دوستانہ مراسم قائم رکھے مگر وہ ہمیشہ اس کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتا رہا اور پسِ پردہ اس کے دشمنوں کو اس کے خلاف اُبھارتا رہا۔ مگر اس مرتبہ جب اس کی حکمت عملی بری طرح ناکام ہوئی تو عبدالاحد خاں (وزیر) کو یہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑا کہ نجف خاں سے جو ڈگ فتح کر کے کافی طاقت ور ہو چکا تھا اور اب انتقام لینے کے لئے آزاد تھا بہتر تعلقات قائم کر لئے جائیں۔ اس نے تمام الزامات رحیم داد خاں پر رکھ دیئے۔ گذرے ہوئے واقعات پر موقعہ کی مناسبت سے بہترین طریقہ پر رنگ آمیزی کر دی گئی۔

خود وزیر نے نجف خاں کے پاس جانے کا ارادہ کیا اور اسے بادشاہ کی ہمرکابی اور ضابطہ خاں کی باغیانہ روش کا انتقام لینے پر آمادہ کرنا چاہا۔ لیکن اس کی راہ میں ان دو انگریز بٹالینوں کی وجہ سے رکاوٹ پیدا ہو گئی جن کو وہ الٰہ آباد سے اپنے ساتھ لایا تھا، دونوں بٹالینوں نے ابتداء میں نظم وضبط قائم رکھا اور کافی اچھا طرزِ عمل اختیار کیا مگر وہ جلد ہی دل برداشتہ ہو گئیں، ان کے کمانڈر

بھی بہت برگشتہ تھے مزید برآں انہیں سازشوں پر اُبھارا گیا جس کی وجہ سے وہ سرکش ہوگئیں۔ان کی تنخواہیں بھی معقول نہیں تھیں اور جب سے انہیں ضابطہ خاں کے مقابلہ پر شکست ہوئی تھی۔وزیر نے ان سے بے توجہی برتنا شروع کردی تھی۔جس کا واضح مقصد یہ تھا کہ انہیں حقیر اور بے حقیقت ثابت کر دیا جائے ان وجوہ کے تحت جب عبدالاحد خاں دہلی سے باہر نکل کر ڈگ جانے والا تھا تو دونوں بٹالینوں نے اس کے ہاتھی کو چاروں طرف سے گھیر لیا اسے اترنے پر مجبور کیا اور ایک دستہ کی نگرانی میں اسے ایک قریبی مسجد میں اس وقت تک رکھا جب تک اس نے بقایا جات کی جو تقریباً 80,000 روپیہ ہوتے تھے پوری پوری ضمانت نہ دیدی اس معاملہ نے وزیر کی مجوزہ ملاقات میں رکاوٹ پیدا کردی۔بٹالینوں کو یہ رقم ادا کردی گئی،اور انہیں ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔

اگر چہ عبدالاحد خاں باغیوں کے غلط رویہ سے کبیدہ خاطر ہوا مگر میرا خیال ہے کہ یہ باطن وہ ان سے نجات پا جانے کے اس موقع سے خوش تھا۔انتظامی امور میں ناکامی کے باوجود اس کی گرویدگی بڑھتی جا رہی تھی وہ یہ چاہتا تھا کہ تمام افواج اس کے اور اس کے آدمیوں کے تابع ہوں۔دونوں بٹالینیں وزیر کی نظروں میں اس لئے بری تھیں کہ وہ پورے طور پر بادشاہ کے حکم کی پابند اور اس کے احکام کو بجالانے میں مستعد تھیں یہ جرم وزیر کو ان سے متنفر کرنے کے لئے کافی تھا۔

غرضکہ نجف خاں سے ملاقات کی تجویز ان کی سرکشی کی وجہ سے تشنۂ تکمیل رہ گئی۔تاہم بادشاہ اور وزیر دونوں کسی نہ کسی طرح نجف خاں کا تعاون حاصل کرنے کے خواہش مند تھے تاکہ وہ اسے ضابطہ خاں کی تادیب وتنبیہہ پر مامور کریں۔دوستانہ ماحول میں نامہ و پیام جاری رہا نجف خاں بھی جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں بعض وجوہ کی بنا پر ضابطہ خاں سے مطمئن نہیں تھا،اس نے بھی دست تعاون بڑھایا اور کہلا بھیجا کہ وہ اپنی تمام فوج کے ساتھ دہلی آئے گا،اسے دوآبہ کے چند سرکش زمینداروں کو زیر کرنے میں کچھ وقت لگا۔وہ شاہی خیمہ میں جو اس وقت دریائے جمنا کے مشرقی کنارے پر تھا۔فروری 1777ء سے قبل نہ پہنچ سکا۔

ابتداء میں اس کے ارادوں میں تذبذب پایا جاتا تھا۔اس بات سے سب ہی آگاہ تھے کہ وزیر نے اس کے ساتھ کتنا ناروا سلوک کیا ہے اور اگر اس کی فطرت میں جذبہء انتقام ہوتا تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ عبدالاحد خاں سے اپنے ان تمام مصائب کا بدلہ لے سکتا تھا جو اس نے اس کی

حکمت عملی کی وجہ سے اٹھائے تھے اس کے معتمدین اور عمائدین نے اسے اس کے لئے بھی مجبور کیا کہ وہ عبدالاحد خاں کی آمد پر اسے گرفتار کر کے ٹکڑے ٹکڑے کرا دے۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ نجف خاں نے اس تجویز کو پہلے ہی ٹھکرا دیا تھا اور یہ کہہ دیا تھا کہ اگر عبدالاحد خاں پھر در پئے آزار ہوا تو وہ علانیہ اس پر ہاتھ ڈالے گا دھوکے اور فریب سے نہیں۔ عبدالاحد خاں بھی اپنے دل میں اس کی طرف سے خوف زدہ تھا مگر اس نے خود کو اس عمدگی سے قابو میں رکھا ایسے مستحسن طریقہ پر بچایا اور اپنے سابقہ کردار کی ایسی توجیہات پیش کیں کہ نجف خاں جو دل کا برا نہیں ہے دل صاف کر بیٹھا، دونوں جانب سے ازسرِ نو عہد و پیمان ہوئے۔ عبدالاحد خاں نے اسے مطمئن کرنے کے لئے دوآبہ کے ان چودہ پرگنوں کی آراضی زیر کاشت دیدی جو اس کے مقبوضات سے متصل اور بادشاہ کے ذاتی اخراجات کے لئے مخصوص تھے۔

نجف خاں شاہی کیمپ کی طرف جا رہا تھا (اثنائے راہ) یہ بہانہ بنا کر کہ ان پرگنوں میں بغاوت کے آثار ہیں (اس میں حقیقت بھی تھی) اپنا قبضہ جما لیا اور اس فصل کی آمدنی وصول کرنے کے علاوہ چند مالدار اور طاقت ور زمینداروں کو اپنی گرفت میں لے لیا اور ان کی آزادی کے عوض ان سے بھاری رقوم وصول کیں۔ پہلے تو اس قسم کے اقدامات سے دربار میں بے چینی پھیل گئی کیونکہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اس کا انجام کیا ہوگا لیکن بادشاہ کے حضور پہلی باریابی میں نجف خاں نے بادشاہ سے کچھ اس طرح کہا سنا اور اپنی وفاداری کا اظہار اور عبدالاحد خاں کے خوف کے تدارک کا ذکر اس طرح کیا کہ بادشاہ نے ان پرگنوں کو بطور جاگیر سات لاکھ روپیہ کے عوض اس کے نام لکھ دیا۔ اگرچہ یہ ان کے اصل تخمینہ کے نصف کے برابر بھی نہیں تھی۔

اس کے بعد ضابطہ خاں کے خلاف وہ مہم شروع ہوئی جس کا ذکر نجف خاں کے سلسلہ بیان میں آچکا ہے۔ 36 ضابطہ خاں سے چھینے ہوئے پرگنے معاہدہ کے بموجب فوراً ہی شاہی افسران کے قبضہ میں آجانا چاہئے تھے لیکن نجف خاں کو جس کی سرکردگی میں ایسی بہت سی افواج تھیں جن کو پوری تنخواہیں نہیں مل سکی تھیں ان کے شرانگیز مطالبات کو مجبوراً ان پرگنوں کی آمدنی دے کر پورا کرنا ضروری تھا جو جنگ کے بعد وعدہ کے ایفاء کے طور پر بادشاہ کو واپس کرنا تھے تاہم ایسا نہ کیا جا سکا اور اس کی وجوہ وہی تھیں جو بتائی جا چکی ہیں۔ غوث گڑھ کی لوٹ کا مال جس میں بادشاہ کا کافی حصہ تھا نجف خاں اور اس کے لٹیرے سرداروں نے سمیٹ لیا۔ ان باتوں نے بادشاہ کو بہت زیادہ بددل

کر دیا مگر عبدالاحد خاں کی جبیں پر جس کا ضابطہ خاں کی جانب سے جذبہء انتقام ٹھنڈا ہو چکا تھا ذرا بھی شکن نہ آئی۔ وہ نجف خاں سے حسد رکھتا تھا۔ اس کی کامیابیوں سے جلتا تھا، علاوہ ازیں اس کی افواج کے متعلق اس کی رائے نہایت حقارت آمیز تھی اس کا خیال تھا اور یہ حقیقت ہے کہ اس جنگ میں اس نے کوئی شاندار کردار ادا نہیں کیا۔ بادشاہ نے اس کے دہلی آنے پر زور دیا اور اس کی درخواستوں کے باوجود جوان علاقوں میں کچھ عرصہ اور ٹھہرنا چاہتا تھا، بادشاہ نے اپنے حکم کی تعمیل کرائی۔ دہلی آ کر اس نے رخصت کی اجازت چاہی اور 1777ء کے ماہ دسمبر میں بڑی خاموشی سے دہلی سے روانہ ہوا۔

اس وقت سے 1778ء تک سوائے اس کے کہ مچھیری راجہ سے جو بادشاہ اور اس کے وزیر کی سرپرستی میں طاقت حاصل کرنا چاہتا تھا اور خفیہ طور پر بات چیت کر رہا تھا کوئی اہم واقعہ رونما نہیں ہوا راجہ نے ماہ اپریل میں اپنے وکیل کو کافی خدم وحشم اور عمدہ تجاویز کے ساتھ دربار میں بھیجا۔ وہ بادشاہ کے دل و دماغ پر اس قدر چھا گیا تھا کہ بادشاہ خود میدان میں آنے پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن وہ زیادہ دور نہیں گیا شہر سے دو کوس کے فاصلہ پر تقریباً ایک ماہ خیمہ زن رہنے کے بعد بادشاہ واپس آ گیا اور وکیل بھی جلد ہی اپنے آقا کے پاس چلا گیا دونوں جانب مساویانہ حد تک ریاکاری پائی جاتی تھی، بادشاہ سے رقم کا وعدہ کیا گیا تھا، غالباً پہلی منزل پر دو لاکھ روپے اور آگے کی منازل پر 4 لاکھ روپیہ مزید طے ہوئے تھے، مگر پہلی ہی منزل پر رقم کے معاملہ میں حیل و حجت ہو گئی اور رقم پھر کبھی ادا نہ کی گئی۔ اس پر دربار نے سرد مہری اختیار کر لی، اور درباریوں کو راجہ جیسی قابلِ رحم ہستی کے خالی الفاظ اور محض وعدوں پر نجف خاں سے کھلم کھلا مخالفت کے نتائج پر سنجیدگی سے سوچنا پڑا۔ اس میں سب سے اہم نقطہ یہ تھا کہ راجہ کو یہ شک وشبہ ہو گیا کہ وزیر نے اسے اپنا آلہء کار بنایا ہے، اس لئے وہ اس وقت تک روپیہ نہیں دے گا جب تک اس کے صلہ میں کچھ نہ ملے اور دربار میں اس کے لئے زیادہ سے زیادہ خلوص نہ ہو۔ وکیلوں کے رخصت ہونے کے بعد عبدالاحد خاں نے اپنی کارگذاری جتانے کے لئے اس تمام کارروائی کی اطلاع دی کہ اس نے مچھیری راجہ سے کس طرح رقم اینٹھنے کی کوشش کی اور اس نے کس طریقہ سے راجہ کو موہوم اُمیدوں کے سہارے خوش فہمی میں ایک عرصہ تک مبتلا رکھا۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ نجف خاں اس معاملہ کی حقیقت سے پوری طرح واقف تھا۔ 1778ء کے موسم برشگال کے فوراً بعد بادشاہ نے پھر کوچ کیا۔ بہانہ یہ تھا کہ وہ

ان چند سرکش زمینداروں کی تادیب کے لئے نکلا ہے جنہوں نے واجبات ادانہیں کئے ہیں اور اجمیر میں مشہور بزرگ کی درگاہ 37؎ کی زیارت بھی کرے گا۔ گمان غالب ہے کہ ابتداء میں پیش قدمی کی اپیل مچھیری راجہ کے معاملات میں مداخلت تھی جو ابھی تک ایسی مصیبت میں مبتلا نہیں ہوا تھا جیسا کہ نجف خاں کی دھوکہ بازی سے بعد کو پھنس گیا تھا۔ بادشاہ اپنی فوج کے ساتھ آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا اس لئے وہ سال کے آخر حصہ میں نارنول پہنچا جو دہلی سے 50 کوس کے فاصلہ پر جے پور جانے والی شاہ راہ پر واقع ہے اس مقام پر پہنچنے سے کچھ ہی عرصہ قبل مچھیری راجہ کے المناک حادثہ کی اطلاع موصول ہوئی جو دربار کے لئے خبر بد تھی تاہم وزیر نے اس سے کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھانے کا ارادہ کیا اور فوراً ہی اِدھر اُدھر کے قریبی پرگنوں پر جو راجہ کے قبضہ میں تھے قبضہ کر لیا۔ نارنول کا علاقہ بھی جو کبھی بڑا دولت مند، قابلِ توجہ اور شاہی خالصہ کی حیثیت رکھتا تھا، مگر آخر میں راجہ جے پور کے تصرف میں چلا گیا تھا، بغیر کسی مزاحمت کے قبضہ میں آ گیا، اس طرح بادشاہ ایک نئے انداز سے سامنے آیا۔ وہ یہ خیال کر رہا تھا کہ تمام فتوحات اس کی اپنی اور اس کی افواج کی حاصل کردہ ہیں، نجف خاں سے آئندہ کے لائحہ عمل کے متعلق دوستانہ ماحول میں گفتگو ہوئی۔ بادشاہ کا اس قدر قریب ہونا اور مقبوضات میں توسیع اس کے معاملات میں حارج ہونے لگی۔ بار بار اسے شاہی کیمپ میں حاضری دینے کے لئے طلب کیا گیا بادشاہ نے جے پور جانے اور وہاں سے مشہور بزرگ خواجہ معین الدینؒ کے مزار پر حاضری کے لئے اجمیر جانے کا ارادہ بھی ظاہر کیا اس وقت دربار میں اس کی حاضری کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن اس کی آمد پر اس پردے کے چاک ہونے کا بھی ڈر تھا جو اس نے بمشکل تمام اپنے ارادہ پر بظاہر ڈال رکھا تھا۔ نجف خاں نے بادشاہ کی خدمت میں بہت جلد حاضر ہونے کا وعدہ کر لیا، لیکن اس دوران میں وہ مچھیری راجہ کے زیادہ سے زیادہ پرگنوں پر جو اس کے قریب تھے قبضہ کرتا رہا اور اس سلسلہ میں اس نے وزیر کی دست درازی سے قبل ہی ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی۔

دریں اثناء بادشاہ کی پیش قدمی جے پور کی طرف جاری رہی یہاں تک کہ جنوری 1779ء کے وسط میں وہ صرف چند کوس کے فاصلہ پر رہ گیا۔ یہاں کے راجہ کو بادشاہ کے حضور میں آداب شاہی بجالانے اور نذرانہ پیش کرنے کے لئے طلب کیا گیا طلبی نے راج کمار کوشل رام کو جو انتظامی امور میں نوجوان راجہ کی نیابت کرتا تھا ــــــ بڑی الجھن میں ڈال دیا وہ خود دہلی دربار پر اعتماد نہیں

رکھتا تھا۔اس سے نجف خاں کی دل آزاری کا بھی ڈر تھا،اس اقدام میں اسے اپنی کمزوری اور راجپوت دشمنوں کا بھی خوف تھا جن میں سے بہت سے بادشاہ سے مل چکے تھے۔یہ بھی مناسب نہیں تھا کہ دربار کی جانب سے طلبی پر انکار کر کے اس کی مخالفت مول لی جائے۔اس لئے اس نے نجف خاں سے درخواست کی۔اس نے اور راجہ دونوں نے اسے نہایت ملتجیانہ طور پر اپنی مدد کے لئے بلایا۔

نجف خاں نے جو یہاں سے زیادہ فاصلہ پر نہیں تھا امداد کا وعدہ کر لیا۔دونوں نے اپنی پگڑیاں ایک دوسرے سے تبدیل کیں یہ اس ملک میں ایک دوسرے کو بھائی بنانے کا ایک طریقہ ہے نیز اسے مشورہ دیا کہ وہ ٹال مٹول سے کام لے اور اس وقت تک بادشاہ کے حضور میں نہ پہنچے جب تک وہ خود بادشاہ کے پاس نہ پہنچ جائے۔اس کے بموجب وزیر کو راجہ کی آمد کے وعدوں سے اس وقت تک خوش کیا جاتا رہا۔جب تک نجف خاں شاہی کیمپ میں داخل نہ ہو گیا وہ جنوری کے اواخر میں پہنچا تھا۔نجف خاں اپنی افواج کا بیشتر حصہ اپنے ساتھ لایا تھا۔اسے عبدالاحد خاں پر اعتماد نہیں تھا کیونکہ وہ کسی ڈر اور خوف کے بغیر اس کا ہمنوا نہیں بن سکتا تھا۔ان کی ملاقاتیں ظاہرداری پر مبنی تھیں وہ ایک دوسرے سے ایسے دوستانہ طریقہ پر ملے گویا ان کے تعلقات نہایت خوش گوار ہیں ہندوستانی شہزادے اپنے جذبات کو بڑی خوبصورتی سے چھپالیا کرتے ہیں۔بادشاہ نے بڑی کشادہ دلی اور عزت واحترام سے شرف باریابی بخشا۔نجف خاں نے اس ظاہرداری پر اعتماد کرنے میں بہت زیادہ احتیاط برتی اور بادشاہ کی قیام گاہ پر اپنے اتنے بڑے محافظ دستہ کی معیت میں آیا جو ہر قسم کے حادثہ کا مقابلہ کر سکتا تھا اس سے قبل وہ کبھی اس طرح نہیں آیا تھا۔پہلی ہی ملاقات میں نجف خاں کی فوجی برتری اور اس کا اثر ورسوخ ظاہر ہو گیا،نیز اس کے ارادے بھی واضح تھے۔ان میں سے بہت سے راجپوت جو وزیر کے گرد جمع ہو گئے تھے اس کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے کیونکہ اب وہ اس سے زیادہ طاقت ور کے حضور میں اپنی حاضری حفظ ماتقدم کے طور پر ضروری خیال کرتے تھے جے پور کا راجہ اور اس کا ولی بغیر نجف خاں کے توسط کے کچھ کرنا نہیں چاہتا تھا۔یہاں تک کہ وزیر نے بھی خود کو مجبور پایا کہ وہ اپنا دربار وہیں سجائے اور نجف خاں کو مجبور کرے کہ وہ بادشاہ سلامت سے یہ اعزاز حاصل کرے اس میں مداخلت کر کے راجہ کو آمادہ کرے کہ وہ خدمت عالی میں حاضر ہو اور نذرانہ پیش کرے۔

نجف خاں اس پر آمادہ ہو گیا اس کی مداخلت سے گفت وشنید ہوئی جس میں یہ قرار پایا کہ راجہ 8 لاکھ روپیہ 38ء بطور نذرانہ پیش کرے اس کے بعد اسے شرفِ باریابی حاصل ہوگا، اور وہ اپنے صدر مقام پر رہ سکے گا۔ ان 8 لاکھ میں سے بعد کو 2 لاکھ روپیہ شاہی کیمپ کے قرب وجوار کی تباہی اور دوران پیش قدمی جو نقصانات ہوئے تھے اس کے عوض کاٹ لئے گئے باقی چھ لاکھ میں سے دو لاکھ روپیہ نجف خاں کا حصہ طے پایا، اس طرح بادشاہ کا حصہ صرف 4 لاکھ روپیہ رہا، اس میں سے دو لاکھ بڑی مشکل اور بیحد تاخیر سے ملے اور ان میں سے بھی ایک لاکھ نقد اور ایک لاکھ مختلف سامان کی صورت میں۔ باقی 2 لاکھ جیسا کہ میرا اندازہ ہے آج تک ادا نہیں کئے گئے اور اب اس کی زیادہ امید بھی نہیں کی جا سکتی۔ اس رقم میں حصہ کے علاوہ نجف خاں نے اپنے اور اپنے دوستوں کے لئے راجہ سے کچھ خفیہ معاہدے بھی کئے تھے اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس نے راجہ کو 12 لاکھ روپے کے اس خراج کا بقایا ادا کرنے پر مجبور کیا جو اس کے ولی نے سالانہ ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مزید یہ بھی طے ہوا کہ جے پور کے 3,000 سواروں کا دستہ ہمیشہ اس کے ہمرکاب رہے گا، غرضکہ نجف خاں نے اس مہم کے تمام مفادات خود حاصل کر لئے۔ وزیر کو نارنول اور دوسرے پرگنے جو اس نے راجپوتوں سے چھین کر اپنے قبضہ میں لے لئے تھے، انہیں ہی واپس کرنا پڑے۔

اس وقت نجف خاں کا اثر ورسوخ اور اس کی برتر طاقت جس شان سے سامنے آئی شاید کبھی نہیں آئی تھی، شاہی فوج کی تعداد لطافت کے دستوں کو علیحدہ کر کے کچھ کم نہیں تھی اس کے پاس تقریباً 7000 پیدل اور 2000 سواروں کے علاوہ تین بٹالینیں سپاہیوں کی تھیں، توپ خانہ اس کے علاوہ تھا بہرکیف سبب کچھ بھی ہو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پورے دربار پر اوس پڑ گئی ہے۔ سب ہی آنکھیں بند کئے ہر ایک بات کے لئے نجف خاں پر اعتماد کئے بیٹھے تھے۔ مچھیری راجہ سے جو پرگنے چھینے گئے تھے، ان میں سے بہت سے نجف خاں کو دیدیئے گئے۔ نجف خاں نے اس کے عوض یہ وعدہ کیا کہ میرٹھ اور دو پرگنے چھوڑ کر باقی وہ سب پرگنے جن پر بادشاہ کا قبضہ تھا مگر ضابطہ خاں سے چھین لینے کے بعد نجف خاں کے قبضہ میں تھے بادشاہ کو واپس کر دے گا، ___ دو پرگنے سومبر کے قبضہ میں تھے ان کے لئے بھی اس نے یہ کہہ دیا تھا کہ وہ ان کے بدلہ میں مساوی علاقہ دے گا۔ اس مہم سے دربار کو صرف یہی حاصل ہوا تھا، اس کے علاوہ ریواری کے گردونواح کے چند

پر گنے جو میوات کے علاقہ میں تھے، بادشاہ کے حصہ میں شامل کر دیئے گئے تھے، یہ کئی سال سے آزادانہ روش اختیار کئے ہوئے تھے، اب ان کو کچھ راہ راست پر لایا گیا تھا۔ اس کے بعد شاہی کیمپ دہلی کی طرف حرکت میں آیا۔ اجمیر کا سفر نجف خاں کے کہنے سننے پر ملتوی کر دیا گیا کیونکہ وہ بادشاہ کے لئے اسے نامناسب سمجھتا تھا۔ اس نے اس خطرہ کو کہ کہیں راجپوت مرہٹوں سے ساز باز کر کے جو اس صوبہ پر قابض تھے بادشاہ کی راہ میں مزاحمت پیدا کریں، اور تکلیفیں پہنچائیں بڑھا چڑھا کر پیش کیا اس کے بعد نجف خاں کو دربار سے جانے کی اجازت مل گئی اور وہ الور کی طرف چلا گیا جہاں کے معاملات اس کی آمد کے متقاضی تھے، بادشاہ نے نہایت سہل پسندی سے دہلی کا سفر طے کیا، جہاں وہ گذشتہ اپریل کے وسط تک پہنچا، اس طرح یہ مہم اختتام کو پہنچی، جس میں بادشاہ کو کوئی فائدہ نہیں ہوا اور نہ اس کے وقار میں اضافہ ہوا بلکہ اس سے دہلی دربار کی کمزوری، وزیر کی نااہلی اور نجف خاں کی برتر و اعلیٰ طاقت کا مظاہرہ ہوا۔ فوج ابھی دہلی پہنچی ہی تھی کہ وزیر ایک دوسری مہم پر روانہ ہو گیا بادشاہ کو میدان جنگ میں زیادہ عرصہ ٹھہرنے پر آمادہ نہ کیا جا سکا تاہم عبدالاحد خاں عزم کر چکا تھا اور اس نے بادشاہ کو اس بات پر رضامند کر لیا تھا کہ وہ کسی شہزادے کو اس کے ہمراہ کر دے۔ رضامندی حاصل کرنے کے علاوہ ابتداء میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وزیر اس تذبذب میں تھا کہ وہ اپنے قدم کس راہ پر ڈالے خیمے پہلے پانی پت کی طرف روانہ ہوئے اس کے بعد دریائے جمنا کی طرف بھیجے گئے ایک پل تعمیر کیا گیا گویا وہ دریا کو پار کر کے میرٹھ اور دوآبہ کی طرف پیش قدمی کرنا چاہتا ہے۔ آخر کار ارادہ میں مختلف تبدیلیوں کے بعد یہ ہی طے پایا کہ پانی پت کا رخ کیا جائے اس وقت فوج کی تعداد بھی ان متعدد سرداروں کی آمد کی وجہ سے بڑھ گئی تھی، جو ہمت افزائی کی وجہ سے ہر جگہ سے دہلی پہنچ رہے تھے گذشتہ جون کی 24- تاریخ کو پیش قدمی شروع ہوئی۔

اس مہم میں وزیر کے اصل ارادوں کے متعلق کوئی بات ٹھیک ٹھیک کہنا آسان کام نہیں ہے اگر عوام کی اطلاعات اور اس کے اعلانات پر اعتماد کر لیا جائے تو شاندار کارناموں کی توقع تھی۔ امر سنگھ (جو سکھوں کی سرحد سے ملحقہ علاقہ کا طاقت ور زمیندار تھا اور خود ان کے مذہب کا پیرو تھا) اور ہمسایہ سکھ سرداروں کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ دونوں جنگ پر آمادہ ہو گئے امر سنگھ کو شکست ہو گئی اس نے دہلی دربار سے امداد کی درخواست کی یہ معقول معاوضہ پر منظور کر لی گئی لیکن

امداد میں اتنی دیر کی اور وہ اس قدر غیر یقینی نظر آنے لگی کہ امر سنگھ نے اسی میں بہتری دیکھی کہ اپنے بھائیوں سے مصالحت کر لے۔ بہر طور وزیر کے دہلی سے کوچ کرنے سے قبل ان کے درمیان دو لاکھ روپیہ پر مفاہمت ہو گئی پھر بھی اس کی یہ دلچسپ پیش قدمی نہ رکی اور اس نے یہ واضح کر دیا کہ اس کا مقصد، سونی پت، پانی پت وغیرہ کے ان پرگنوں کا معقول بندوبست کرنا ہے جنہوں نے واجبات صحیح طور پر ادا نہیں کئے ہیں اور جو امر سنگھ تک پہنچنے میں حائل تھے۔

فوج نے کوچ کیا اور بعض اوقات یہ اطلاعات ملیں کہ امر سنگھ اپنی تمام فوج کے ساتھ آنے والا ہے سرہند کے اس طرف کے تمام علاقہ کے سکھ پیچھے دھکیل دیئے جائیں گے بعض دفعہ یہ خبر گشت کرتی تھی کہ سکھ آنے والے ہیں اور ایک مشترکہ حملہ امر سنگھ پر کیا جانے والا ہے اور اس کے علاقوں سے اسے بیدخل کر کے انہیں سکھ اور وزیر آپس میں بانٹ لیں گے وزیر کے ذہن میں یہ دونوں صوبے تھے۔ مجھے اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس نے ارادتاً اس میں سے کسی ایک کو پھانسنے کی کوشش ہو گی لیکن سکھ یا امر سنگھ میں سے کوئی بھی ایسا بیوقوف نہیں جو اس کا ہم خیال بن جائے امر سنگھ نے خود کو علیحدہ رکھا تھا اور اس نے وزیر کے پاس پہنچنے کو ابھی تک مناسب خیال نہیں کیا ہے حالانکہ اس سے پُر زور درخواست کی گئی تھی اور انتہائی دوستانہ طریقہ پر اسے مدعو کیا گیا تھا مگر وہ اس کے برخلاف شادی کے بہانہ سے لاہور کے قریب پہنچ گیا اور یہاں پہنچنے پر اس نے اعلان کیا کہ اس کے اور سکھوں کے درمیان کوئی تنازعہ نہیں رہا ہے اور ہمارے درمیان تمام معاملات طے پا چکے ہیں۔

باوجودیکہ سکھوں نے فوج کے دانہ گھاس جمع کرنے والے دستوں کے ساتھ دشمنانہ سلوک شروع کر دیا تھا۔ پھر بھی انہیں مدعو کیا گیا اور فوجی خدمات پیش کی گئیں۔ انہوں نے اس سے انکار نہیں کیا بلکہ ان بقایا جات کی ادائیگی پر زور دیا جن کا وہ دعویٰ کرتے تھے نیز ان کی باقاعدہ اور مسلسل ادائیگی پر زور دیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے یہ شرط پیش کی کہ وہ امر سنگھ، نجف خاں یا ضابطہ خاں میں سے کسی سے جنگ نہیں کرے گا فی الحال ان معاملات کے تحت کانفرنسیں ہو رہی ہیں۔

فوج پانی پت کے قریب مقیم ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سکھوں کے خلاف قدم نہیں اُٹھائے گی 39۔ کیونکہ ان کے بہت سے سردار جن کی تعداد 3000 سے زائد ہے وزیر کی فوج سے پہلے ہی

وابستہ ہو چکے ہیں امر سنگھ کے متعلق میرا خیال ہے کہ ان کا (وزیر اور اس کے شرکاء) منشاء یہ ہے کہ وہ کچھ رقم ادا کر دے اور غالباً وہ ادا کر دے گا لیکن جہاں تک اس کے خاتمہ کا سوال ہے میں سمجھتا ہوں کہ اگر سکھ اپنے عزم پر قائم رہے اور اس مہم میں شریک نہ ہوئے تو اس کی اپنی فوج کی کارکردگی کے مقابلے میں یہ بہت بڑا کام ہے، اگر چہ ان کی تعداد کافی ہے اس دوران میں وزیر نے سکھوں کی سرحد اور پانی پت کے پرگنوں کے ان چھوٹے زمینداروں کے خلاف ایک اسکیم بنائی ہے 40؎ جن کے علاقوں کی آمدنی تقریباً 4 لاکھ روپیہ سالانہ ہے اور جن سے امر سنگھ اور سکھوں دونوں کے تعلقات خراب ہیں اس مقصد کے تحت فوج میں نقل و حرکت ہوئی مگر اس قدر سست رفتاری اور محتاط روی کے ساتھ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مہم بھی زرتاوان پر ختم ہوگی۔

کچھ عرصہ سے یہاں یہ خبر گشت کر رہی ہے کہ وزیر نے ضابطہ خاں سے معہ افواج شرکت کی درخواست کی ہے اور وہ دونوں سکھوں کے امدادی دستے لے کر گنگا پار کے علاقہ پتھر گڑھ پر حملہ کریں گے (جو آج کل آصف الدولہ کے قبضہ میں ہے) مزید یہ کہ ضابطہ خاں نے یہ تجویز اس شرط پر منظور کر لی ہے کہ نجف خاں جس کو وہ خود اطلاع دینے والا تھا رضامندی ظاہر کر دے اگر چہ میں اس افواہ پر جو مضحکہ خیز بھی ہے کسی طرح یقین نہیں کر سکتا اور اس کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی وہم و گمان ہے کہ وزیر نے اس کے متعلق کوئی ذکر بھی کیا ہو یا اس نے ضابطہ خاں کے سامنے یہ تجویز پیش کی ہو، _____ تاہم وزیر اور اس کی فوج دریائے جمنا سے جس کے مشرقی کناروں پر ضابطہ خاں خیمہ زن ہے زیادہ دور نہیں ہے وزیر نے یہ حکم بھی دیدیا ہے کہ تمام جگہوں سے کشتیاں جمع کر کے پل تیار کیا جائے تا کہ فوج دریا عبور کرے یہ اقدام ظاہر کرتا ہے کہ سکھوں کے خلاف اس کے تمام منصوبے ختم ہو چکے ہیں اب اس کے ارادے کچھ اور ہیں۔ یہ بھی محض دکھاوے کا کھیل ہے لیکن کچھ بھی ہو مجھے یقین ہے کہ یہ پُرانی کہاوت ''کھودا پہاڑ نکی چوہیّا''۔ اُس پر اور اس کی چالبازیوں پر صادق آئے گی۔

شاید وزیر نجف خاں سے وہ پرگنے جن کو موخر الذکر نے بطور جاگیر بادشاہ سے حاصل کیا ہے واپس لینے کا ارادہ رکھتا ہے کیونکہ نجف خاں واجبات کی ادائیگی میں باقاعدگی نہیں برتتا اور چونکہ یہ دوآبہ میں واقع ہیں اس لئے موجودہ نقل و حرکت کا یہ اصل سبب ہو اور مندرجہ بالا افواہ صرف وزیر کی طرف سے پھیلائی گئی ہو تا کہ وہ اپنے عوام میں شہرت حاصل کرے، جو آصف الدولہ کے

خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے تھے۔ لیکن بعد کو وزیر نے اس مہم کو ترک کرنے پر اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ میرے خیال میں اس نے دانشمندی سے کام لیا۔ کاش وہ پُر خلوص طریقہ پر اس سے پہلے ہی سوچ لیتا یا اس مہم کو ٹھنڈے دل و دماغ سے چلاتا۔ اگر اس کا یہ خیال ہے تو صحیح ہے اسے اپنی ساری کوششیں شاہی مقبوضات کو بہتر بنانے کے لئے صرف کرنا چاہئیں۔ بیرون جات پر نظر ڈالنے سے قبل اسے ایسا ہی کرنا چاہئے تھا لیکن صرف اس کام کے متعلق جو کوئی بڑی بات نہیں ہے میرا سوال یہ ہے کہ کیا وہ اس کی جرات کر سکتا ہے۔ اسے نجف خاں سے نفرت ہے لیکن وہ ہمیشہ اس بات کی احتیاط رکھتا ہے کہ اس کی کھلم کھلا مخالفت نہ ہو حالانکہ اس کے امکانات بہت زیادہ ہیں کیونکہ اگر اس نے نجف خاں کے زیر کاشت پرگنے لئے تو یہ نجف خاں کی مرضی کے خلاف ہوگا۔

اس کے برعکس یہ کہا جا سکتا ہے کہ وزیر کے لئے یہ کھیل کھیلنا مشکل ہے کیونکہ نجف خاں اور ضابطہ خاں بجائے اس کے کہ وہ اس سے اتحاد قائم کرتے مختلف بہانوں کے تحت آنے سے انکار کر چکے ہیں بلکہ انہوں نے اس کے برخلاف پوشیدہ طور پر سکھوں کی ہمت افزائی کی ہے تا کہ وہ اس کے مقابلہ پر آئیں علاوہ ازیں وزیر کی ان اسکیموں کو جو عوام کی بھلائی اور بادشاہ کے وقار اور اس کی بہبود کے لئے ہوتی ہیں ناکام بنانے کی مستقل کوشش کرتے رہتے ہیں وہ بادشاہ کے لئے خود رولوشن کے لئے چھوڑ کر ہر امکانی حد تک اس کی حکومت کو اپنا دست نگر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان حالات کے تحت جن پر کوئی حیرت و استعجاب ممکن نہیں وزیر نے آخری صورت کے طور پر اور بالآخر مجبور ہو کر افواج جمع کرنے اور بہت سے خودمختار اور سرکش ہمسایوں میں گھرے ہونے کے باوجود بادشاہ کے دیرینہ مقبوضات کو حاصل کرنے کے متعلق سوچا۔ اس مہم کے لئے یہ تھیں عبدالاحد خاں کی تجویزیں اور دلیلیں ___ اگرچہ یہ مدلل ہیں اور قطعی بے بنیاد بھی نہیں ہیں پھر بھی اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو کچھ پوشیدہ محرکات بھی اتنی کثیر فوج جمع کرنے اور ایک ایسی مہم اختیار کرنے میں شامل ہیں جس میں اتنے طاقت ور ہمسایوں کے پیش نظر زیادہ کامیابی کی امید نہیں ہے ان محرکات کو میں واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

اس وقت جب بادشاہ جے پور کے قریب خیمہ زن تھا دکن میں مرہٹوں پر انگریزوں کے ناکام حملہ کی خبریں موصول ہو رہی تھیں اس ناکامی کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا اور مختلف

صورتوں میں مبالغہ کی اس حد تک پہنچا دیا گیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ انہیں مکمل شکست ہوئی ہے اس کے نتیجہ میں جو صلح ہوئی اسے فراموش نہیں کیا گیا۔ مرہٹہ سردار اپنی کامیابی پر نازاں تھے۔ خود کو اپنے علاقہ میں مامون ومحفوظ خیال کرتے تھے اور انہیں اُمید تھی کہ بہت جلد ہندوستان کے اس علاقہ میں دوبارہ پہنچنے کا موقع ہاتھ آ جائے گا جو ایک عرصہ سے ان کی وحشیانہ پیش قدمیوں کی مرغوب جولانگاہ رہی ہے۔

اس کے بموجب انہوں نے نجف خاں اور دہلی دربار دونوں کو لکھا تھا اور اپنی فتح وکامرانیوں کو شاندار پیرائے میں بیان کیا تھا یہ بھی لکھا تھا کہ وہ اپنے وکلاء کو مع افواج بالائی صوبوں کی طرف اس عزم کے ساتھ بھیج رہے ہیں کہ سلطنت کے کاموں میں ہاتھ بٹائیں اور بادشاہ کے دشمنوں کو جو ان کی غیر حاضری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ان علاقوں میں بے روک ٹوک حکومت کر رہے ہیں۔ کچل کے رکھ دیں اس میں بادشاہ اور اس کے وزیر کے لئے خوشامدانہ جملے استعمال کئے گئے تھے جنہوں نے ان کی امیدوں کو کافی بڑھا دیا تھا جو امداد کے معمولی سے سایہ کے پیچھے دوڑنے کو تیار تھے اب وہ یہ تصور کرنے لگے کہ مرہٹے ان کے دروازوں پر کھڑے ہیں اور ان کے توسل سے دربار کے حالات پھر ایک بار خوشگوار ہو جائیں گے۔ اس غلط اطلاع سے کہ مرہٹہ فوج پیش قدمی کر چکی اور دریائے نربدا تک آ چکی ہے مزید تقویت پہنچی۔ ان کے وکیلوں نے بھی اپنے آقاؤں کے ارادوں اور طاقت کو دربار کی انتہائی موافقت میں پیش کیا۔ ان باتوں پر وزیر ریجھ گیا اور اس کے رویہ میں پہلے کے مقابلے میں بہت کچھ تبدیلی واقع ہوگئی۔ اس نے مختلف قسم کی قیمتی خلعتیں تیار کرائیں اور مرہٹہ سرداروں کو مبارکبادی کے دل خوش کن مراسلے بھیجے بڑے شوق سے آنے کی دعوت دی۔ یہ بھی اعلان کیا کہ وزیر مرہٹوں کی آمد پر منصب وزارت کی سند بھی حاصل کرے گا اور بادشاہ نجف خاں سے اتحاد کے بعد تمام مرہٹہ فوج کو لے کر آصف الدولہ کے علاقہ پر ٹوٹ پڑے گا۔

یہ ہیں حالیہ اطلاعات جو گذشتہ اپریل میں بادشاہ کے دہلی پہنچنے کے بعد عام ہوئیں اگرچہ ان پر پورا بھروسہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ان کے ثبوت میں قوی دلیلیں نہیں ہیں تاہم بہت سی باتیں ان اطلاعات کی موافقت میں بھی ہیں اس لئے غور طلب بھی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس قسم کی کوئی نہ کوئی بات ضرور ہونے والی ہے۔ یقیناً اس وقت وزیر نے فوجیں جمع کرنا شروع کر دی تھیں، اور

وزیر کے لئے خلعت بھی تیار ہوگئی تھی۔ بہت سی قیمتی خلعتیں مرہٹہ وکیلوں کو دینے کے لئے بھی تیار ہوگئی تھیں تا کہ وہ دکن میں اپنے آقاؤں کو بادشاہ کی جانب سے پیش کریں۔ان کو کچھ روپیہ بھی سفر خرچ کے طور پر دیا گیا تھا۔مزید رقم کے لئے جوانہیں چاہئے تھی، وزیر نے وعدہ کرلیا تھا لیکن اس دوران میں کچھ خبریں اس قسم کی موصول ہوئیں کہ مرہٹے ابھی دکن ہی میں موجود ہیں انگریزوں سے صلح کی تجویز منظور نہیں ہوگی اور مرہٹوں کو جلد اپنے علاقہ میں کافی کام کرنا پڑے گا جس کی وجہ سے وہ اس طرف آنے کا خیال نہیں کرسکیں گے۔

ان خبروں سے وزیر کا رنگ بدل گیا،خلعت وزارت کی طرف رکھ دی گئی لیکن وہ خلعتیں جو پہلے ہی مرہٹوں کے وکیلوں کو دی جا چکی تھیں واپس نہ لی جاسکیں تاہم اس نے مزید رقم دینے کا خیال ترک کر دیا مجھے یقین ہے کہ وہ اس بات پر بہت پچھتایا ہوگا کہ وہ پھر اس حد تک بڑھ گیا جس تک وہ پہلے بھی بڑھ چکا تھا۔لیکن وقت گذر چکا تھا اس نے کافی فوج جمع کر لی تھی تا کہ مرہٹوں کے سامنے پُر وقار طریقے سے آئے یہ امر اس کے لئے وبال دوش ہوگیا تھا جس سے وہ نجات حاصل کرنا چاہتا تھا اس سے اس کے بھرم کے کھل جانے کا ڈر تھا۔اس نے فوج کو کام پر لگانے کے متعلق سوچا اور اس کے مطابق موسم کو خاطر میں لائے بغیر جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے فوج کو میدان جنگ میں لانے کا فیصلہ کیا۔

جیسا کہ میں کلی طور پر یقین رکھتا ہوں یہ تھے وہ محرکات جنہوں نے وزیر کو اُکسایا اور ان افواج کو جمع کرنے پر آمادہ کیا جو اس کے ساتھ تھیں فتح کے متعلق توقعات رکھنے اور نجف خاں کی تقلید اور ہمسری کے بارے میں اُمیدیں قائم کرنے میں اس نے خواہ کتنا ہی جذباتیت سے کام لیا ہو اور اس سے قطع نظر کہ نجف خاں کی سپاہیانہ جفاکشی اور جرأت مندانہ پیش قدمیوں 41ء کے مقابلہ میں عبدالاحد خاں جو محض ایک درباری سیاست داں تھا میرے خیال میں اتنا اندھا نہیں ہوگیا تھا کہ یہ بھی نہ دیکھ سکتا کہ اس وقت کے حالات وواقعات اُس وقت اور اُن حالات سے کتنے مختلف ہیں جو نجف خاں کے حق میں مساعد وموافق تھے ان محرکات کے علاوہ یہ سوچنا بھی بے سبب نہیں کہ نجف خاں بہت جلد کسی نہ کسی طرح اپنے معاملات مچھیری راجہ سے طے کر لے گا اور اس صورت میں وہ تمام فوج لے کر فوراً سکھوں پر حملہ آور ہوگا یہ ممکن ہے کہ وزیر اس وقت یہ خواہش رکھتا ہو کہ وہ کسی طرح اس کا شریک بن جائے اور ان لٹیروں سے واپس لئے ہوئے ان علاقوں

میں خود بھی حصہ دار بن جائے جن کو وہ حاصل نہیں کر سکتا تھا اور نہ ان پر بغیر کافی فوج کے قابض رہ سکتا تھا بلاشبہ یہی وہ اسباب ہیں جنہوں نے وزیر کو ان اقدامات کے لئے آمادہ کیا۔

اس وقت میدان جنگ میں عبدالاحد خان کے ساتھ تقریباً 6 بٹالین سپاہیوں کی ہیں جن میں سے چار مکمل ہیں اور باقی دو 7 یا 8 ہزار پیادوں اور چھ ہزار سواروں پر مشتمل ہیں سکھوں اور حلیفوں کے دستے اس کے علاوہ ہیں اس کے پاس مناسب توپ خانہ بھی ہے مگر کچھ زیادہ اچھا نہیں تاہم وہ اس میں روزانہ اضافہ کر رہا ہے اس کی فوجی طاقت کے یہ اعداد و شمار جو میں نے دیئے ہیں عوامی اطلاعات سے بہت کم ہیں۔عوام کی اطلاعات کے مطابق اس کی طاقت اتنی بڑی معلوم ہوتی ہے کہ سلطنت کے موجودہ مقبوضات کے مجموعی محاصل جن میں سب کچھ شامل کر لیا جائے تو بھی اس بار کو نہیں سنبھال سکتے۔اس لئے اس پر تعجب ہوتا ہے کہ وزیر کس طرح اتنی بڑی فوج جمع کر سکا پھر یہ کہ اس کے ساتھ ساتھ اس نے بادشاہ کے محل کے ضروری اخراجات اور اس کے مطالبات وغیرہ بھی پورے کئے ہوں گے یہ صحیح ہے کہ فوج کو بے قاعدگی سے تنخواہیں دی جاتی ہیں اور بیشتر کی تنخواہیں باقی ہیں۔بادشاہ کے خصوصی خدام کی یہ حالت ہے کہ اگر انہیں سال میں چھ ماہ یا صرف 7 ماہ ہی کی تنخواہ مل جائے تو خوش وخرم نظر آتے ہیں بہرحال اصل اخراجات کل محصولات سے بہت زیادہ ہیں اس لئے وزیر کو اپنی ذاتی خزانہ ہی سے اتنی بڑی فوج کے اخراجات برداشت کرنا پڑے ہوں گے۔ممکن ہے عبدالاحد خاں نے بادشاہ کو بھی جو بہرکیف اس معاملہ میں رضامند تھا ان غیر معمولی اخراجات کے کچھ حصہ کا بار برداشت کرنے پر آمادہ کیا ہو اور مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی خوشی سے یا بغیر کسی جبر کے اپنے دفینوں سے ادائیگی کے لئے تیار نہیں ہوا ہوگا اگر شہرت پر یقین کیا جائے تو کہا جاتا ہے کہ وہ مال و دولت سے خالی نہیں ہے۔

بادشاہ کے مقبوضات زیادہ تر نواح دہلی تک محدود ہیں جن کی مجموعی تعداد چھوٹے اور بڑے پرگنوں کو شمار کر کے 70 ہوگی۔ان کے کل محصولات اگر ٹھیک طریقہ پر طے پا گئے ہیں اور ان کا دانشمندی سے انتظام کیا گیا ہے اور وہ سکھوں کے تاخت وتاراج سے محفوظ رکھے گئے ہیں تو پچاس لاکھ یا غالباً ساٹھ لاکھ سے کم نہیں ہوں گے۔لیکن ان کے حالات کو بہتر بنانا اور یہاں امن وامان رکھنا کار دارد ہے۔اگر میں صحیح طور پر محصولات بیان کروں تو میرے خیال میں بادشاہ کو گذشتہ چند سال سے بہت سے بہت 20 لاکھ روپیہ ان پرگنوں سے وصول ہوتا ہوگا یہ صحیح ہے کہ یہ رقم

شہزادوں، وزیروں اور امیروں کو دی ہوئی جاگیروں کے واجبات سے علیحدہ ہے لیکن وہ زیادہ قابل لحاظ نہیں تاہم ان کے محصولات کی مجموعی رقم بارہ لاکھ ہوتی ہے۔ ان 70 پرگنوں میں بہت سے وہ حصے بھی شامل ہیں جن کو نجف خاں نے اپنے تصرف میں لے رکھا ہے اور جن کے عوض وہ ایک معمولی رقم جو نہ ہونے کے برابر ہے ادا کرتا ہے دوسرے پرگنے بھی جو دوآبہ میں بہترین محل وقوع رکھتے ہیں اصل کے نصف سے کچھ زیادہ محصولات کے عوض نجف خاں کے نام سے افراسیاب خاں 42 زیر کاشت لائے ہوئے ہے اور یہ رقم بھی دشواری اور کٹوتی کے بغیر وصول نہیں ہوتی۔

یہ ہیں بادشاہ کے مقبوضات اور محصولات۔ جو اس کی شان و مرتبہ کے لحاظ سے جس کے متعلق میں کچھ نہیں کہنا چاہتا قطعی ناموزوں معلوم ہوتے ہیں اور جو اس کی جیب خاص کے لئے بھی ناکافی ہیں۔ ان میں نجف خاں کے لٹیرے پن، ناسپاسی اور احسان فراموشی کے سبب اور بھی کمی ہو جاتی ہے کیونکہ وہ بادشاہ سے کئے ہوئے ان وعدوں کو توڑنے کے بعد بھی مطمئن نہیں جن کے تحت اسے بادشاہ کو اپنے مفتوحہ علاقوں میں حصہ دار بنانا تھا بلکہ اس نے ان بہت سے پرگنوں پر بھی قبضہ کر لیا تھا جو از ابتداء بادشاہ کے مقبوضات میں شامل تھے انہیں بھی انتہائی مضحکہ خیز جیلوں سے اپنے تصرف میں لے لیا تھا یہ صحیح ہے کہ نجف خاں نے دو سال تک ان کی پیداوار سے فائدہ اُٹھا کر ان میں سے چند کو واپس دے دیا تھا لیکن ان میں سے بہت سے اس کے قبضہ میں تھے اور انہیں بد سے بدتر بنانے میں کوئی چیز مانع نہ تھی تاہم وہ دربار کو اس حد تک مشتعل کرنا اور اس پردہ کو جس کو وہ ایک عرصہ سے حقیقتاً نہ سہی ظاہرداری کے طور پر ڈالے ہوئے تھا چاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔

شاید نجف خاں اگر وہ اپنی افواج کے ہاتھوں مجبور نہ ہوتا اور بعض اوقات وہ اسے پُرزور مطالبات ماننے پر مجبور نہ کرتیں بہتر طور پر کام انجام دیتا جن کی وجہ سے نہ کبھی اس کے خزانہ میں روپیہ رہا اور نہ وہ محصولات وصول ہو سکتے جو مکفول ہونے سے بچ جاتے ہیں۔ اس نے بادشاہ کے ان ملازموں کو ان کے عہدوں پر بحال رکھا تھا جن کو بادشاہ نے خود مقرر کیا تھا جب ان سے کچھ بے راہ روی کا مظاہرہ ہوتا تھا تو اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان کو برطرف کرنے اور ان کی جگہ اپنے آدمیوں کو متعین کرنے کے مقابلہ میں پبلک میں بہتر نظم وضبط قائم رکھنے کا زیادہ خواہش مند ہے تاہم جس طرح معاملہ چل رہا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کبھی سکون نہیں

پا سکے گا اور نہ ہی اس کے ظلم میں کمی ہوگی کیونکہ وہ کبھی کسی بھی تعداد اور کہیں سے بھی آئے ہوئے دستوں کو آنے سے نہیں روکتا بلکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ ان کا بہتر طور پر استقبال کیا جائے گا اور اگر وہ اجتماعی طور پر طاقت ور ہوتے ہیں تو انہیں اتنا اعتماد ہوتا ہے کہ وہ جو چاہیں گے حاصل کر لیں گے۔

شاہ عالم کا دربار اپنے بہترین دور میں بھی کچھ زیادہ شاندار نہیں رہا لیکن شجاع الدولہ کی ہمراہی کے زمانہ میں یا الٰہ آباد کے قیام کے دوران حالت پھر بھی پُرسکون اور پُرشکوہ نظر آتی تھی۔ مگر اب دگرگوں ہو چکی ہے۔ چند بلکہ کوئی بھی ایسا امیر باقی نہیں جو امتیازی شان رکھتا ہو وہ امراء جو باقی رہ گئے ہیں اور جن کے پاس ذاتی طور پر کچھ ہے انہیں نہ بادشاہ کی طرف سے کچھ زیادہ ملتا ہے اور نہ ان کے پاس کوئی عہدہ ہے وہ دن بہ دن مائل بہ انحطاط ہیں۔ قدیم امراء میں سے صرف نواب عبدالاحد خاں باقی ہے جو اپنی خوش بختی یا دانش مندی سے اپنے اور اپنے بزرگوں کے اس سرمایہ کو جو انہوں نے اپنے اچھے وقتوں میں جمع کیا تھا محفوظ کئے ہوئے ہے۔ اس کے لئے وہ اپنی قابلیت اور صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اپنے عہدہ کا بھی مرہون احسان ہے۔

اسے اس سے متمتع ہوتے ہوئے تقریباً پانچ سال کا عرصہ گذر چکا ہے اور اب بھی اس پر لطف و کرم روز افزوں ہے حالانکہ بادشاہ کے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کرنے میں اسے مستقلاً ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا ہے اس پر بھی وہ بادشاہ کی نظر توجہ کا مرکز ہے اب وہ مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کرتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء ہی سے اس نے بہت محتاط طریقہ پر کام کیا اور بادشاہ کے مفادات اور وقار کو محض دکھاوے کے لئے پیش نظر رکھا۔

لیکن کافی عرصہ سے اس کے اقدامات میں بے غرضی کا مظاہرہ کم سے کم نظر آتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس نے قدیم نمک خواروں، فوجی دستوں اور بادشاہ سے متعلق ملازموں کو جو ایک عرصہ سے شاہی ملازمت میں تھے اور ان کی خدمات پسندیدہ تھیں منتشر و مجور کر دیا اور ان کی جگہ دوسرے افراد کو ترقی دی۔ جو اس کے ہوا خواہ تھے۔ پھر اپنے ہی چیلوں کو ان کی کمان بھی دی لیکن یہ سب کچھ اتنی ہوشیاری اور گھما پھرا کر کیا گیا کہ بادشاہ جو آنکھ بند کر کے ہر اس شخص پر جو اس کی نگاہ میں وقعت رکھتا ہے اور منصب وزارت پر فائز ہے اعتماد کرنے کے لئے مشہور رہا ہے اس کے اس کردار کو دیکھ کر بھی آنکھیں نہ کھول سکا بلکہ اس کے برعکس اس کے اعتماد میں روز بروز اضافہ ہے اور

بادشاہ کے تمام معاملات اس کی مرضی پر منحصر ہیں۔

یہ حالت کب تک باقی رہے گی یہ بتانا مشکل ہے۔ جب تک وزیر بادشاہ کے ذاتی اخراجات اور اس کی بیگمات کی ضروریات کو پورا کرتا رہے گا اور اس کی جیب خاص سے کچھ طلب نہیں کرے گا۔ میں یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ بادشاہ اس تصور محض سے کہ اس کی بارگاہ میں کیسا اچھا خدمات گذار موجود ہے مسرور رہے گا اور عبدالاحد خاں بھی سیاہ وسفید کے مالک کی حیثیت سے اپنے عہدہ پر قائم ودائم رہے گا بلکہ اس پر زیادہ سے زیادہ نظر التفات رہے گی اگر کوئی ناکامی یا پُر زور مخالفت عبدالاحد خاں کو دہلی واپس آنے پر مجبور کر دے اور اس واپسی پر وہ بادشاہ کے بہت سے درباریوں کے واجبات مہیا نہ کر سکے جس کی وجہ سے وہ شورش پر آمادہ ہو جائیں اور بادشاہ سے اپنے اطمینان کے لئے امداد کے خواہاں ہوں تو بلاشبہ جلالت مآب ان کی درخواست ماننے پر تیار ہوں گے اس وقت باہمی اعتماد جواب موجود ہے یقینی طور پر ختم ہو جائے گا۔

میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ ایسا واقعہ رونما ہوگا۔ بہت سے واقعات جو آخری دور میں رونما ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے واقعہ کے لئے راہ ہموار ہوگئی ہے وہ محافظ جن کے سپرد قلعہ کی نگرانی تھی اور بادشاہ کی طرف سے مامور تھے ملازمتوں سے علیحدہ کر دیئے گئے ہیں اور نئے افراد جو وزیر کا دم بھرتے ہیں ان کی جگہ مقرر کر دیئے گئے ہیں، بادشاہ ہر طرح کے جاسوسوں میں گھرا ہوا ہے اگر بدقسمتی سے اس کے کسی ملازم نے کوئی لفظ بھی زبان سے نکال دیا کہ وہ وزیر کے اقدامات سے ناخوش ہے تو بادشاہ کی تباہی اور بے عزتی وزیر کی محرور المزاجی کا لازمی اور فوری نتیجہ ہوگی۔ اس وجہ سے تمام لوگ وزیر کے سامنے تھراتے ہیں وہ اب بھی اپنا تحفظ کر سکتا ہے اور اس حد تک باخبر ہے کہ محل کے ان اندرونی کمروں میں ہونے والی ہر بات جن تک پہنچنا نہ صرف مردوں بلکہ خواجہ سراؤں کے لئے ممنوع ہے اس پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ گذشتہ پندرہ روز میں بادشاہ نے اس کے داماد قطب الدین خاں کی والدہ کو محلدارنی کا عہدہ دے دیا ہے جس کی وجہ سے قصر کا ہر کمرہ اس کی دسترس میں ہے اور اصل میں یہ اسے ایک بہترین ذریعہ مل گیا ہے جس سے وہاں ہونے والی ہر بات اور اس کے خلاف خفیہ کارروائیوں کا اسے علم ہو جائے گا۔

بہرحال رفتہ رفتہ غیر محسوس طریقہ پر لیکن بڑی مستقل مزاجی سے وزیر نے بادشاہ کی ہر راہ کو مسدود کر دیا ہے۔ اگر مئوخرالذکر کے دل میں اس کی برطرفی کی خواہش پیدا ہو تو وہ کسی امکانی

طریقہ سے اس پر عمل نہیں کرسکتا اور اس کی گرفت میں آئے بغیر اس قسم کی کوشش بھی ممکن نہیں۔ان تدابیر کو دیکھ کر یہ شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ وزیر بادشاہ کو زیر بار احسان رکھنا چاہتا ہے اور وہ اس طرح کہ بادشاہ کے ذاتی خزانہ میں کچھ رقم اس کے لئے چھوڑ دیا کرے تا کہ اپنے معاندین کے ریشہ دوانیوں کے باوجود خود کو بھی اس زوال سے بچالے جو اس کے پیشرو کو نصیب ہو چکا ہے (اس کے پیش رو کی ذلت بھی اسی طرح پر شروع ہوئی تھی کہ اس نے زبردستی بادشاہ سے واجبات ادا کردیئے تھے) حالانکہ یہ اب اس کے بس کی بات ہے۔اس لئے کہ اس وقت اس کے ہاتھ میں نہ صرف فوجی دستوں بلکہ جملہ محاصل کے غیر محدود انتظامات ہیں۔

مجھے علم نہیں کہ آیا بادشاہ کی آنکھیں اس کے طرزِ عمل سے جو اس قدر واضح اور دھمکی آمیز ہے، کھلیں یا نہیں۔تاہم کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آخرش نجف خاں کو بلانے اور اس حالت سے آزاد کرانے کے لئے خفیہ طور پر لکھا جا چکا ہے۔بہر حال یہ یقینی ہے کہ بادشاہ ان آخری ایام میں وزیر اور اس کے داماد قطب الدین کے بعض اقدامات سے جو وزیر کی غیر حاضری میں دربار کے تمام معاملات کا انتظام کرتا تھا ناخوش معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی وہ وزیر کے مطالبات سے انکار نہیں کرسکا۔اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ وزیر کا اثر ورسوخ ہمیشہ کی طرح اب بھی زیادہ ہے اور اس وقت تک ایسا ہی رہے گا جب تک وہ بادشاہ سے روپیہ طلب نہ کرے یا جبراً اس سے رقم وصول نہ کرے۔یہی اس کے پیشروؤں کے حق میں مضر ثابت ہو چکا ہے۔

یہ ہے دہلی دربار کی کیفیت اور اس کی موجودہ حیثیت۔اس ذیل میں یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کے کردار کا خاکہ مرتب کردوں اور اس کی نجی زندگی میں اس کے طرزِ عمل اور طور وطریق کو بھی بیان کردوں تا کہ کوئی بات باقی نہ رہے اور خاص طور سے آپ اس سے زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کرلیں۔شاہ عالم کی عمر پچاس سال کے قریب ہے۔جسم توانا اور اعضاء متناسب ہیں۔شکل وشمائل سے اگرچہ حزن واضمحلال ٹپکتا ہے پھر بھی اس میں کافی دل کشی اور معصومیت ہے۔43 دیکھنے والا گرویدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔عوام میں وہ نہایت سنجیدہ اور کسی قدر لئے دیئے رہتا ہے۔موقع ومحل کے لحاظ سے وہ شفقت ومحبت کا مظہر بن جاتا ہے۔اپنے ملازمین پر مہربان اور ان کی خدمات سے جلد مطمئن ہو جاتا ہے۔ان کی عیب جوئی کا بہت کم عادی ہے بلکہ ان کی بھول چوک اور غلطی کو نظر انداز کردیتا ہے۔بحیثیت باپ نہایت مشفق اور اپنے بچوں

سے محبت کرتا ہے لیکن دربار کے آداب سکھانے کے لئے بہت زیادہ پابندی وتنبیہہ سے کام لیتا ہے۔ بڑا دیندار ہے اور مذہبی فراء پابندی سے بجالاتا ہے لیکن ان میں توہم پرستی زیادہ نظر آتی ہے۔ فارسی اور عربی پر کافی عبور ہے خصوصاً اول الذکر پر ــــــ ہندوستان کی بعض علاقائی زبانوں سے بھی واقف ہے بلکہ ان زبانوں میں اکثر و بیشتر اشعار کہتا ہے اور خوشی محسوس کرتا ہے اس میں جرأت اور جوش وجذبہ کی کمی نہیں ہے بلکہ اکثر اس کا امتحان ہو چکا ہے اس کے عزم واستقلال کو ایک بار نہیں بلکہ متعدد بار کڑی آزمائشوں سے سابقہ پڑا ہے۔ ایسے نازک اوقات میں اس کی ذہنی اور مزاجی کیفیت قابلِ داد رہی ہے خاص طور پر ان ابتدائی مہمات میں جو بجبوری ءتمام دہلی سے فرار ہونے کے بعد اختیار کرنا پڑیں۔ غالبًا ان ہی اوصاف نے اسے سہارا دیا۔ کاش وہ ابتداء سے اپنے وزیروں پر اتنا کامل اعتماد نہ رکھتا۔ ان کے متعلق ہمیشہ بہتر رائے رکھنے کی وجہ سے اسے اکثر و بیشتر تکالیف اٹھانا پڑیں۔ یہ نقص ہمیشہ سے شاہ عالم میں رہا ہے۔ کچھ تو اپنی آرام طلبی سے اور کچھ شک وشبہ سے عاری طبیعت کی وجہ سے وہ خوشامدیوں کی چاپلوسی کے مقصد کو سمجھنے سے قاصر رہا بلکہ وہ ان کی ذات سے ایک خاص تعلق قائم کر لیتا تھا ان کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اس پر چھا جائیں اور اس کا اعتماد حاصل کر لیں خوشامد کا حد سے زیادہ شوق جو ایک خراب عادت ہے اور غیر محتاط طریقہ پر اپنے وزیروں پر بے انتہا اعتماد، بادشاہ کے یہ دو بڑے نقائص ہیں۔ پہلا نقص تو ہندوستان کے تمام بڑے شہزادوں میں عام ہے جو کبھی حق بات سننے کے عادی نہیں اور کوئی کہتا بھی ہے تو گستاخی متصور ہوتی ہے لیکن دوسرا نقص خاص طور سے اسی میں پایا جاتا ہے۔ یہ مشاہدہ میں آیا ہے کہ اس کی نظر کرم بے پناہ ہوتی ہے لیکن یہ اس وقت تک رہتی ہے جب تک کوئی اپنے منصب پر فائز ہے اور جب اس کا منصب سے ہٹایا جانا ضروری ہو جاتا ہے تو اسی لمحہ اس کی نظر توجہ بھی بدل جاتی ہے وزیر جسے اس کا بے پناہ لطف وکرم اور اعتماد حاصل رہا تھا اس وقت یہ محسوس کر رہا ہے کہ اسے ایک لخت نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اس بے رخی کے ساتھ گویا بادشاہ سے اس کی کبھی دید وشنید ہی نہیں تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاہ عالم ایسے تعلقات میں زیادہ خلوص نہیں رکھتا۔ اس کی نظر عنایت کی وجہ متعلقہ شخص کے جذبات وخیالات سے مناسبت و مماثلت یا اس سے قلبی لگاؤ سے زیادہ معاملات حکومت میں اس کی غیر دلچسپی اور آرام طلبی ہے۔ علاوہ ازیں وہ ایسا ضدی دشمن بھی نہیں کہ جو دوبارہ راضی نہ کر لیا جائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان

کی گذشتہ خدمات کو جلد فراموش کر دیتا ہے اس کی نظر صرف حال پر رہتی ہے، ماضی کی اس کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں۔ وہ اپنے منظور نظر کو خواہ وہ کوئی بھی ہو اور خواہ ہمیشہ اس کے مفادات کے لئے کوشاں رہا ہو لیکن اتفاق سے اس کو (بادشاہ کو) ناپسند ہو جائے تو اپنی تلون مزاجی پر اس کو قربان کر دیتا ہے۔ اس سے بادشاہ کی بہت بڑی کمزوری کا مظاہرہ ہوتا ہے، اور یہ ماننا ہی پڑے گا کہ ایک دفعہ نہیں بلکہ متعدد بار نا قابل معافی حد تک اور غیر معمولی طور پر اس نے ایسا کیا اس کے متعلق یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں سمجھ بوجھ کی کمی تھی یا وہ اس سے بہتر طریقہ اختیار نہیں کر سکتا تھا۔

اگر چہ عوام میں بادشاہ بڑا محتاط نظر آتا ہے لیکن بعض اوقات اپنے معمولی درباریوں اور خادموں میں اس قدر غیر محتاط ہو جاتا ہے کہ اگر ان کے درمیان ہونے والی گفتگو باہر پھیل جائے جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے تو اس کے مقاصد کو سخت نقصان پہنچ سکتا ہے۔ متذکرہ خصوصیات کے علاوہ صنف نازک کی انتہائی چاہت سہل پسندی اور آرام طلبی کی عادت شاہ عالم کے کردار کے تاریک پہلو ہیں۔ جن کی بنا پر اسے عظیم یا عقلمند بادشاہ نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم مجموعی طور پر اس میں بہت سے اوصاف حمیدہ بھی ہیں جو اس کی نجی زندگی میں اس کے کردار کو بہتر، مشفق و مہربان ثابت کرتے ہیں۔

شاہی خاندان کثیر التعداد افراد پر مشتمل ہے 500 سے زیادہ محرمات ہیں اور تقریباً 70 لڑکے اور لڑکیاں ہیں، پوتے اور نواسے وغیرہ ان کے علاوہ ہیں۔ ان میں وہ شامل نہیں جو فوت ہو چکے ہیں۔ ان بچوں میں بہت سے کمسن ہیں۔ 5 یا 6 سے زیادہ سن بلوغ کو نہیں پہنچے ہیں باقی میں 16 سال کی عمر سے شیر خوارگی تک ہر عمر کا بچہ موجود ہے۔ کوئی سال ایسا نہیں گذرتا جس میں کئی بچے تولد نہ ہوں بادشاہ کو سب سے محبت ہے لیکن تیسرے بیٹے مرزا اکبر شاہ اور ایک بیٹی سے جس کی شادی حال ہی میں اس کے ایک بھتیجہ سے ہوئی ہے خصوصیت سے محبت ہے اور یہ دونوں اسے بہت زیادہ عزیز ہیں۔

شہزادہ جواں بخت

مرزا جواں بخت جس کو جہاں دار اشاہ بھی کہا جاتا ہے بادشاہ کے بیٹوں میں سب سے بڑا ہے یہ وہ شہزادہ ہے جو اپنے دادا عالمگیر ثانی کے قتل 44ء اور شاہ جہاں ثانی کے مرہٹوں کے ہاتھوں

گرفتار ہونے پر تخت پر بٹھایا گیا تھا اور بادشاہ کی واپسی تک غازی الدین 45 کے فرار کے بعد اس کی نیابت میں تخت نشین رہا۔ اس کی عمر 27 سال ہے، میانہ قد، توانا و تندرست، کشادہ پیشانی، دلکش خدوخال، شعلہ رو ہے جس میں حسن و جمال کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ بہت زیادہ آزاد طبیعت اور اپنے طرزِ عمل میں غیر محتاط ہے۔ وہ کبھی اپنی اس شان و منزلت کو قائم نہیں رکھ سکتا جو اس کے لئے ضروری ہے ان معاملات میں جن پر اس کی آئندہ فلاح و بہبود کا دارومدار ہے اپنے جذبات کا آزادانہ اظہار کر دیتا ہے تاہم اب اسے محتاط بنا دیا گیا ہے بلاشبہ یہ اس کے بہی خواہوں کی فہمائش کا نتیجہ ہے۔ وہ بادشاہ سے بہت زیادہ وابستگی رکھتا ہے۔ بادشاہ کو بھی اس پر بیحد اعتماد ہے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ وزیر سے اس کے گہرے مراسم نہیں ہیں لیکن بڑی ہوشیاری سے ظاہرداری برتتا ہے، بہت زیادہ فضول خرچ ہے آمد و خرچ میں توازن نہیں رکھ سکتا۔ محصولات سے اسے زیادہ یافت بھی نہیں ہوتی، عورت اور تعیّشات کا دلدادہ ہے اور آزادانہ طور پر ان میں مصروف رہتا ہے۔ یہ شان ہے سلطنت کے ولی عہد بہادر کی۔ 46

اگرچہ اس کی بلاشبہ اپنے باپ اور دادا سے زیادہ جوش اور قوت عمل ہے تاہم میری رائے میں اس میں قابلیت کا وہ جوہر نہیں جو اس رکاوٹ پر قابو پا سکے اور جس کی وجہ سے تیموری خاندان کے آخری دور کے بادشاہ اپنی وسیع سلطنت کے کھوئے ہوئے حصوں کی واپسی ان سے مفاد اٹھانے اور وہ اقتدار حاصل کرنے سے محروم رہے جو ایک عرصہ تک ان کے اسلاف کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ اس کے برعکس یہ گمان غالب ہے کہ وہ بھی جلد ہی اسی نفسانی خواہش و تعیش میں ڈوب جائے گا جو آخری چھ 47 تاجداروں کے لئے سم قاتل بن چکا ہے۔

شہزادہ فرخندہ بخت

اس کا دوسرا بھائی مرزا فرخندہ بخت ملقب بہ شاہجہاں تقریباً 24 سال کا ہے، قد بہت زیادہ دراز، دبلا پتلا، دلکش اور شریفانہ شکل و شمائل کے ساتھ کچھ افسردگی اور قناعت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ بادشاہ کے فرزندوں میں وہ ہی ایک ایسا ہے جو شہزادی کے بطن سے پیدا ہوا ہے لیکن اس ملک میں اس بات کی وجہ سے بڑے بیٹے پر اسے کوئی تفوق اور فضیلت حاصل نہیں ہوتی اس کے طرزِ عمل میں نرمی ہے معلوم ہوتا ہے عافیت پسند ہے بہت آسانی سے مطمئن کیا جا سکتا ہے اپنی ذات کے

لئے اسراف سے کام نہیں لیتا۔ چونکہ اپنے نجی معاملات کی وہ خود دیکھ بھال کر لیتا ہے اس لئے اس سے زیادہ نوکر چاکر نہیں رکھتا، جتنوں کو وہ باقاعدگی سے تنخواہ دے سکے اور جن کا وہ خرچ اٹھا سکے۔ جوں ہی ان کی تنخواہ واجب ہو جاتی ہے فوراً ____ ادائیگی کر دیتا ہے اس اصول کا وہ سختی سے پابند ہے اکثر سنا گیا ہے کہ تاخیر کی صورت میں اس نے اپنے جواہرات وغیرہ کو فروخت کر دینے سے گریز نہیں کیا۔ اپنے اس مزاج کی وجہ سے وہ اس وقت وزیر کے ساتھ میدان جنگ میں ہے اور اسی لئے اس نے اس مہم میں بڑے بھائی پر اسے ترجیح دی ہے کیونکہ وہ آسانی سے مطمئن کیا جا سکتا ہے اور دوسروں کے مقابلہ میں بہت کم متکبر ہے وہاں اس کی حیثیت محض نام کے بادشاہ جیسی ہے جسے کوئی اختیار حاصل نہیں اور اس پر ایسی کڑی نگاہ رکھی جاتی ہے گویا وہ محل کی چہار دیواری کے بجائے یہاں مقید رکھا گیا ہے۔ ان دونوں بڑے بھائیوں میں بہت دوستی ہے کیونکہ یہ دونوں بچپن ہی سے ایک ساتھ پلے بڑھے ہیں۔

شہزادہ مرزا اکبر شاہ

بلحاظ عمر مرزا اکبر شاہ 48 موخر الذکر کے بعد آتا ہے، مگر بادشاہ کی پدرانہ محبت کے لحاظ سے اسے اولیت حاصل ہے اس کی عمر تقریباً 20 سال ہے میانہ قد اور شکل وصورت میں بادشاہ سے بہت مشابہت رکھتا ہے، مگر کچھ روکھا پن لئے ہوئے ہے بادشاہ اور اس کے درمیان ہمدردی اور وابستگی اس حد تک ہے کہ ایک دوسرے کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ بیٹا اور باپ ایک ہی کمرے میں سوتے ہیں درمیان میں صرف ایک پردہ حائل رہتا ہے، دونوں ایک ہی پلیٹ میں کھاتے ہیں جو چیز ایک کو مرغوب ہے وہی دوسرے کو پسند ہے سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ جب دونوں میں سے کوئی ایک بیمار ہوتا ہے تو دوسرا بھی جلد یا فوراً ہی صاحب فراش ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ لے لیتا ہے مختصر یہ کہ کوئی بھی ان دونوں کی باہمی محبت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میرے خیال میں اس کی وجہ دونوں کی ذہنی مناسبت ہے۔ اگرچہ اکبر شاہ باپ کا منظورِ نظر ہے لیکن یہ کبھی مشاہدہ میں نہیں آیا کہ بادشاہ کی نظر توجہ اس پر اس حد تک ہوئی ہو کہ اس کے لئے اس نے وہ سب کچھ کیا ہو جو بڑے بیٹے کی حق تلفی کا سبب بنے۔ تاہم بیٹا ہونے کی وجہ سے وہ اپنے تمام شاہی القاب اختیارات استعمال کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مرزا اکبر شاہ سے قلبی محبت ہے۔

بادشاہ کے باقی بیٹے کم آمیزی کی ایسی زندگی بسر کرتے ہیں کہ ان کے متعلق کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوسکتیں جو مناسب سن وسال کے ہیں ان کو تعلیم میں مصروف رکھا جاتا ہے اور ان کی نگرانی کی جاتی ہے یہ ہے شاہی خاندان کی موجودہ حالت۔ اگرچہ شاہزادوں کی اس وقت کی کیفیت کا اندازہ لگانا دشوار ہے جب وہ آزادانہ طور پر رہتے۔ تاہم ان کے موجودہ طور وطریق کے متعلق جو کچھ معلوم ہوا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے یقین ہے اور اس کی تصدیق کی جاسکتی ہے کہ ہندوستان کا کوئی شہزادہ متذکرہ شاہی افراد کا مقابلہ نہ صرف کسب علم میں بلکہ ان دماغی صلاحیتوں میں بھی نہیں کرسکتا جو قدرت کی طرف سے انہیں ودیعت ہوئی ہیں اور جو بہتر اور پاکیزہ تعلیم وتربیت کا نتیجہ ہوتی ہیں عورت اور عیش وعشرت کی محبت سے انہیں مستثنیٰ قرار دے دینا چاہئے کیونکہ یہ عیب پورے خاندان تیموریہ میں پایا جاتا ہے اور یہی اس کے زوال کا اہم سبب ہے لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ ان چیزوں کی خواہش ایک فطری امر ہے اور یہ خواہش ایک مجرمانہ اور وحشیانہ انداز کی نہیں جس نے بہت سوں کو بدنام کیا ہے لیکن تمام ہندوستانی شہزادے ایسے نہیں۔

وزیراعظم عبدالاحدخاں

اب جو بات باقی رہ جاتی ہے وہ وزیراعظم عبدالاحدخاں مجدالدولہ کے متعلق کچھ بیان کرنا ہے لیکن اس کا کردار کچھ ایسا پیچیدہ ہے کہ اس مرحلہ کو آسانی اور انصاف سے طے کرنے میں شاید کچھ کم دشواری نہیں ہوگی۔

عبدالاحدخاں کے اسلاف دو یا تین نسلوں سے شاہی ملازمت میں تھے اور امین اور بخشی جیسے عہدوں پر فائز رہے تھے۔ اس کا باپ عبدالمجید خاں محمد شاہ کا دیوان خالصہ تھا۔ آخری دور میں وہ دربار پر چھایا ہوا تھا، اس کی وفات پر عبدالاحدخاں کو باپ کا عہدہ نہ مل سکا، تاہم باپ کی بہت سی جاگیریں ورثہ میں آئیں۔ آنے والے مصائب اور طوائف الملوکی کے دور میں اس نے خود کو دہلی جیسے مقام پر جہاں مختلف امراء باری باری سے دارالسلطنت پر قابض رہے باقی رکھا یہ اس کی دانشمندانہ پالیسی ہی کا نتیجہ تھا۔ اگرچہ وہ طاقت ور نہ تھا لیکن محفوظ و مامون رہا، ان امراء کی حرص وہوس اور باہمی آویزشوں کے درمیان اپنے مفادات کی دیکھ بھال رکھنا

ایک دشوار کام تھا اور اس میں منصوبہ بندی کی پوری مہارت درکار تھی صرف غازی الدین کی ایسی شخصیت تھی جس کا اعتماد وہ حاصل نہ کر سکا اگر اس کی قسمت اس کا ساتھ نہ دیتی تو عبدالاحد خاں اس کی نیت بد کا ضرور شکار ہو جاتا۔ عین وقت پر اسے غازی الدین کے اس ارادہ کا علم ہو گیا کہ وہ اس کی زندگی کے درپے ہے اس نے تیز رفتاری سے فرار ہو کر اپنی جان اور قیمتی مال واسباب کو بچالیا۔

فوراً بعد ہی غازی الدین خاں کو دہلی چھوڑنا پڑا اور عبدالاحد خاں واپس آ گیا۔ 1772ء میں جب بادشاہ دارالسلطنت میں پہنچا تو وہ وہاں اپنی جاگیروں کی آمدنی اور باپ کے اندوختہ پر بسر اوقات کر رہا تھا۔ اس نے جلد ہی کوئی بڑا عہدہ حاصل کرنے کے لئے منصوبے بنانا شروع کر دیئے اور اس کوشش میں رہا کہ وہ خود کسی طرح بادشاہ کے دل میں گھر کرے۔ اس لئے نجف خاں، منصور علی خاں 49 اور دوسرے امراء کے مقاصد کے حصول میں بھی جو حسام الدولہ سے غیر مطمئن تھے تعاون کیا، ایک انقلاب لایا گیا جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اور نجف خاں نے قلمدان وزارت عبدالاحد خاں کے سپرد کر دیا۔

عبدالاحد خاں کی عمر کم از کم 60 سال ہے اگر اس کی ایک آنکھ میں نقص نہ ہوتا تو وہ ایک معقول صورت کا انسان نظر آتا۔ 50 اس خرابی کی وجہ سے وہ بدصورت معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان کے اچھے تعلیم یافتہ امراء کی طرح مروجہ علوم پر کافی دسترس رکھتا ہے۔ خاص طور سے انشاء مرسل میں جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ کافی ہوشیار اور محتاط ہے۔ حیلہ ساز اور بہروپیہ ہے۔ جو کچھ وہ چھپانا چاہتا ہے اس میں ایسی ظاہرداری برتتا ہے جو کافی مؤثر ہوتی ہے اور ایسا رویہ اختیار کرتا ہے جس کا بظاہر کوئی مقصد نظر نہیں آتا۔ بلکہ جب کبھی اسے کسی منصوبہ پر عمل کرنا یا اپنے کسی مقصد کو حاصل کرنا ہوتا ہے اس وقت اس کا فن پورے طور پر سامنے آتا ہے اور وہ شاذ ہی اپنے مقصد میں ناکام ہوتا ہے اپنی کامیابی کے لئے وہ کسی بات سے دریغ نہیں کرتا۔ قسمیں، وعدے، خوشامدانہ گفتگو اور پیار و محبت کی باتیں، بلند بانگ دعوے معمولی تحفے، تحائف ان کے ساتھ ساتھ خصوصی توجہات اور محبت کا اظہار۔ ان سب سے وہ اپنے متعلق ہر غلط تاثر کو جو اس کے سابقہ رویہ اور اس کی منافقت سے پیدا ہوا ہو رفع کر دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ اپنی مہارت کا پورا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس وقت تک وہ کچھ

نہیں کرتا اور نہ کسی منصوبے پر عمل کرتا ہے جب تک وہ اپنے لائحہ عمل اور مراسلت کو اس طرح ترتیب نہ دے لے کہ ہونے والی ہر بات پر اسے قابو حاصل رہے اور بعد کو وہ حالات بدل سکے اور اپنے عمل کو اس طرح ظاہر کرے کہ گویا وہ دونوں کی موافقت میں ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ آئندہ کے حالات و واقعات کے تحت ایسا کرنا لازمی ہو جائے۔ اس معاملہ میں اسے امتیاز حاصل ہے جس ڈھٹائی اور دیدہ دلیری سے ہندوستان کی عظیم شخصیتیں جھوٹ بولتی ہیں اور قسمیں کھاتی ہیں اس کی واضح مثال (نجف خاں کے علاوہ) عبدالاحد خاں سے بہتر نہیں مل سکتی۔

ان تمام سیاسی اوصاف کے ساتھ اس میں تکبر بھی بڑی حد تک ہے جس کے متعلق وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کہاں اس سے کام نہ لیا جائے۔ کینہ پرور اور عفو و درگذر سے بے بہرہ ہے لیکن ظالم اور خون بہانے والا بھی معلوم نہیں ہوتا۔ اسے روپیہ سے محبت ہے۔ اپنے مقصد کے حصول کا امکان نظر آ جائے تو سخت سے سخت بات کو برداشت کر لیتا ہے۔

اگر فریق ثانی کی طرف سے سختی نہ ہو تو پھر خود سخت بن جاتا ہے۔ اس کے دل میں بے اعتمادی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ انتہائی غلامانہ ذہنیت رکھنے والے اور کمینہ خصلت ملازمین، کسی کے متعلق وہ اچھی رائے قائم نہیں کر سکتا۔

یہ ہے عبدالاحد خاں کا کردار۔ اس کا اعتماد دو ادنیٰ خدمت گاروں میں تقسیم ہے جن کو اس نے انتہائی پست مقام سے رفتہ رفتہ بلندی پر پہنچایا ہے اگر زبان خلق کا اعتبار کیا جائے وہ بدکردار و ادنیٰ افراد جو اس کے اردگرد جمع ہیں حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار بن گئے ہیں۔ اس کے دونوں معتمدین بہرام قلی خاں اور امام بخش ہیں اور دونوں میں اتنی جہالت اور اُجڈ پن ہے۔ جتنا اس قسم کے لوگوں میں ہوتا ہے۔

وزیر اعظم کا معتمد بیرام قلی خاں

بیرام قلی خاں ایک عرصہ تک اپنے آقا کا منظور نظر آ رہا ہے اور اس سے دلی وابستگی رکھتا ہے۔ وہ سمجھدار بھی ہے وزیر کے مال و املاک کا بیشتر حصہ اسی کی نگرانی میں رہتا ہے اور اس کی غیر حاضری میں وہ دہلی میں حکمرانی کرتا ہے۔

دوسرا معتمد خاص امام بخش

امام بخش اس کی نظر پر بعد کو چڑھا، لیکن اب اس کا اثر ورسوخ وزیروں سے کہیں زیادہ ہے، بہرام قلی خاں کے مقابلہ میں اس کے طرزِ عمل میں نرمی ہے اور چپکے چپکے دل میں گھر کرنے میں اس سے زیادہ تیز ہے لیکن وہ وزیر سے اتنا ہی تعلق خاطر رکھتا ہے جتنا وزیر اسے اعلیٰ و برتر بنانے اور اس کے حلقہء اثر کو بڑھانے میں مسرت محسوس کرتا ہے ___ تمام افواج اس کی کمان میں ہے، شان وشوکت میں وہ تمام شہزادوں سے بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ اس کے ایک چوتھائی کے برابر بھی خرچ کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ یہ دونوں حکومت کے ستون اور تمام گزارشات وعنایات کا ذریعہ ہیں۔ کوئی درخواست اس وقت تک نگاہ التفات کی مستحق قرار نہیں دی جاسکتی جب تک ان دونوں میں سے کسی ایک کا سہارا حاصل نہ ہو اور اس کے لئے کافی رقم ادا نہ کی جا چکی ہو۔

وزیر کا داماد قطب الدین خاں

ان کے علاوہ وزیر کا داماد قطب الدین خاں ہے جو چوبیس سالہ نوجوان ہے بادشاہ سے ان تمام معاملات کے طے کرانے اور گفت وشنید کے لئے وہی بھیجا جاتا ہے۔ جن میں وزیر خود شریک نہیں ہوسکتا، اس کے حسب ونسب سے قطع نظر جو حکومت کے طاقت ور عہدیداران سے ملتا ہے اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عبدالاحد خاں کی لڑکی اس کے عقد میں ہے۔ ورنہ ہر لحاظ سے وہ ایک معمولی اور ناقابل التفات نوجوان ہے۔

مختصر یہ کہ میں نے 1771ء سے اس وقت تک دہلی دربار کا ایک سرسری جائزہ لینے اور اس کے اہم کردار واضح طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے نہ صرف رعایا بلکہ آصف الدولہ اور نجف خاں کے خلاف بادشاہ کی رنجشوں کے بارے میں کچھ کہنے سے قصداً احتراز کیا ہے۔ یہ باتیں دوسرے عنوان کے تحت آئیں گی جس میں وہ سب امور بھی ہوں گے جن کو میں ان سے پیشتر چھوڑ چکا ہوں۔ تاکہ ان کے تذکرہ سے اس سلسلہء بیان میں خلل واقع نہ ہو۔

حوالہ جات

1- شاہ عالم کا ایک مصاحب.....'' کچھ لوگوں نے جو ادنیٰ قابلیت اور گھٹیا رجحانات رکھتے تھے۔ شہزادہ کے یہاں باریابی کے ذرائع حاصل کر لئے تھے۔ ان میں حسام الدین خاں، راجہ رام ناتھ اور بہادر علی خاں تھے تینوں آدمیوں نے جن کی ذہنی ساخت اور رجحان طبع میں یکسانیت تھی شاہ عالم کے دل میں گھر کر لیا تھا خاص طور سے حسام الدین خاں نے ملک کے تمام حصوں سے حسین دوشیزائیں اور قبول صورت عورتیں فراہم کرنے کا کام اختیار کر لیا تھا جنہیں وہ ناچنے گانے کے فن میں تعلیم دلوا کر بادشاہ کے حضور میں پیش کر دیا کرتا تھا، اس لئے جلد ہی بادشاہ کے مقربین خاص میں شمار کیا جانے لگا اس نے وزیر سلطنت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ سیر المتاخرین جلد چہارم ص 27-26

2- الہ آباد کے قیام کے دوران بادشاہ کا مشیر اعلیٰ انگریزوں کا منظور نظر، بادشاہ نے جب دہلی کا سفر اختیار کیا تو بٹھور تک اس کی مشایعت میں رہا'' .....وہ شخص جو بادشاہ کے دل و دماغ پر چھا گیا تھا، منیر الدولہ تھا۔ داروغہ محل کے ادنیٰ عہدہ پر ہونے کے باوجود دراصل اس کا وزیر اعظم تھا۔'' سیر المتاخرین جلد نمبر 4 ص 26

3- گاڑیوں، خیموں، اور دیگر ضروری سامان کے علاوہ دس لاکھ روپیہ نقد ادا کئے۔ سلطنت مغلیہ کا زوال از سرکار جلد دوم ص 554

4- فرانکلن کے بیان کے مطابق ''4 لاکھ روپیہ کی پیش کش'' پر معاملہ طے ہو گیا۔ شاہ عالم ص 35 سرکار لکھتا ہے کہ ''چھ لاکھ روپیہ پر'' معاملہ طے ہوا بشرطیکہ احمد خاں کے بیٹے مظفر جنگ کو فرخ آباد کا نواب تسلیم کر لیا جائے اور اس کے باپ کی جائیداد اسے عطا کر دی جائے۔'' سلطنت مغلیہ کا زوال جلد دوم ص 554۔ ارون رقم طراز ہے کہ ''خزانہ روپیہ سے خالی تھا۔ بخشی نے تمام ہودوں اور آرائشی ساز و سامان میں لگی ہوئی چاندی کو پگھلا کر تین لاکھ روپیہ کے عوض فروخت کیا یہ رقم سات ہاتھیوں اور گیارہ گھوڑوں کے ساتھ بادشاہ کو پیش کی گئی۔ ایک لاکھ روپیہ سلسلہ جنبانی کے عوض نجف خاں نے حاصل کیا۔ جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال مجلّہ نمبر 48 ص 154۔

احمد کے دو بیٹے تھے۔ دلیر ہمّت خاں جو باپ کا جانشین بنا۔ مظفر جنگ کے نام سے مشہور ہوا۔ دوسرا دل دلیر خاں جس نے 1786ء کے قریب بنارس میں سکونت اختیار کی کہا جاتا ہے کہ اس نے خودکشی کر لی۔ جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال مجلّہ نمبر 48 ص60-159

5- نبی گنج۔ ضلع مین پوری۔ یو، پی کا ایک دیہات۔ جو گرانڈ ٹرنک روڈ پر واقع ہے۔

6- بساجی (وساجی کرشنا بنی والا) پیشوا کا ایک جنرل جو روہیلکھنڈ میں متعین کیا گیا تھا اس نے رگھوناتھ راؤ کے خلاف جنگ میں اہم کردار ادا کیا۔

7- شاہ عالم ''6- جنوری بروز پیر وقت سوا آٹھ بجے اپنے دارالسلطنت میں داخل ہوا'' سرکار مغلیہ سلطنت کا زوال جلد دوم ص555 فرانکلن اس مخطوطہ میں دی ہوئی تاریخ سے تقریباً متفق ہے۔ ''شاہ عالم 25- دسمبر 1771ء کو دارالسلطنت میں وارد ہوا۔'' شاہ عالم۔ ص37

8- تکوہلکر۔

9- دریائے گنگا کے مغربی کنارے کا ایک قلعہ۔

10- نجیب آباد کا قلعہ، نجف گڑھ کے نام سے بھی مشہور تھا۔

11- ضلع ہردوئی، یو، پی بھارت میں واقع ہے۔

12- کمپنی کے دستے۔ روہیلوں اور شجاع الدولہ کے درمیان انگریزوں کی کوشش سے جو صلح ہوئی تھی اس سے مرہٹوں کو تکلیف پہنچی تھی۔

13- ممالک غیر سے بھارت آنے والے مہم پسندوں میں سے ایک ''مدک اَن پڑھ اور جاہل فرانسیسی تھا جنوبی ہند میں نیم فرانسیسی فوج کا ایک نجی سپاہی تھا۔ 1774ء میں یہاں سے علیحدہ ہوا اور دہلی چلا آیا اور نجف خاں کے یہاں ملازم ہو گیا..... کامٹن ''ہندوستان میں یورپ کے فوجی قسمت آزما'' ص371

14- فرانکلن نے اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے بلکہ تکوجی کی دونوں کے درمیان مفاہمت کی کوشش کا ذکر کرتا ہے بلکہ نجف خاں کو___ ''اعلیٰ حضرت نے نہایت محبت سے خوش آمدید کہا، خلعت سے نوازا اور فوج کا کماندار مقرر کیا۔'' شاہ عالم ص45

15- انگریزی فوج کا پہلا بریگیڈ جو اس وقت دیناپور میں مقیم تھا اور 1773ء کے اوائل میں

بریگیڈیر جنرل سر رابرٹ بارکر کی سرکردگی میں میدان جنگ میں آیا اور اودھ میں داخل ہوا ___ ہیملٹن ۔روہیلہ افغان ص187

16- میک فرسن کے جرنل میں مندرجہءذیل اندراجات ملتے ہیں ۔

9- مئی ۔آج شام نجف خاں کیمپ میں آیا اور جنرل سے ملاقات کی ۔

11- مئی ۔ نجف خاں نے کرنل سے ملاقات کی......میکفرسن ''سولجرنگ اِن انڈیا'' ص125-26

4- مئی (1773ء) مرہٹے جمنا عبور کرنے کی تیاری کر رہے ہیں ۔نجف خاں اور ضابطہ خاں ان سے علیحدہ ہو رہے ہیں ۔

17- مجدالدولہ کے نام سے مشہور تھا۔

18- آگرہ پر قبضہ کے سلسلہ میں خود پولیر نے اہم کردار ادا کیا تھا تفصیلات سے گریز کیا ہے اس کی وجوہ وہی سمجھ سکتا ہے ابتدائیہ ملاحظہ فرمائیے ۔

19- محمد ایلیچ خاں ۔شجاع الدولہ کا مشیر جو مرتضیٰ خاں کی وفات کے بعد آصف الدولہ کا وزیر ہوا۔تفصیلات کے لئے شاہ عالم ثانی از فرانکلن ملاحظہ فرمائیے ۔ص52-54

20- 1710ء میں پیدا ہوا۔علی محمد کے بیٹوں کا سر پرست مقرر ہوا۔1754ء میں اس نے ان علاقوں پر قبضہ کر لیا جو اس کی نگرانی میں دیئے گئے تھے ۔1760ء میں احمد شاہ ابدالی کے ہمرکاب رہا۔ پانی پت کی جنگ کے خاتمہ پر اسے اٹاوہ عطا کیا گیا۔ دوسرے روہیلہ سرداروں کو لے کر شجاع الدولہ سے مرہٹوں کے خلاف اتحاد کے ایک معاہدہ پر دستخط کئے اس کے بعد مرہٹوں سے ایک معاہدہ کیا جس کے تحت اودھ میں داخل ہونے کا راستہ دینے اور کچھ رقم کا وعدہ کیا۔23-اپریل 1774ءکو میران پور کڑہ کی جنگ میں مارا گیا۔

21- بدایوں سے 23 میل کے فاصلہ پر۔1750ء کے قریب ایک روہیلہ سردار دوندے خاں نے ''ایک بہت بڑے قلعہ پر قبضہ کیا۔جواب تک آصف پور اور چندوسی جانے والی سڑک کے شمال مغرب میں موجود ہے............ دوندے خاں نے بسولی میں متعدد مکانات بنوائے ۔ جو غدر تک اس کے ورثاء کے قبضہ میں رہے اور بعد کو بغاوت کے الزام میں ضبط کر لئے گئے ۔

صوبہ متحدہ (یو، پی) کا ڈسٹرکٹ گزیٹیئر نمبر 15 ص5-174

22- لال قلعہ کے شمال مشرق میں واقع ہے۔شیر شاہ کے لڑکے سلیم شاہ نے تعمیر کرایا تھا۔

23- پولیر نے میر قاسم کے دہلی کے قریب پہنچنے کے متعلق کرنل آئرن سائڈ کو ایک خط 22- مئی 1776ء کو لکھا تھا___ ''قاسم علی خاں متعدد مہمات کے بعد اور ایک جگہ سے دوسری جگہ فرار ہوتے ہوئے آخرکار پلول میں مقیم ہو گیا ہے جو یہاں سے 20 کوس کے فاصلہ پر آگرہ سے دہلی جانے والی شاہراہ پر واقع ہے ملاحظہ کیجئے، حکومت بنگال کا خط کورٹ آف ڈائریکٹرز کو۔مورخہ 24-اگست 1774ء جس میں اس اطلاع کا حوالہ دیا گیا ہے کہ شاہ عالم نے اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی ہے اس کی نقل روہیلہ وار۔از اسٹریچی ص154 پر ہے۔

24- ضلع بجنور میں ایک قصبہ جس کو نجیب الدولہ نے آباد کیا۔

25- مراد آباد کے شمال مغرب میں 19 میل کے فاصلہ پر واقع، یہ ایک قدیم آبادی ہے ایک روایت کے مطابق اسے پرتھوی راج کی بہن امیبا نے دوبارہ بسایا تھا۔اکبر کے عہد میں اس پرگنہ سے 1000 سوار 500 سو پیادے اور 50 ہاتھی وقت ضرورت طلب کئے جاتے تھے صوبہء متحدہ کا ڈسٹرکٹ گزیٹیئر نمبر 16۔

26- انڈیا آفس کے مسودہ میں اس طرح تحریر ہے۔یہ 1774ء کا واقعہ ہے۔

27- سعادت علی خاں۔شجاع الدولہ کا دوسرا بیٹا۔جو اپنے بھائی کے مقابلہ میں بہتر صلاحیتیں رکھتا تھا۔اودھ سے فرار ہو کر نجف خاں سے مل گیا، اور آخرکار برطانوی علاقہ میں پناہ گزیں ہوا۔آصف الدولہ کے انتقال کے بعد سرجان شور نے اسے اودھ کے تخت پر بٹھایا۔

28- مختار الدولہ مرتضٰی خاں۔آصف الدولہ کا خالص آدمی تھا۔اس نے ایلچی خاں کو شجاع الدولہ کی موت کے بعد ہٹایا اور ترقی پا کر سات ہزاری منصب پر فائز ہوا۔''علاقہ کا حقیقی حاکم'' کہا جاتا تھا انتظامیہ میں کافی اصلاحات کیں۔1776ء میں قتل کر دیا گیا۔

وارن ہیسٹنگز اور اودھ از دیویز ص93-46

''حکومت میں انتشار و بدنظمی کا وہی ذمہ دار تھا، اس نے اپنے رشتہ داروں کا تقرر کیا اور انتظامیہ کو درہم برہم کر دیا۔'' اودھ اور ایسٹ انڈیا کمپنی از باسوص6

قتل کی تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے پولیر کا بیان ''چند اہم تاریخی مسودات'' میں۔

29- زیادہ صحیح یہ ہے کہ عبدالاحد کا چھوٹا بھائی تھا۔

30- سر جادوناتھ سرکار نے اس تاریخ سے اختلاف کیا ہے۔ ''یہ خطرناک مقابلہ بمقام الی نگر جو مظفر نگر کے شمال مغرب میں 8 میل کے فاصلہ پر ہے اس ماہ کی 11- تاریخ کو ہوا۔ فال آف دی مغل ایمپائر۔ از سرکار۔ جلد سوم ص133

31- ''محبوب خواجہ سرا، اور نواب آصف الدولہ کا جنرل..... جو 1775ء میں ایک دستہ کے کماندار کی حیثیت سے شاہ عالم کی امداد کے لئے بھیجا گیا تھا۔ 1783ء میں مرزا شفیع نے اس کو گرفتار کیا اور اندھا کر دیا۔'' اورینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری از بیل۔ ص226

32- ستمبر 1777ء میں غوث گڑھ کے محاصرہ کا ذکر نہیں کیا۔

33- ایک روہیلہ سردار نجف خاں کی ملازمت میں داخل ہوا۔ نواب سنگھ جاٹ کو 1773ء میں بارسان کی جنگ میں شکست دی، ملاحظہ کیجئے ''ہسٹری آف جاٹس'' از قانون گو ص70-257، ص80-277، ص86-284۔

34- ضلع روہتک پنجاب میں واقع ہے۔ گج پت سنگھ جو خاندان جند کا پہلا راجہ تھا 1765ء میں جیند اور صنعی دوں میں مقیم ہوا جو گوہانہ تحصیل سے مشکل سے 20 میل کے فاصلہ پر شمال مغرب میں ہیں ان مقامات سے وہ مستقلاً حصار، روہتک کے علاقہ پر حملہ کرتا رہا۔'' روہتک ضلع کا گزیٹیر ص19۔

35- مرزا نجف خاں کا غلام لیفٹیننٹ۔ نجف خاں کی موت پر افراسیاب خاں سے مل گیا 1782ء میں محمد شفیع نے قید کر لیا۔

36- غالباً اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ غوث گڑھ کے محاصرہ کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا۔

37- خواجہ معین الدینؒ کا مقبرہ مراد ہے یہ مقبرہ..... ''ایک شاندار عمارت ہے، دنیا کے تمام حصوں سے مسلمان یہاں زیارت کے لئے آتے ہیں۔ یہاں ایک مسجد اکبر کی تعمیر کرائی ہوئی ہے اور دوسری شاہجہاں کی اور بہت سی جدید عمارتیں ہیں..... یہ مقبرہ طلائی اور نقرئی کام سے مرصع ہے۔'' راجپوتانہ ڈسٹرکٹ گزیٹیر نمبر A-1۔ ص17-18

38- فرانکلن نے اس سے اختلاف کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ پرتاب سنگھ نے 5 لاکھ روپیہ کی پیش کش

کی تھی شاہ عالم ص85 سرکار کے بیان کے مطابق ۔ 2 لاکھ روپیہ کی پیش کش کی اور اس کا خراج باہمی رضامندی سے 20 لاکھ روپیہ طے پایا۔ ''فال آف دی مغل ایمپائر'' جلد سوم، ص171

39- لیکن اصل میں سکھوں کے خلاف قدم اُٹھایا گیا۔ 7-اکتوبر کو شاہی فوجوں نے امرسنگھ پر ایک فتح حاصل کی لیکن پٹیالہ کے مقابل کوئی کارنمایاں نہیں دکھا سکیں بلکہ امرسنگھ اور اس کے حلیفوں کی دھمکی نے انہیں واپس ہونے پر مجبور کر دیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسودہ 7-اکتوبر کے معرکہ سے قبل مکمل کرلیا گیا تھا۔

40- غالباً گج پت سنگھ کی طرف اشارہ ہے۔ ''ایک چھوٹے پھولکیا سکھ گج پت سنگھ نے 1764ء میں ریاست جیند کی بنیاد ڈالی'' ___ سرکار فال آف دی مغل ایمپائر جلد سوم، ص154 ''جب یہ کرنال پہنچے تو مقامی زمیندار گج پت سنگھ نہایت وفاداری کے ساتھ شہزادہ کے پاس حاضر ہوا۔ اسے مجبور کیا گیا کہ وہ دو لاکھ روپیہ بطورِ خراج دینے کا وعدہ کرے۔ سرکار جلد سوم، ص175

41- پولیر نے 1776ء میں آئرن سائڈ کو تحریر کردہ خطوط میں نجف خاں کے متعلق دلچسپ باتیں لکھی ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔ ''پولیر کے چند اہم تاریخی مسودات''۔ ''ایشیاٹک اینول رجسٹر، 1800ء''۔ متفرق رسائل۔ ص34-33

42- نجف خاں کا ایک غلام اور لیفٹیننٹ جو نجف خاں کی وفات کے بعد میر بخشی کے عہدہ پر فائز ہوا اور 1784ء میں مارا گیا۔

43- فاربس 1785ء میں شاہ عالم سے ملا تھا اس نے اس کی عمر تقریباً 60 سال بیان کی ہے ''عام قد و قامت رکھتا ہے۔ چہرہ سے پُرسکون اور پُرشفقت دل و دماغ کا پتہ چلتا ہے اس کے طور و طریق سے فطری شان و شوکت کا اظہار ہوتا ہے لیکن اس میں خلق و مروت کا عنصر زیادہ ہے۔'' فاربس اورینٹل میموائیرس۔ (مشرق کی یادداشتیں) جلد ثانی ص677

شاہ عالم ثانی کے دربار کے اس سے کچھ عرصہ قبل کے حالات ایک فرانسیسی لائی لارین ڈولیسی کامتَ دَماداوَ نے بیان کئے ہیں اس نے جرمنی اور ہندوستان میں مقیم فرانسیسی فوج میں خدمات انجام دیں اور مڈغاسکر کا گورنر مقرر رہا 1774ء میں وہ دوبارہ ہندوستان آیا۔

بادشاہ اور اس کے بعد نظام کی ملازمت میں فرانسیسی فوج منظّم کرنے کی بے سود کوششوں کے بعد 1777ء میں مسولی پٹم کے مقام پر فوت ہوا۔ اس کے رسالہ ''رونل دووائج دو بنگال آ دہلی۔'' (بنگال سے دہلی تک کا سفرنامہ) کے کچھ حصوں کا ترجمہ سر جادو ناتھ سرکار نے کیا ہے جو اسلامک کلچر جولائی 1937ء میں شائع ہوا ہے۔ کامتَ دَماداؤ۔

شاہ عالم کے متعلق لکھتا ہے کہ ___ اچھے اور دلکش کردار کا شہزادہ ہے اس میں جوش و جذبہ یا ذہانت کی کمی نہیں۔ تخت نشین ہونے کے بعد ابتدائی سالوں میں اس نے امور سلطنت میں حصہ لیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے پیشروؤں کے مقابلہ میں بہتر ثابت ہوگا۔ خواہ اپنی فطری کمزوری کی بنا پر یا اپنے پیچیدہ حالات کے تحت اس نے دست کشی اختیار کر لی ہے اور آج کل ایک عام لاپروائی اس کا شعار بنی ہوئی ہے وہ ایک ادنیٰ درجہ کی حرص وطمع کا شکار ہے جو اس کے حالات کے تحت قابلِ معافی ہے بشرطیکہ وہ تمام حدود سے متجاوز نہ ہو۔ تاہم ان لوگوں نے جو مجھ سے بہتر طور پر اسے جانتے ہیں مجھے یقین دلایا ہے کہ یہ لاپروائی دکھاوے کی ہے اس کے پردے میں بڑے بڑے منصوبے ہیں جو ان کی معلومات کے اعتبار سے جلد ظہور پذیر ہونے والے ہیں۔ کامتَ دَماداؤ، فرخندہ بخت کے بارے میں لکھتا ہے کہ ___ ''وہ کتابوں کا بیحد مطالعہ کرتا ہے، اس نے عربی اور فارسی کتب کی ایک بڑی تعداد جمع کر رکھی ہے انہیں کے صفحات کے الٹنے پلٹنے میں اپنا تمام وقت صرف کرتا ہے۔'' اکبر شاہ کو باپ کا چہیتا بیٹا بیان کیا ہے جس کے ساتھ دو بڑے بیٹوں کے مقابلے میں بہتر سلوک کیا جاتا ہے۔

کامتَ دَماداؤ نے شاہی دربار کی مفلسی و تہی دامنی کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے ''دربار سے جاہ وحشمت کا اظہار قطعی نہیں ہوتا، اورنگ زیب کے درباریوں کے اس پُرشکوہ منظر کے بجائے جو برنیئر نے نہایت دلچسپی اور صحت کے ساتھ بیان کیا ہے انتہائی کفایت شعاری نظر آتی ہے جو طمطراق شان وشکوہ کے مذاق کی کمی کے سبب نہیں بلکہ واقعی غربت ومفلسی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ میں نے یہاں کی عوامی رسومات دیکھی ہیں۔ ان میں قطعی کوئی شان و شوکت نہیں۔ بادشاہ درباری اور محل کا ساز وسامان سب کے سب حقیقی غربت کا پتہ دیتے ہیں مختصراً یہ کہ ظاہری عزت واحترام اور تعظیم وتکریم سے قطع نظر ہم کوئی ایسی بات نہیں دیکھتے

جس سے مغل اعظم کے دربار کی دولت وثروت کے متعلق لوگوں کے سابقہ بیانات کی تصدیق ہوتی ہو۔ نیز دربار کے حالات کے لئے ملاحظہ کیجئے ''لائف اینڈ کارسپونڈینس آف میٹکاف'' (میٹکاف کی حیانہ ومراسلت) ازکسمئے جلداول ص44-343

44- 29- نومبر 1759ء کو عالمگیر ثانی فیروز شاہ کوٹلہ کے مقام پر اپنے وزیر غازی الدین کے ہاتھوں قتل ہوا اور اورنگ زیب کا ایک بیٹا تخت پر بٹھایا گیا اکتوبر 1760ء میں وہ علی گوہر کے حق میں دست بردار ہوگیا۔

45- غازی الدین عماد الملک ''غازی الدین خاں فیروز جنگ کا لڑکا تھا، یعنی نظام الملک آصف جاہ کا پوتا___ اس کا اصل نام شہاب الدین تھا.....دہلی کے شہنشاہ احمد شاہ نے امیر الامراء مقرر کیا اور عماد الملک غازی الدین خاں کے خطاب سے نوازا۔'' بعدہٗ اسی نے احمد شاہ کو اندھا کیا اور عالمگیر ثانی کو قتل کیا___ بیلے ''اورینٹل بائیوگرافیکل ڈکشنری'' ص143 جب احمد شاہ درانی کے حملہ کی خبر پھیلی تو عماد الملک کو اپنی جان بچانے کے لئے اس کے علاوہ کوئی راستہ نظر نہ آیا کہ وہ سورج مل جاٹ کی پناہ میں چلا جائے اور اسی کے تحت بغیر تاخیر اس جاٹ سردار کے علاقہ میں منتقل ہوگیا، ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن، ''ہسٹری آف انڈیا'' جلد ہشتم ص243 شاہ عالم کے دہلی پہنچنے سے قبل غازی الدین خاں نے شہر چھوڑ دیا تھا اور مالوہ میں مرہٹوں کی پناہ میں چلا گیا، فروری 1780ء میں گوڈارڈ نے اسے سوات میں دیکھا تھا اس کے بعد وہ مکہ چلا گیا اور کابل اور قندھار کی خاک چھانتا رہا۔ ملتان واپس پہنچا اور آخر کار شمشیر بہادر کے لڑکے علی بہادر کی حفاظت میں بندیل کھنڈ میں مقیم ہوگیا۔ 1800ء میں فوت ہوا۔ ''جنرل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال'' مجلّہ نمبر 48 ص12930

46- جہاں دار اشاہ اپنے باپ کا جانشین نہیں ہوا۔

47- بہادر شاہ اول یا شاہ عالم اول، جہاندار شاہ، فرخ سیر، محمد شاہ احمد شاہ، عالمگیر ثانی۔

48- شاہ عالم کا جانشین 1806ء میں تخت نشین ہوا، غلام قادر نے اس کی انتہائی تذلیل کی اور اپنے سامنے ناچنے پر مجبور کیا، بقول آکٹرلونی۔ ''وہ حماقت کا مجسمہ تھا اور انتہائی درجہ کا حریص تھا۔'' تھامسن۔ ''میکنگ آف انڈین پرنسیز'' ص173

49- شاہی محل کا داروغہ، مہاواجی سندھیا کا دشمن تھا۔ اس نے 1788ء میں غلام قادر کو دہلی پر

قبضہ کرنے میں مدد دی۔

50- اس کے متعلق کامتَ دَماداوَ کا بیان دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔لکھتا ہے''ضعیف العمر ہے سفید داڑھی خوش اخلاقی اور دلآ ویز وضع کی وجہ سے قابل تعظیم ہے اس کے شریفانہ طوروطریق نے اس کی بدنمائی کو ڈھک لیا ہے جواس کی بائیں آنکھ میں پھلی کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے۔اس نواب کو بادشاہ کا پورا اعتماد حاصل ہے اس کا کوئی ہمسر نہیں۔'' اسلامک کلچر۔جولائی 1937ء

پولیر سے منسوب اہم تاریخی مسودات

(1)

مشہور جاں باز سومبر یا سومرو

(مورخہ 4- جولائی 1776ء)

سومبر السیشین 1 ہے۔ اسٹریسبرگ میں پیدا ہوا۔ آبائی پیشہ کے لحاظ سے بڑھئی اور بعض کے قول کے مطابق قصاب ہے۔ 30 سال قبل فرانسیسی بحری ملازمت سے منسلک ہو کر بحیثیت بڑھئی ہندوستان آیا اور پھر پرائیویٹ سپاہی کی حیثیت سے فوجی ملازمت میں داخل ہوا، سارجنٹ کے عہدہ تک ترقی پائی۔ اسی عہدہ پر آخری جنگ کے آغاز تک ڈھاکہ میں مقیم رہا۔ جب چندر نگر 2 پر قبضہ ہو گیا تو وہاں کی فرانسیسی فیکٹری ختم ہو گئی، سومبر نے دوسرے ملازمین کے ساتھ اس مقام کو خیر باد کہا اور قسمت آزمائی کے لئے نکل پڑا۔ ہندوستان کے مختلف حصوں کی دیسی ریاستوں میں ملازمت کی اور میرا خیال ہے کہ آخر میں پورینا کے نواب کے یہاں آ گیا جہاں بہت کچھ اُتار چڑھاؤ کے بعد لیکن نہایت ادنیٰ حالت میں اس وقت تک گمنامی کی زندگی بسر کرتا رہا جب تک قاسم علی خاں بنگال کی مسند پر نہیں آ گیا قاسم علی خاں نے ایسے افراد کی کافی ہمت افزائی کی جو یورپی طریقہ پر فوجوں کی تنظیم کر سکیں اور خاص طور سے فرانسیسی باشندے ہوں۔ سومبر کو بہت جلد اس کے یہاں ملازمت مل گئی۔ یہاں بہت زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ اپنی مستقل محنت اور ان دستوں کو غور و توجہ سے منظّم کرنے کی وجہ سے جو اس کے سپرد کئے گئے تھے اس نے قاسم علی خاں کی نظر توجہ

حاصل کر لی اور اسے علیحدہ کمان دیدی گئی، پھر بھی ایک عرصہ تک اسے کوئی خاص امتیاز حاصل نہ ہوا، سوائے اس رسوائے زمانہ اقدام کے جس میں اس نے دغابازی اور بغیر کسی اشتعال کے یورپی نام کو بٹہ لگا کر ہمارے ان افسروں کو قاسم علی خاں کے حکم سے بہیمانہ طور پر قتل کیا جو پٹنہ میں قید ہوگئے تھے۔ حالانکہ جب اس نیک کام کی تجویز پیش کی گئی تھی تو اس کے بہت سے ہندوستانی افسروں نے اس سے انکار کر دیا تھا۔ اسے سومبر کے عروج اور طاقت کے آغاز کا دن کہا جا سکتا ہے۔ قاسم ایسے شخص پر اعتماد کیوں نہ کرتا جو اتنا فرماں بردار ہو! واقعی وہ اس کا منظورِ نظر بن گیا اور اس غداری کا اسے کافی انعام ملا۔

بعد کو یہ تمام باتیں بھی سومبر کو اس خیال سے باز نہ رکھ سکیں کہ قسمت قاسم کا ساتھ نہیں دے سکتی اس لئے اس نے خود کو شجاع الدولہ کے دامن سے وابستہ کرنا چاہا اور اپنے زیرکمان دستوں کی بہت بڑی تعداد کے ساتھ اس کی ملازمت میں چلا گیا کچھ عرصہ بعد اسی فرماں روا کے یہاں اس کے آقا کو بھی پناہ لینا پڑی اس نے اپنے لائق آقا کو اس سے قبل ہی اپنے گروہ کے بقایا جات کا ایک ایک حبہ ادا کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ سب اس نے تھوڑا تھوڑا کر کے خود وصول کر لیا تھا اس وقت سے وہ خودمختار ہو گیا اور اس وقت تک شجاع الدولہ کے ہمرکاب رہا جب تک شجاع الدولہ اور انگریزوں کے درمیان معاہدہ کی وجہ سے اس کی برطرفی ضروری نہ ہوگئی شجاع الدولہ اسے واجبات کی ادائیگی کے بغیر علیحدہ کر دینا چاہتا تھا لیکن ایسا نہ ہوسکا، سومبر نے روہیلوں کے علاقہ میں اس کی بیگم اور دوسری عورتوں کو گھیرے میں لے لیا اور جب تک بیگم سے بقایا جات کی ادائیگی نہ کرالی وہاں سے نہ سرکا۔ اس کے بعد وہ جاٹوں کی ملازمت میں چلا گیا یہاں سے کچھ بےاطمینانی کی وجہ سے وہ جےنگر کے راجہ کے علاقہ میں پہنچا مگر زیادہ عرصہ نہیں ٹھہر سکا پھر جاٹوں کی ملازمت میں آ گیا اور اس وقت تک ان کے پاس رہا جب تک وہ ان کو کچھ دیتے رہے اس کے بعد وہ دربار میں مدعو کیا گیا جہاں اچھا خاصا استقبال کیا گیا لیکن اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا کہ اسے نجف خاں سے مل جانا پڑا، اس وقت سے وہ اسی کے ساتھ ہے اس کا گروہ زیادہ بڑا نہیں ہے۔ سپاہیوں کی تین بٹالینوں اور دوسو سواروں پر مشتمل ہے لیکن اس کے پاس بہترین توپخانہ ہے۔ 14 توپیں نہایت خوبی کے ساتھ نصب ہیں اور جملہ ساز وسامان سے لیس ہیں۔ اس کی قابلیت اور کردار کے متعلق یہ ہے کہ وہ بالکل اَن پڑھ ہے نہ لکھ سکتا ہے اور نہ پڑھ سکتا ہے لیکن وقت ضرورت اپنے

دستخط کرسکتا ہے، فارسی اور عربی زبان پر دسترس رکھتا ہے۔ دونوں زبانوں میں روانی اور کافی صحت کے ساتھ گفتگو کرسکتا ہے پٹنہ والے واقعہ سے اس کا کردار واضح ہے، وہ ظالم اور بے رحم ہے اس کی بہت سی مثالیں اس نے قائم کی ہیں جن کو وہ اپنے خیال کے مطابق انصاف اور اپنے اختیار پر مبنی سمجھتا ہے حالانکہ انہیں خونیں افعال کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا اس کی شہرت بزدل کی حیثیت سے ہے ایک انتہائی متدین اور محتاط انسان کی حیثیت سے یقیناً نہیں اس کے کردار کے اچھے پہلوؤں کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ لباس وضروریات اور طریق زندگی میں سادگی پسند ہے اپنے ادنیٰ حسب ونسب اور اپنی سابقہ حالت کا نہ کبھی انکار کرتا ہے اور نہ اسے چھپاتا ہے، لیکن سومبر میں خاص وصف اس کی محتاط روی اور دور بینی ہے جس کی بدولت اس نے اپنی جماعت کے آدمیوں کو ان تمام معرکوں میں جن میں وہ شریک ہوا اور جہاں جنگ کی پوری شدت کو اس نے یکہ وتنہا خود برداشت کیا مجتمع رکھا اور منتشر ہونے سے بچایا اور یہ یقیناً اس کو آئندہ بھی محفوظ اور مامون رکھے گا حقیقتاً اس کی قوت فیصلہ غیر معمولی ہے۔ نیز کہا جاسکتا ہے کہ اس میں فوجی تنظیم کی صلاحیت ہے وہ انگریزوں سے بہت خوفزدہ ہے بلکہ ان کے نام تک سے ڈرتا ہے اور میرے نزدیک یہ بات بلاوجہ نہیں۔ اسی کے سبب وہ ہمیشہ اپنے تحفظ کا خیال رکھتا ہے، پوچھ گچھ اور تلاشی کے بغیر کوئی شخص اس کے کیمپ تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ اس میں داخل ہوسکتا ہے۔ اس کے اس طرزِ عمل سے یہ ظاہر ہوتا ہے اسے اس بات کا بھی ڈر ہے کہ کہیں وہ گرفتار نہ کرلیا جائے اور انگریزوں کے حوالے نہ کردیا جائے اس بنا پر وہ اپنی طاقت کو تقسیم کرنے سے بہت گھبراتا ہے خاص طور سے انگریزی فوج کے بہت قریب پہنچ جانے کے وقت سے اس احتیاط نے تمام دور اندیشی کے باوجود ایک مشکل میں ڈال دیا ہے جس سے آخر کار وہ خود کو بچانے میں دشواری محسوس کرے گا، وہ نجف خاں سے اپنے گروہ کے لئے نقد روپیہ کے علاوہ کسی دوسری صورت میں معاوضہ لینے پر کبھی تیار نہیں، لیکن نجف خاں ادائیگی کے معاملہ میں اچھا نہیں نجف خاں پر سومبر کے دس ماہ کے واجبات ہیں اور سومبر پر اس کے گروہ کے 6 ماہ کے واجبات ہیں۔ اگر سومبر کوئی علاقہ (نقدی کے عوض) قبول کرلیتا ہے جس کے متعلق نجف خاں ایک بار نہیں کئی مرتبہ کہہ چکا ہے اور جس کے محصولات سے وہ اپنا ماہانہ بھتہ وصول کرسکتا ہے جن کا موجودہ اندازہ 65000 ہزار روپیہ ہے، اور اس کے لئے ابھی حالات بھی سازگار رہیں گے۔ لیکن اس کی شکی طبیعت اسے اس امر کی اجازت نہیں دے گی شاید اسے اپنی

طاقت کو تقسیم بھی کرنا پڑے اور اس طرح اسے گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کرنے کا موقع فراہم ہو جائے جسے نجف خاں کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دے گا۔ اس لئے اسے کسی علاقہ کی یافت سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس کی متبادل صورت بھی اتنی ہی ضرر رساں ہے کیونکہ اس میں دشواری یہ ہے کہ اسے نقد روپیہ حاصل کرنے کے لئے نجف خاں کو مجبور کرنا پڑے گا اور اس سلسلہ میں طاقت کا استعمال خطرہ سے خالی نہیں یہ اس مہم جو کے کردار اور حالات کا مختصر جائزہ ہے مزید یہ کہ اس نے اس ملک کے طور وطریق اور رسم ورواج کو اپنا لیا ہے۔ وہ مغلوں کا لباس پہنتا ہے زنان خانہ وغیرہ رکھتا ہے یورپ جانے کے خیال کو اس نے قطعی طور سے دل سے نکال دیا ہے، اس کی عمر 56 سال کے قریب ہے اس کا صرف ایک لڑکا ہے جس کی عمر تقریباً 12 سال ہے۔ عام طور پر جیسا کہ میں نے دیکھا ہے اس کو کوئی پسند نہیں کرتا اور نہ اس کی کوئی تعریف کرتا ہے اگر چہ اس کے پاس اتنی طاقت ہے کہ وہ ان سب سے یقینی طور پر اپنی عزت کرائے جو اس کی خدمات حاصل کرنا چاہتے ہیں یا اس سے کمزور ہیں۔

حوالہ جات

1- علاقہ السا س کا رہنے والا جو فرانس کا شمالی مشرقی حصہ ہے اور کچھ عرصہ سے ایک اور قدیم صوبے لورین کے ساتھ ملا کر ''السا س۔لورین'' بن گیا ہے۔ یہ مرکب 1871ء میں بسمارک نے وضع کیا تھا۔ جب صوبہ السا س اور لورین کا شمالی مشرقی حصہ جرمنی میں شامل کیا گیا تھا۔

2- چندر نگر میں ابتداً ءایک فرانسیسی تجارتی کوٹھی قائم ہوئی تھی اور اس کا قیام کولبر۔فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت عمل میں آیا تھا اس کی اجازت فرانسیسیوں کو 1688ء میں اورنگ زیب سے ملی تھی۔ 18 ویں صدی میں یہ مقام بحری تجارت کا ایک اہم مرکز رہا۔ 1757ء میں اس پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا لیکن 1763ء میں پھر فرانسیسیوں کو واپس دیدیا گیا۔ 1794ء میں دوبارہ انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ لیکن 1816ء میں مستقلاً فرانس کے حوالے کر دیا گیا اور اس وقت سے یہ شہر برابر پانڈیچری کے گورنر کے ماتحت رہا۔ پولیر کا اشارہ 1757ء کی پلاسی کی جنگ کی طرف ہے جس میں پہلی مرتبہ چندرانہ پر انگریزوں کا قبضہ ہوا۔